تاریخِ اسلامی ہند
(عہدِ سلاطین)
گیارھویں جماعت کے لیے
امانت
دیانت
صداقت
شرافت
پنجاب
ٹیکسٹ بک بورڈ
لاہور
ٹیکنیکل پبلشرز، اُردو بازار، لاہور
برائے: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

تاریخ اسلامی ہند

(عہد سلاطین)

گیارھویں جماعت کے لئے

ٹیکنیکل پبلشرز، اردو بازار، لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

تیار کردہ ۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور
منظور کردہ ، قومی ریویو کمیٹی ، وفاقی وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر یار محمد
مدیر : سبطِ حسن
نگرانِ طباعت : سبطِ حسن

ناشر : ٹیکنیکل پبلشرز لاہور
طابع : حسن الدین اشرف
مطبع : نواز پرنٹنگ پریس لاہور

ابتدائیہ

زیرِ نظر کتاب کو نئے نصاب کے تحت تیار کیا گیا ہے ۔ اس کتاب کو تیار کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے ۔

1- کتاب طلبہ و طالبات کے لیے دلچسپ ہو ۔ اس سلسلے میں ہر سبق کو اس طریقے سے لکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ طالب علموں کی دلچسپی برقرار رہے ۔ خشک اور مجرّد حقائق دینے کی بجائے واقعاتی مواد پر زور دیا گیا ہے ۔

2- کتاب میں زیادہ سے زیادہ مواد ہم عصر مأخذوں سے لیا گیا ہے ۔ ثانوی مأخذوں سے اگرچہ مدد ضرور لی گئی ہے مگر زیادہ تر انحصار ہم عصر مأخذوں پر ہی کیا گیا ہے ۔

3- عام ڈگر سے ہٹ کر یہ کوشش کی گئی ہے کہ محض واقعات پر زور دینے کی بجائے ، واقعات کے محرکات اور اثرات کے مطالعے اور سمجھ پر دھیان دیا جائے ۔ اس کے لیے ضروری اور بنیادی نظریات کی علٰحدہ طور پر تشریح کر دی گئی ہے ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم اس دور کے معاشرتی ، سیاسی اور انتظامی اداروں کے ارتقاء کو سمجھیں ۔ اس مقصد کے لیے مشقی سوالات کی نوعیت بھی بدل دی گئی ہے ۔

4- اکثر اسباق کے آخر میں کتابیات دی گئی ہیں ۔ ان سے لکھنے میں مدد لی گئی ہے مگر یہاں ان کو درج کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طالب علم اس کتاب میں دیے گئے مواد پر اکتفا نہ کریں ، بلکہ اپنے طور پر ان کتب کا مطالعہ کریں اور اس دور کے بارے میں اپنا ایک ذاتی نظریہ بنائیں ۔ اس سلسلے میں طالب علم اپنے اساتذہ کرام کے تجربے اور علم سے ضرور فائدہ اٹھائیں ۔ اساتذہ کرام سے بہتر

کوئی بھی راہنمائی نہیں کر سکتا ۔ اساتذہ کرام سے بھی گزارش ہے کہ وہ کلاس میں بحث مباحثے اور تجزیاتی اندازِ تدریس کی حوصلہ افزائی کریں ۔

بورڈ ہذا نے ممکنہ طور پر ایک بہتر کتاب آپ کے مطالعے کے لیے تیار کی ہے ۔ پھر بھی اس میں بہتری کی بہت گنجائش ہے ۔ اس سلسلے میں کوئی استاد ، والدین یا طالب علم کسی قسم کی بھی تجویز رکھتے ہوں ، یا ان کو کوئی خامی نظر آئے تو انھیں اسے ایک قومی کام سمجھ کر ہماری مدد کرنی چاہیئے ۔ بورڈ آپ کی ہر رائے ، تجویز یا نشاندہی کو خوش آمدید کہے گا ۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست اسباق

1

سندھ میں مسلمانوں کی آمد

پس منظر

ظہورِ اسلام سے بہت پہلے عربوں کے برصغیر سے تجارتی تعلقات قائم تھے ۔ عرب تاجر مصر ، شام اور عراق سے تجارتی سامان لے کر خلیج فارس کے ایرانی ساحلوں سے ہوتے ہوئے بلوچستان کی بندرگاہ تک آتے ۔ کبھی کبھی وہ سندھ کی بندرگاہ دیبل سے ہوتے ہوئے برصغیر کے مغربی ساحلوں پر لنگرانداز ہوتے ۔ یہاں انھوں نے اپنے تجارتی مراکز بھی بنا رکھے تھے۔ ان مراکز میں تجارتی سامان رکھ لیا جاتا تھا اور پھر یہ مال سراندیپ (سری لنکا) ، انڈونیشیا اور چین تک پہنچایا جاتا تھا ۔ عرب تاجر انہی راستوں سے ہی واپس وطن جاتے تھے ۔

بعض عرب تاجر عدن کے راستے بحر قلزم میں جہاز رانی کرتے ہوئے ، افریقہ کی بندرگاہوں تک جاتے تھے ۔ اسی راستے سے مال یورپی ممالک کو بھی بھجوایا جاتا تھا ۔

اُس دور میں عرب تاجر دوسرے ممالک کے تاجروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ اسی وجہ سے ان کو سمندری اور برّی راستوں کے بارے میں بہت گہری واقفیت حاصل تھی ۔ فن جہاز رانی میں بھی وہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ مہارت اور علمی تجربہ رکھتے تھے ۔ عرب تاجروں کی اس زمانے میں شہرت کی ایک اور وجہ ان کے مال اسباب کا اعلیٰ معیار بھی تھا ۔

عرب تاجر ہندوستان سے گرم مصالحہ ، ناریل ، کئی قسم کی معدنیات ، ہاتھی دانت کی مصنوعات ، الائچی ، ساگوان کی لکڑی ، نیل اور سوتی کپڑا وغیرہ خریدتے تھے ۔ جو

چیزیں عرب تاجر یہاں لا کر بیچتے تھے ، ان میں ریشمی کپڑے ، عرقِ گلاب ، کھجور ، عربی گھوڑے اور شیشے کا سامان وغیرہ شامل تھا ۔

ظہور اسلام کے بعد اہل عرب کی زندگی میں بہت اہم تبدیلیاں آئیں ۔ خلفائے راشدینؓ اور پھر بنو امیہ کے دور میں دنیائے عرب سیاسی ، معاشی اور عسکری طور پر ایک بہت بڑی طاقت بن کر اُبھری ۔ سلطنت اسلامیہ کا دائرہ ایران ، عراق ، شام ، مصر اور ترکی کے بعد افریقہ اور یورپ کی طرف پھیل رہا تھا ۔ اسی زمانے میں مسلمانوں نے سندھ پر حملہ کیا ۔

سندھ (۱) پر مسلمانوں کے حملے کی روداد جانتے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے یہاں حملے کے وقت سندھ کے مجموعی حالات کا مختصر سا جائزہ لیا جائے تاکہ ان واقعات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے ۔

سندھ پر قدیم زمانے میں بدھوں کی حکومت تھی ۔ یہاں کا ایک راجا ، ایرانیوں کے ساتھ جنگ میں مارا گیا تو اس کا بیٹا "ساہ سی" تخت نشین ہوا اور بڑے امن و امان سے حکومت کرنے لگا ۔ ایک دن اس کے دربار میں ایک نوجوان لڑکا حاضر ہوا ۔ لڑکے نے راجا کو بتایا کہ وہ مندر کا پجاری ہے اور اس کی معاشی حالت بہتر نہیں ۔ راجا نے اس کا امتحان لیا اور اس کی لیاقت سے متأثر ہو کر اسے ایک دیوانی عہدہ دے دیا ۔ اسی عہدے سے ترقی کرتا ہوا یہ نوجوان ایک دن وزیر کے عہدے تک جا پہنچا ۔ اس نوجوان وزیر کا نام چچ تھا ۔

---

۱ — آریا قوم کی آمد سے پہلے سندھ کے قدیم باشندے اس ملک کو کیا کہتے تھے ، معلوم نہیں ہو سکا ۔ آریا قوم نے جب اس علاقے پر قبضہ کیا تو اس کا نام سندھ رکھا ۔ ان کی زبان میں "سندھو" دریا کو کہتے ہیں ۔ دریائے سندھ کی مناسبت سے وہ پورے علاقے کو سندھو ، اور پھر سندھ کہنے لگے ۔ آریا ، پنجاب کی سرحدوں تک بڑھ گئے مگر اس پورے علاقے کا نام وہی رہا ۔ جب گنگا تک پہنچ کر رک گئے تو اس کا نام "آریا ورت" رکھا گیا ۔ ایرانیوں نے سندھ کو اپنے لہجے میں 'ہند' کر ڈالا اور یونانیوں نے 'ہ' کو ہمزہ سے تبدیل کر کے 'اند' کر دیا ۔ رومن زبان میں جا کر 'اند' سے 'اندیا' ہو گیا اور انگریزی زبان میں چونکہ 'دال' نہیں ہے اس لیے وہ انڈیا بن گیا ۔
(تاریخ سندھ ، ابو ظفر ندوی)

ایک دفعہ چچ کو کسی ضروری دستاویز پر راجا سے دستخط کروانا تھے اور اس وقت راجا محلسرا میں تھا ۔ راجا نے یہ سوچ کر کہ چچ ایک پنڈت ہے ، اُسے بیوی کے سامنے بلوا لیا ۔ راجا اور رانی دونوں اس کی شائستگی سے متاثر ہوئے اور اسے انعام دیا ۔ اب چچ بِلا کسی روک ٹوک محلسرا میں آنے جانے لگا ۔ اسی اثنا میں راجا کا انتقال ہو گیا ۔ راجا کی کوئی اولاد نہ تھی ۔ راجا کی بیوی نے چچ کے ساتھ مل کر حکومت پر قبضہ کر لیا اور بعد ازاں دونوں نے شادی کر لی ۔

راجا چچ ایک پنڈت تھا اور عمومی طور پر اس زمانے میں یہ لوگ کاروبار سیاست سے دلچسپی نہ لیتے تھے ۔ تاہم آہستہ آہستہ ، راجا چچ نے امور سلطنت کو سمجھنا شروع کر دیا اور اس نے نہایت کامیابی سے چالیس سال تک حکومت کی ۔

راجا چچ کے بعد اس کا بھائی سندھ کا راجا بنا ۔ یہ بدھ مت کا پیروکار تھا اور زیادہ وقت عبادت میں گزارنا پسند کرتا تھا ۔ اس نے عام لوگوں میں بدھ مت کی اشاعت کی ۔ جس سے سندھ میں زیادہ تر آبادی بدھ مت کی پیروکار ہو گئی جبکہ یہاں اراکینِ حکومت ہندو برہمن ہی تھے ۔ سات سال کی حکومت کے بعد اس راجا کا انتقال ہو گیا اور راجا داہر نے حکومت سنبھال لی ۔

راجا داہر :

راجا داہر ، راجا چچ کا چھوٹا بیٹا تھا ۔ جلد ہی اس کے رشتے داروں نے برہمن آباد کے علاقے پر قبضہ کر کے علٰحدہ حکومت قائم کر لی اور راجا داہر کی حکومت الور تک محدود ہو گئی ۔

ایک دفعہ راجا داہر کو ایک نجومی سے ملنے کا موقع ملا ۔ راجا نے اس سے اپنی سلطنت کے بارے میں دریافت کیا ۔ نجومی نے کہا کہ اُس کی سلطنت میں امن رہے گا ۔ راجا نے اپنی بہن کی قسمت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ اس کی قسمت کا ستارہ عروج پر ہے ۔ جو شخص اس سے شادی کرے گا ، وہ سندھ کا راجا ہو گا ۔ راجا پہلے ہی برہمن آباد کی ریاست کے قیام سے پریشان تھا ، یہ سن کر وہ مزید

پریشان ہوگیا ۔ راجا داہر نے اس مشکل کے حل کے لیے اپنے وزیر سے مشورہ کیا۔ وزیر نے جواب دیا کہ "حکومت کے لیے لوگ باپ اور بھائی کو قتل کر دیتے ہیں ، آپ اپنی بہن سے رسمی شادی کر لیں تاکہ بدشگونی ٹل جائے ۔۔۔ یہ کوئی خاص بات نہ ہوگی"— راجا ، مروّجہ رِیت رواج کے مطابق اس قسم کی شادی کا تصور نہ کر سکتا تھا اور اس کے دل پر سخت خوف طاری ہوگیا ۔ اس پر وزیر نے راجا کو سمجھانے کے لیے ایک مثال دی کہ لوگوں کا حافظہ دیرپا نہیں ہوتا اور وہ چیزوں کو بہت جلد بھلا دیتے ہیں ۔ وزیر نے لمبے لمبے بالوں والی ایک بکری کے بالوں میں رائی کے دانے ڈال دیے اور ان میں ہر روز پانی ڈالتا رہا، یہاں تک کہ ان میں سے پودے اُگ آئے۔ اس بکری کو بازار میں لایا گیا تو اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے ۔ ان کو بالوں میں پودے اُگنا ، ایک اچنبے والی بات لگی ۔ تین دن تک یہی سماں رہا ۔ اس کے بعد بکری کو دیکھ کر کسی نے تعجب کا اظہار نہ کیا ۔ اس پر وزیر نے راجا کو سمجھایا کہ "بھلائی یا برائی کا چرچا ، لوگوں میں چند روز سے زیادہ نہیں رہتا ۔ لوگ زود فراموش ہوتے ہیں ۔"

آخر راجا داہر نے اپنی بہن سے محض رسمی شادی کر لی ۔ ہر عہد کے مؤرخین نے راجا داہر کے اس فعل کو حد درجہ ناپسندیدہ اور غیر معاشرتی قرار دیا ہے ۔ اگرچہ یہ شادی محض رسمی تھی اور اس کا مقصد اپنی ضعیف الاعتقادی کے مطابق محض شگون کو ٹالنا تھا ۔ پھر بھی انسانی رشتوں کے تقدس کے اعتبار سے یہ بہرطور ناپسندیدہ فعل تھا ۔ اس سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ راجا داہر نے اپنی سیاسی ضرورت کے پیشِ نظر اس قبیح حرکت سے بھی گریز نہ کیا ۔

راجا داہر کے بھائی کو بھی یہ حرکت پسند نہ آئی اور اس نے ردِعمل کے طور پر راجا داہر پر حملہ کر دیا ۔ راجا داہر کا بھائی اسے سزا دینے میں کامیاب نہ ہوا اور جلد ہی اس کا انتقال ہوگیا ۔ اس کی موت کے بعد راجا داہر نے سندھ کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا اور وہ سندھ کا واحد حکمران بن گیا ۔ اس کا دارالخلافہ الور (موجودہ روہڑی کے قریب) تھا۔ سندھ کے جملہ علاقوں پر انتظام حکومت بہتر بنانے کے بعد ، راجا داہر نے اردگرد

کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کو وسعت دی ۔ اس کی سلطنت کا کل رقبہ قریباً دو لاکھ مربع کلومیٹر سے بھی زیادہ تھا۔

معاشرتی و معاشی حالات

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راجا داہر کی حکومت کا انتظامی ڈھانچہ غیر مؤثر ہو گیا اور سابقہ ادوار کے مقابلے میں لوگ کم خوشحال اور معاشرتی طور پر غیر موزوں حالات کا شکار ہو رہے تھے۔

آبادی کی اکثریت بدھ مت کی پیروکار تھی اور ان پر حکومت کرنے والا طبقہ ہندو تھا ۔ راجا داہر کے والد چچ نے ایسا انتظامی ڈھانچہ استوار کر دیا تھا جس میں بدھ مت کے پیروکار پِس رہے تھے ۔ بدھوں کو ہندوؤں کی زمینوں پر مفت کام کرنا پڑتا تھا اور زمینی ملکیت صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی ۔ بدھوں کو تہذیبی اور معاشرتی طور پر کم تر سمجھا جاتا تھا ۔ اس کے برعکس ہندو اپنے آپ کو ایک شاندار تہذیب کا نمائندہ سمجھتے تھے ۔ تمام تر کاروبارِ حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا ۔ حکومت کا سب سے بڑا حلیف طبقہ جاگیرداروں کا تھا۔ ان میں اکثر برہمن تھے ۔

اگرچہ اسوقت ہندو حکومت کر رہے تھے مگر زندگی کی آسودگیاں صرف حکمرانوں اور ان کے وفادار طبقوں تک محدود تھیں ۔ خود ان کے اپنے مذہب کے لوگ جو ان کے نظریے کے مطابق نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے ، سب کے سب محرومی اور ظلم کا شکار تھے ۔

ان حالات میں بدھوں کی مکمل آبادی اور ہندوؤں کے نچلے طبقے مروجہ معیارِ حکومت اور حکومتی طبقے کے کردار سے ناخوش تھے ۔ ان کی زندگی بھر کی تگ و دو محض ایک ، آدھ وقت کی روٹی کمانے میں صرف ہو جاتی تھی ۔ ان حالات کے باعث لوگوں میں ایک احساسِ محرومی جنم لے چکا تھا اور اکثر لوگ جہاں بھی موقع ملتا چوری کر کے یا چھین کر اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرنے لگے ۔

ملک کی معیشت کا دارومدار زراعت پر تھا ۔ جاگیردار ، کاشت کاروں سے زمین کاشت کرواتے تھے ۔ ان کاشت کاروں پر کئی قسم کے ٹیکس لگائے گئے تھے جن کو وہ ادا نہ کر سکتے تھے ۔ اس طرح بھاری ٹیکسوں کے بوجھ کے باعث ان کی حالت غلاموں سے بھی بد تر کر دی گئی تھی ۔

سندھ پر محمد بن قاسم کا حملہ

"برہمن آباد میں ایک عالی شان مندر تھا ، جہاں بکثرت پجاری رہتے تھے ، جب وہ فتح ہوگیا تو قوانینِ جنگ کے مطابق ہر چیز پر پہرہ لگ گیا ، اور لوگ اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ مندر میں آنا جانا بند ہوگیا ۔ اس کے باعث مندر کے پجاری ، مہنت اور دیگر خدام جن کا گزارہ اس مندر کی بدولت تھا، فاقہ زدہ ہو گئے اور حیران و پریشان تھے ۔ اس درمیان میں ان کو معلوم ہوگیا کہ محمد بن قاسم بڑا رحمدل انسان ہے ، اس سے ان کو جرأت ہوئی اور سب اس کے مکان پر پہنچے اور دہائی دینے لگے ۔
اُس (محمد بن قاسم) نے برہمن آباد کے معززین شہر اور پجاریوں کو بلا کر اطلاع دی کہ مندر میں ہر شخص بلاخوف و خطر ، اپنے آبائی مذہب کے مطابق عبادت کر سکتا ہے اور کسی کو اس کام سے روکا نہ جائے ۔ اس فرمان سے تمام لوگ مطمئن ہو گئے اور مندر آباد ہو گیا ۔ چلتے وقت معززین شہر کو بھی نصیحت کی کہ مندر کی (حسبِ سابق) خدمت کرتے رہو اور پجاریوں کو دستورِ قدیم کے مطابق ان کی نذر و نیاز قائم رکھو ، آپس میں اتفاق رکھو ، اور مسلمانوں کے ساتھ بلاتعصب مل کر رہو ، تاکہ ملک میں امن رہے اور فساد نہ ہو۔"

(تاریخِ سندھ ۔ ابو ظفر ندوی)

ایسی رواداری اور غیر مذہبوں سے حسن سلوک نہ صرف ایک سیاسی ضرورت تھا بلکہ تہذیبی نقطۂ نظر سے یہ ایک اعلیٰ نمونہ تھا ۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت مسلمان اسی قسم کے رویّے اپنے ساتھ لے کر ہندوستان آئے ۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے بہت سی اقوام آئیں مگر یہ تمام ہندوستانی مزاج کا حصہ بن گئیں ۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے ایک طرف ہندوستانی مزاج متأثر ہوا اور اس میں اہم تبدیلیاں آئیں ، تو دوسری طرف مسلمانوں

سے وابستہ ایک نیا مزاج پیدا ہوا جو سینکڑوں سالوں بعد بھی ہندوستانی مزاج سے مختلف رہا ۔ محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ اسی تاریخی دھارے کی بنیاد تھا ۔ اس حملے کے اہم محرکات اور ان کا تجزیہ یہ ہے :

ہندوستان کا علاقہ قدیم زمانے سے ہی اپنے وسائل اور طرز معاشرت کے لیے دنیا بھر کے لوگوں میں دلچسپی کا باعث رہا ۔ اسلام سے پہلے بھی عرب تاجر یہاں آیا کرتے تھے ۔ خلفائے راشدینؓ کے دور میں مسلمان تاجروں کی اس علاقے میں بہت اہم تجارت ہوا کرتی تھی ۔ اس خطّے میں ساحلی علاقوں پر آباد کچھ لوگ اکثر تجارتی جہازوں کو لوٹ لیتے تھے ۔ اِس کا سدّباب کرنے اور تجارت کو مزید محفوظ بنانے کے لیے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ہندوستان کے جنوبی ساحلوں پر حملے کیے تھے ۔ یہ حملے کامیاب رہے اور ان سے اس علاقے کے بارے میں خاصی معلومات بھی حاصل ہوئیں ۔

حضرت عمرؓ کے ہی عہد خلافت میں جب ایران فتح ہوا تو عربوں نے مکران پر بھی حملے کیے ۔ مکران والوں نے سندھ کے راجا سے مدد طلب کی ۔ اگرچہ مکران اور سندھ کی مشترکہ فوجوں کو عربوں نے شکست دے دی تاہم عربوں کے ذہن میں سندھیوں کے خلاف پرخاش پیدا ہو گئی ۔ اس مہم کے سربراہ نے حضرت عمرؓ سے دریائے سندھ عبور کرنے کی اجازت طلب کی تو حضرت عمرؓ نے اس علاقے کے احوال معلوم کرنے کے لیے اپنے نمائندے روانہ کیے ۔ ان نمائندوں نے واپس آکر حضرت عمرؓ سے کہا :۔

"امیرالمومنینؓ ، یہاں پانی کی بے حد قلت ہے اور یہاں کے لوگ ڈاکو ہیں ، تھوڑی فوج جائے تو لوٹ لی جائے گی اور زیادہ جائے تو پیاسوں مرے"۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "تم وہاں کے حالات بیان کر رہے ہو یا شاعری کر رہے ہو" — نمائندے نے کہا کہ وہ سچ کہتا ہے ۔ اس پر حضرت عمرؓ نے مہم کے سربراہ کو آگے بڑھنے سے منع فرما دیا ۔

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں مکران اور سیستان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا گیا ۔ اس زمانے میں بلوچستان کے نام کا کوئی صوبہ نہ تھا بلکہ مکران اور سیستان سندھ

سے ملے ہوئے تھے ۔ اس طرح ہندوستان پر عربوں کا سب سے پہلا اہم حملہ خشکی کے راستے سے ہوا اور یہی علاقے سب سے پہلے ان کے قبضے میں آئے ۔

اموی حکومت (۱) کے دور میں سندھ پر حملہ کیا گیا۔

سندھ پر حملے کے محرکات

1- سندھ میں عرب باغیوں کا پناہ لینا :

عرب سلطنت میں وسعت کے باعث کئی علاقوں میں انتشار کی کیفیت ابھر رہی تھی ۔ بے شمار شورشیں حکومت کے خلاف اٹھتی تھیں ۔ حکومتی ردّعمل کے بعد باغی بھاگ کر سندھ میں پناہ لے لیتے تھے ۔ سندھ کی حکومت ان باغیوں کو نہ صرف پناہ دیتی بلکہ انھیں عربوں کے خلاف استعمال کرنے کا جتن بھی کرتی ۔ سندھ میں اس وقت بے شمار باغی جمع ہو چکے تھے ، ان میں محمد علافی کا نام سرفہرست تھا ۔

1- اسلام نے عربوں کی زندگی میں جو تبدیلی لائی اس کو ایک علمی جہت دینے کی بنیاد خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی ۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں مشکلات کے باوجود اسلامی معاشرت ، سیاست و حکومت اور دوسرے اداروں میں خاصی پیش رفت ہوئی ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دورِ حکومت میں خلفشار بڑھنے سے ان اداروں کی پیش رفت قدرے سست رہی اور اس خلفشار کے نتیجے میں ایک خاندان کی حکومت شروع ہو گئی ۔ اس خاندان کے بانی حضرت امیر معاویہؓ تھے ۔ ان کا خاندان بنو امیہ کہلاتا تھا اور اسی مناسبت سے یہ حکومت بھی اموی کہلائی ۔ بنو امیہ کے اہم حکمرانوں کی تفصیل اور حکومت سنبھالنے کے سنون یہ ہیں ۔

۱ — حضرت امیر معاویہؓ	661ء	۲ — یزید بن معاویہ	680ء
۳ — معاویہ بن یزید	683ء	۴ — مروان بن حکم	683ء
۵ — عبدالملک بن مروان	685ء	۶ — ولید بن عبدالملک	705ء
۷ — سلیمان بن عبدالملک	715ء	۸ — عمر بن عبدالعزیز	717ء
۹ — یزید (ثانی) بن عبدالملک	720ء	۱۰ — ہشام بن عبدالملک	724ء

محمد علافی عربوں کے شامی لشکر کے سپاہیوں میں سے تھا ۔ اس نے خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں مکران کے گورنر کو قتل کر دیا ۔ خلیفہ نے اس کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر روانہ کیا مگر یہ بھاگ کر راجا داہر کے پاس چلاگیا ۔ انہی دنوں راجا داہر کو ایک مقامی راجا سے لڑائی کا سامنا تھا اور وہ اپنی عسکری حالت بہتر نہ ہونے کے باعث خاصا پریشان تھا ۔ راجا داہر نے محمد علافی سے مشورہ کیا تو اس نے عربوں کے طریقۂ جنگ کے مطابق خندق کھدوائی اور لشکر کو خارجی حملے سے محفوظ کر لیا ۔ ایک رات دشمن پر شبخون مارا گیا جس میں دشمن کے ہزاروں سپاہی گرفتار کر لیے گئے اور ہزاروں کو قتل کر دیا گیا ۔

راجا داہر اس فتح سے غیر معمولی طور پر خوش ہوا اور اس نے محمد علافی کو انعام و اکرام کے علاوہ سرحدِ مکران پر ایک علاقہ دے دیا ۔ اس علاقہ میں بعد ازاں عرب حکومت کے باغی جمع ہونے لگے ۔

2- ایرانی مقبوضات میں سندھ سے مداخلت :

سندھ کا علاقہ عرب حکومت کے اہم علاقے عراق سے نسبتاً قریب تھا ۔ ایرانی سرحد بھی اس زمانے میں سندھ سے ملتی تھی — عرب اس زمانے میں ایران کو مکمل طور پر فتح کرنے کے لیے کوششیں کر رہے تھے ۔ ان کوششوں میں رکاوٹ ڈالنے والے باغی لوگ سندھ کے ملحقہ ایرانی علاقوں میں سرگرم تھے ۔

اِس سیاسی ماحول میں سندھ کے راجا داہر کی کوشش تھی کہ اس علاقے میں عربوں کے اثرونفوذ کو بڑھنے نہ دیا جائے ۔ ان حالات میں سندھ پر عربوں کے حملے کا خدشہ ہو سکتا تھا ۔ اس تناظر میں راجا داہر نے ایرانیوں کے ساتھ اپنی دیرینہ لڑائی جو مکران پر دونوں کے استحقاق کے باعث تھی ، کو بھی بھلا دیا ۔ راجا داہر نے ایرانیوں کی بھرپور امداد شروع کر دی ۔

عربوں کے ایران پر قبضہ کرنے کے بعد راجا داہر نے ایران کے ملحقہ علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینا ۔ ان میں کرمان اور سیستان کے علاقے شامل تھے ۔

ایرانیوں نے بھی اس قبضے کو خوش دلی سے قبول کر لیا تاکہ اس علاقے پر عربوں کا اثر قائم نہ ہو سکے ۔

عربوں نے اس وقت تو سندھ کے راجا کے ان سیاسی حربوں کی طرف توجہ نہ دی تاہم سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کے سیاسی محرکات میں یہ معاملہ بھی شامل تھا تاکہ ایران میں عرب مقبوضات کو تحفظ دیا جا سکے ۔

3- بحری راستوں کا عدم تحفظ :

عربوں کی تجارت کا محور جنوبی ایشیا کے ممالک میں دور دور تک پھیل چکا تھا ۔ تجارتی راستوں اور تجارتی مال و اسباب کی حفاظت کے لیے اقدام کرنا ضروری ہو رہا تھا کیونکہ اس علاقے میں بحری ڈاکوؤں کی سرگرمیاں بہت بڑھ رہی تھیں ۔

4- عربوں کے ایک بحری جہاز کو لوٹنے کا واقعہ :

اِن تمام محرکات کے علاوہ ایک واقعہ فوری طور پر حملے کا سبب بنا ۔ سراندیپ (سری لنکا) اُس زمانے میں تجارتی لحاظ سے بہت اہم مرکز بن گیا تھا ۔ یہ مغربی ایشیا اور مشرق بعید کے ممالک کے درمیان ایک اہم تجارتی رابطہ تھا ۔ یہاں بہت سے عرب تاجر آباد ہو چکے تھے ۔

یہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کا دورِ حکومت تھا ۔ مسلمان اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سیاسی اور اقتصادی طاقت کے طور پر ابھر رہے تھے ۔ دنیا کے اکثر حکمران ، مسلمانوں سے اچھے تعلقات کے خواہاں تھے ۔

سری لنکا کا راجا بھی مسلمانوں سے اپنے اچھے تعلقات کا اظہار کرنا چاہتا تھا ۔ انہی دنوں ایک عرب تاجر کے انتقال کے بعد اس کے اہل و عیال مع مال و اسباب عرب واپس جا رہے تھے ۔ راجا نے بھی ان لوگوں کی معرفت خلیفہ کے لیے تحفے تحائف روانہ کر دیے تاکہ خلیفہ سے راہ و رسم بڑھ سکے ۔ یہ جہاز جب دیبل (کراچی کے قریب) پہنچا تو سمندری قزاقوں نے اسے لوٹ لیا اور مسافروں کو قید کر دیا ۔ یہ قزاق یہاں کے مقامی باشندے تھے اور ان کا ذریعہ معاش قزاقی ہی تھا ۔

حملے کی تیاریاں

اُس وقت اموی سلطنت کے مشرقی ممالک کا حاکم حجاج بن یوسف (۱) تھا۔ حجاج بن یوسف اپنے انتظام اور انتظامی صلاحیتوں کے لیے بہت مشہور تھا۔ جہاز کو لوٹنے والا واقعہ اس کے لیے ایک بڑا چیلنج تھا۔ ویسے بھی یہ واقعہ ایک ابھرتی ہوئی طاقت کے اثرونفوذ کے لیے غیرموزوں ہو سکتا تھا خاص طور پر جبکہ اس جہاز میں خلیفہ کے لیے تحائف جا رہے تھے۔

حجاج نے اس واقعہ کو تمام تر سابقہ سیاسی حالات کی روشنی میں سمجھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ سندھ پر حملہ کرنا اشد ضروری ہے۔ مگر یہ مہم خلیفہ کی اجازت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ خلیفہ نے کثیر اخراجات کے باعث اجازت نہ دی۔ حجاج نے دوبارہ درخواست دی اور اس میں لکھا:-

"خلیفہ نے کثیر اخراجات کے خیال سے فتح سندھ کی اجازت نہیں دی،
میں وعدہ کرتا ہوں کہ جس قدر خزانے سے اس (مہم) پر صرف ہو گا،
اس کا دوگنا خزانے میں داخل کر دوں گا۔"

خلیفہ نے سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی۔

حجاج بن یوسف نے فوری طور پر راجا داہر کو خط لکھا، اس کے مندرجات یہ تھے۔

1- حجاج طائف کا رہنے والا تھا اور یہاں لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ بعد میں یہ پیشہ ترک کر کے سپاہیوں میں بھرتی ہو گیا اور کسی طرح وزیر کے ذاتی علمے کے سپاہیوں میں شامل ہو گیا۔ یہاں اس نے بڑی محنت اور لگن سے اپنا مقام بنا لیا۔

ایک دفعہ عبدالملک بن مروان کو اپنی فوج کے نظم و ضبط کے لیے ایک شخص کی ضرورت تھی۔ اس نے اس کا ذکر اپنے وزیر سے کیا۔ وزیر نے کہا کہ اس کے ذاتی علمے میں ایک سپاہی ہے، اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ فوج کا نظم و ضبط درست کر دے گا۔ وزیر کا اشارہ حجاج کی طرف تھا۔

عبدالملک نے حجاج کو بلوایا اور اسے حکم دیا کہ جیسے ہی اس کی سواری روانہ ہو تمام فوج کو اس کے ساتھ کوچ کرنا چاہیئے۔ اتفاق سے اسی دن عبدالملک کی سواری روانہ ہوئی۔ حجاج تمام فوج کو خلیفہ کی سواری کے ساتھ چلنے کی تلقین کر رہا تھا، اُس نے دیکھا کہ وزیر کے علمے کے سپاہیوں

(بقیہ اگلے صفحے پر)

"ہمارے ملک کے لوگ جو تمہارے علاقے میں قید کر لیے گئے ہیں ان کو عزت سے واپس کر دو اور مال و اسباب کا جو نقصان ہوا ہے ، اس کا تاوان ادا کرو" —

اس خط کا انداز نہایت معقول اور مناسب تھا مگر راجا داہر نے نہایت لاپرواہی اور غیر ذمے داری سے جواب دیا۔ چچ نامے جو ایک بنیادی مأخذ ہے میں اس خط کا متن اس طرح درج ہے :-

" یہ کام بحری ڈاکوؤں کا ہے ، جن پر ہمارا بس نہیں چلتا ۔"

حجاج نے راجا داہر کے اس جواب سے ناراض ہو کر دو مہمات سندھ کی طرف روانہ

میں سے کچھ سوئے ہوئے ہیں ۔ حجاج نے انھیں چلنے کا کہا ۔ چونکہ وہ ان میں کچھ عرصہ رہ چکا تھا ، انھوں نے توجہ نہ دی بلکہ اسے مذاق کیا کہ "کیا ٹر ٹر لگا رکھی ہے ۔ آؤ بیٹھو ، کھانا کھاؤ وغیرہ وغیرہ ----" حجاج نے یہ سن کر آؤ دیکھا نہ تاؤ ہر ایک کی پیٹھ پر کوڑے برسانا شروع کر دیے ، لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی ۔ حجاج نے اس پر بس نہ کیا بلکہ وزیر اور اس کے رفیقوں کے خیموں میں آگ لگا دی ۔

وزیر کو جب اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو اس نے خلیفہ سے شکایت کی ۔ عبدالملک نے حجاج کو بلوایا اس سے اس واقعے کے بارے میں پوچھا ۔ حجاج نے اس واقعے سے صاف انکار کر دیا ۔ عبدالملک نے کہا کہ تم نے لوگوں کو کوڑے نہیں مارے ؟ کیا تو نے خیموں کو آگ نہیں لگائی --- آخر یہ سلوک وزیر کے سپاہیوں کے ساتھ کس نے کیا ؟ حجاج نے برجستہ جواب دیا "امیر المومنین نے" عبدالملک نے تعجب سے پوچھا "میں نے؟" حجاج نے کہا "جی آپ نے !" پھر اس نے وضاحت کی اور کہا

"امیرالمومنین ، میری کیا مجال تھی کہ میں ایسا کرتا ، کیا جو کچھ ہوا ، آپ کے حکم سے نہیں ہوا ، میرا کوڑا ، اب آپ کا کوڑا ہے ، اسی طرح میرا ہاتھ اب میرا ہاتھ نہیں بلکہ امیرالمومنین کا ہاتھ ہے ،

عبدالملک اس کی یہ باتیں سن کر اچھل پڑا اور کہنے لگا بخدا ، مجھے اسی قسم کے آدمی کی ضرورت تھی " اس کے بعد حجاج ترقی کرتا گیا ، یہاں تک کہ اموی سلطنت کے مشرقی علاقوں کا حاکم مقرر ہوا ۔ اسی کی ذاتی محنت اور دلچسپی سے سندھ کا علاقہ اموی سلطنت میں شامل ہوا ۔ حجاج سخت گیر ضرور تھا مگر بہت اچھا منتظم بھی تھا ۔

کیں مگر یہ دونوں ناکام رہیں ۔ اب حجاج بن یوسف نے ایک حتمی حملے کے لیے محمد بن قاسم(۱) کا انتخاب کیا ۔

لشکر کی تیاری

حجاج نے اپنی فوج کے بہترین سپاہیوں کو سندھ پر حملہ کرنے کے لیے منتخب کیا ۔ ان کی کل تعداد چھ ہزار تھی ۔ ان کی سہولت کے لیے ہر طرح کا انتظام کیا ، یہاں تک کہ لشکر کے ساتھ سوئی دھاگا تک روانہ کیا گیا ۔ بیماریوں سے تحفظ کے لیے سرکہ بھی بھیجا گیا ۔ سرکے کو لشکر کے ساتھ بھجوانے میں دقت پیش آ رہی تھی ، کیونکہ مائع حالت میں اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا اور نقل و حمل میں دِقت کا باعث بھی ۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے حجاج نے روئی کو سرکے میں بھگو کر اسے سائے میں خشک کروایا اور پھر اس روئی کے گٹھے بندھوا کر جہازوں میں روانہ کیے تاکہ حسبِ ضرورت روئی کو تر کر کے اسکو چھان کر استعمال کیا جا سکے ۔

عام سامانِ رسد کے علاوہ تیس ہزار دینار بھی ساتھ دیے گئے تاکہ فوج کو کسی قسم کی ضرورت کے لیے تکلیف نہ ہو ۔

لشکر ایک سپہ سالار کی قیادت میں شیراز پہنچا ۔ محمد بن قاسم اسوقت شیراز کا گورنر تھا ۔ یہاں سے لشکر کی قیادت محمد بن قاسم نے سنبھالی اور یہ مکران کے راستے دیبل کے قریب پہنچ گیا ۔

1- محمد بن قاسم 95-694ء میں طائف میں پیدا ہوا ۔ جب حجاج بن یوسف عراق کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے اپنے خاندان کے ممتاز لوگوں کو مختلف عہدوں پر مقرر کیا ۔ ان میں محمد بن قاسم کا والد بھی تھا ، جس کو بصرے کا گورنر مقرر کر دیا گیا تھا ۔

محمد بن قاسم کی عمر ابھی پانچ سال تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا ۔ غربت کی وجہ سے محمد بن قاسم زیادہ پڑھ لکھ نہ سکا اور دمشق میں فوج میں بھرتی ہوگیا ۔ یہاں اسے قابل اور تجربہ کار جرنیلوں سے تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا ۔ چودہ سال کی عمر میں محمد بن قاسم نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ حاصل کر لیا ۔ پندرہ سال کی عمر میں حجاج نے اسے ایران میں ایک بغاوت دبانے کے لیے بھیجا ۔ یہاں محمد بن قاسم کو کامیابی ہوئی ۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

ہر مقام پر محمد بن قاسم ضرورت کے مطابق حجاج سے ہدایات حاصل کرتا اور ہر ضروری اطلاع اسے پہنچاتا تھا ۔ حجاج کی سندھ کی مہم میں دلچسپی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس نے محمد بن قاسم کے ساتھ خطوط کے تبادلے کے لیے ایک خاص انتظام کیا ۔ محمد بن قاسم کی طرف سے بھیجا جانے والا خط ، ساتویں روز بصرہ میں حجاج کو مل جاتا تھا اور اتنے ہی روز میں اس کا جواب محمد بن قاسم وصول کر لیتا تھا ۔

دیبل کے قریب جب لشکر پہنچا تو حجاج کی یہ ہدایات محمد بن قاسم کو وصول ہوئیں :

"جب تم ان منزلوں پر پہنچو جو کہ سندھ کی حدود کے اندر ہیں اور تمھیں دیبل نظر آنے لگے تو تم قیام گاہوں کے متعلق بہت احتیاط برتو ، پھر جہاں کہیں اترو ، اپنی قیام گاہوں کے گرد خندق کھود لو —— رات کا زیادہ حصہ جاگتے رہو ، جو لوگ قرآن پڑھ سکتے ہیں ، وہ قرآن کی تلاوت میں مصروف رہیں اور باقی لوگ اپنا وقت دُعا میں اور لشکر کی حفاظت میں چوکنے ہو کر گزاریں۔"

اسی اثنا میں وہ جہاز بھی سازوسامان لے کر پہنچ گئے جو حجاج نے فوج کے لیے روانہ کیے تھے ۔ ان جہازوں میں سامان رسد کے علاوہ قلعہ کشائی کے لیے آلات اور منجنیقیں تھیں ۔ ان میں ایک منجنیق جس کا نام عروس (دلہن) تھا ، سب سے بڑی تھی اور اسے پانچ سو آدمی کھینچتے تھے ۔ منجنیق ایسا ہتھیار تھا جس سے بھاری پتھر پھینکے جاتے تھے ۔ تکنیکی اعتبار سے اس زمانے کے عسکری معیار کے مطابق یہ ایک جدید ترین ہتھیار تھا جس کا استعمال عربوں میں خاصا مقبول تھا اور سندھ کے لوگ اس سے

ایران میں اپنے قیام کے دوران ہی محمد بن قاسم نے ایک خاص نقشے کے مطابق شیراز شہر کی بنیاد ڈالی ۔ اس سے پہلے شیراز محض ایک معمولی چھاؤنی تھا ۔

سترہ سال کی عمر میں محمد بن قاسم کو ایران کے دارالسلطنت شیراز کا گورنر مقرر کیا گیا ۔ یہاں اس نے نہایت عمدگی اور عدل و انصاف سے حکومت کی ۔

شخصی اعتبار سے محمد بن قاسم ایک خوبصورت جوان تھا ۔ ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ محبت سے پیش آتا تھا ۔ وہ مستحکم ارادے اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا ۔

ناواقف تھے ۔ فوجی حیثیت سے راجا داہر کی فوج کے مقابلے میں ، عربوں کے پاس منجنیق کا ہونا ، فوجی برتری کی علامت تھا ۔

دیبل شہر کی آبادی بہت بڑی تھی ۔ اس شہر میں دیول (مندر) تھا ۔ اس کی مناسبت سے اس شہر کا نام دیبل پڑا ۔ مندر کا گنبد بہت بڑا اور بلند تھا ۔ اس گنبد کی چوٹی پر ایک لمبے بانس پر ریشم کا ایک پرچم آویزاں تھا ۔

محمد بن قاسم جیسے ہی دیبل پہنچا ، دیبل والوں نے شہر کے دروازے بند کر لیے ۔ محمد بن قاسم نے شہر کے باہر جگہ جگہ مورچے بنوائے ۔ منجنیقیں نصب کروائیں اور لشکر کے سامنے ایک خندق کھدوالی ۔ اس طرح پورے شہر کو گھیرے میں لے لیا گیا ۔ شہر والے کبھی کبھار باہر نکل کر حملہ کرتے مگر چونکہ محمد بن قاسم کو حجاج کی اجازت کا انتظار تھا ، اس لیے وہ خاموش رہا ۔

دیبل کی فتح :

آخر کار حجاج نے جنگ شروع کرنے کی اجازت دے دی ۔ دونوں جانب سے لوگ بڑی بہادری سے لڑے ۔ شہر پناہ کی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی تھیں مگر شہر پھر بھی فتح ہوتا نظر نہ آتا تھا ۔

مسلمان سخت پریشان تھے کہ اچانک ایک برہمن ، شہر پناہ سے نکل کر اسلامی لشکر میں آیا اور اس نے محمد بن قاسم سے کہا "ہمیں نجوم کی کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کا ملک مسلمان فتح کریں گے — لیکن جب تک یہ مندر برقرار ہے ، اس شہر کو فتح کرنا ممکن نہیں ۔ آپ کو کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ بت خانہ مسمار ہو اور اس پر جو جھنڈا لہرا رہا ہے وہ کسی طرح پھوٹ جائے ——— یہی شہر کی فتح کا راز ہے ۔"

محمد بن قاسم کو جب دیبل کے باسیوں کے اس عقیدے کا علم ہوا تو اس نے ایک نشانے باز سپاہی کو بلوا کر جھنڈا گرانے کا کہا ۔ نشانہ باز نے پتھروں کی بارش شروع کر دی اور اس میں مندر اور اس پر لہراتا ہوا جھنڈا ٹوٹ گیا ۔ ان کے ٹوٹتے ہی شہر میں ہلچل مچ گئی ۔ دیبل کے سپاہی شہر سے نکل کر لڑنے لگے مگر عربوں کے حملے کی

محمد بن قاسم کی فتوحات
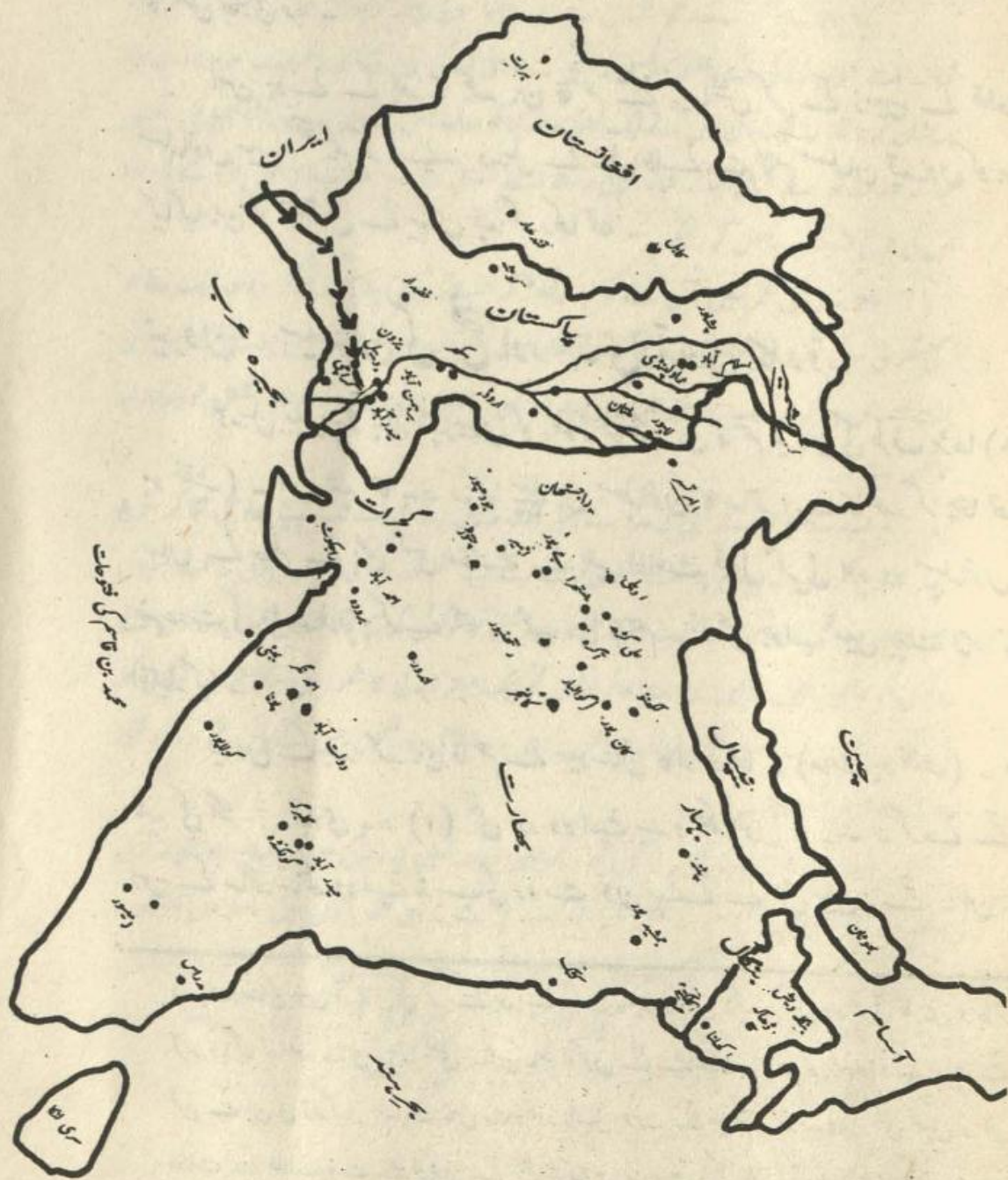
تاب نہ لا سکے اور پھر واپس شہر میں گھس گئے ۔ عرب سپاہی شہر پناہ کی فصیل پر چڑھ گئے — شہر والوں نے فوراً شہر پناہ کے دروازے کھول دیے اور امن کے خواہاں ہوئے ، لیکن محمد بن قاسم نے بات نہ مانی ۔ تین روز تک ہتھیار بند اور فتنہ پردازوں کا قتل جاری رہا ۔

امن ہونے کے بعد ، محمد بن قاسم نے پیمائش کر کے زمین کے قطعات مسلمانوں میں تقسیم کر دیے۔ دیبل کے جیل خانے سے تمام مسلمان قیدیوں کو برآمد کیا گیا جن کو قزاقوں نے یہاں قید کر رکھا تھا ۔

نیرون ، سیستان کی فتح اور مقامی آبادی کا روّیہ

دیبل میں چار ہزار سپاہیوں کو چھوڑ کر محمد بن قاسم نیرون کی طرف بڑھا (ملاحظہ ہو نقشہ) ۔ اس شہر کا بدھ رہنما پہلے ہی مسلمانوں کا ساتھ دینے کا عہد کر چکا تھا ۔ یہاں کے حاکم نے بھی کسی مقابلے کے بغیر اطاعت قبول کر لی اور وہ مسلمانوں کو ضرورت کی اشیاء فراہم کرنے لگا ۔ محمد بن قاسم نے بھی جواب میں بہت اچھا روّیہ اختیار کیا ۔

نیرون کے بعد محمد بن قاسم نے سیوستان کا ارادہ کیا ۔ (ملاحظہ ہو نقشہ) ۔ اس شہر کی اکثریتی آبادی بدھ (۱) تھی اور وہ اپنے ہندو حکمرانوں کو پسند نہ کرتے تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مذہب کی رو سے خون بہانے کے حق میں نہ تھے ۔ ان کے

1- ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کے بعد ہندو مت پھیلا ۔ اس مذہب میں معاشرتی تفریق کو جائز قرار دیا گیا تھا اور مذہبی رہنما یعنی برہمن عام لوگوں کے لیے ایسے حالات کو بڑھاوا دے رہے تھے جن سے ان کی زندگیاں نہایت پس ماندہ اور انسانی عزت کے مقام سے بہت گر گئی تھیں ۔ ان حالات کے خلاف بہت سے لوگوں نے احتجاج کیا اور ہندمت کے خلاف تحریکیں شروع کیں ۔ ان میں سب سے اہم بدھ کی تحریک تھی ۔

اس تحریک کا بانی مہاتما بدھ تھا ۔ اس کا اصل نام سدھارتھ تھا ۔ یہ نیپال کی جنوبی سرحد کے 9 کلومیٹر اندر ایک جگہ کپل وستو میں پیدا ہوا ۔ اس کا والد ایک ریاست کا راجا تھا ۔ اس نے اپنے بیٹے کی ایک شہزادے کی حیثیت سے اعلیٰ طور پر تربیت کی ۔ سدھارتھ کی شادی ہوئی

(بقیہ اگلے صفحے پر)

خیال کے مطابق ان کی مذہبی کتب میں یہ پیش گوئی بھی تھی کہ مسلمان سندھ کو فتح کریں

اور اس سے اسے ایک بیٹا نصیب ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ سدھارتھ شروع سے ہی مزاجاً سوچ بچار کا عادی تھا اور طبعاً بڑا نرم خو تھا۔ اسے شاہی زندگی سے قطعاً دلچسپی نہ تھی۔ انسانی زندگی میں دکھ اور مصیبت کا ہونا اسے بڑا پریشان کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک تارک الدنیا کو دیکھا جس کے چہرے پر اطمینان اور سکون تھا۔ سدھارتھ نے خیال کیا کہ شاید یہی راستہ اسے انسانی دکھ اور مصائب کا حل بتا دے اور وہ اس کی طرح اطمینان حاصل کر سکے۔

29 برس کی عمر میں اُس نے گھر بار چھوڑ کر تنہائی میں رہنا شروع کر دیا اور ایک سادھو کی نگرانی میں سخت ریاضتیں شروع کر دیں تاکہ اسے اطمینان اور سکون حاصل ہو سکے۔ بعد میں اسے احساس ہوا کہ یہ سب کچھ غیر ضروری ہے اور ان ریاضتوں سے دلی سکون ملنا مشکل تو درکنار، ناممکن ہے۔

اب سدھارتھ نے کسی کی مدد کے بغیر ایک پیپل کے درخت کے نیچے سمادھی لگا کر سوچ بچار شروع کر دی۔ یہاں پر اُسے سکون پانے کے لیے علم اور روشنی نصیب ہوئی۔ اب اس کی عمر 35 برس تھی اور اس نے اپنے اس علم اور روشنی کو لوگوں کو پہنچانا شروع کر دیا۔ اس نے لوگوں کو ایسی باتیں بتائیں جن سے عام لوگوں کو ایک بہتر زندگی کا شعور مل سکتا تھا۔ لوگوں کو اس کی یہ باتیں بہت اچھی لگیں اور اسے انھوں نے 'بدھ' یعنی وہ شخص جس کے پاس علم اور روشنی ہو، کہنا شروع کر دیا۔

بدھ نے جو بنیادی باتیں لوگوں کو سمجھائیں وہ یہ تھیں کہ زندگی میں درمیانی راہ اختیار کرنی چاہیئے اور اس راہ میں آٹھ امور پر عمل کرنا اشد ضروری ہے۔ ان آٹھ باتوں میں، موزوں اعتقاد، موزوں مطمح نظر، موزوں گفتگو، موزوں عمل، موزوں معاش، موزوں کوشش، موزوں دھیان اور موزوں لگن شامل ہیں۔ ان میں سے پہلی تین باتوں کا تعلق ذہن پر کنٹرول حاصل کرنے سے اور آخری تین باتوں کا تعلق فکری ارتقا سے تھا۔ بقایا کا تعلق عملی زندگی میں توازن قائم کرنے سے تھا۔

زندگی میں مصائب اور دکھ کے بارے میں بدھ نے کہا کہ ـــــ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے، ان دکھوں کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہے اور ان وجوہات کو ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے واحد طریقہ یہ ہے کہ چیزوں اور انسانوں کے بارے میں توقعات، امیدوں، خدشات اور خواہشات کو ختم کر دیا جائے۔

بدھ نے 80 سال کی عمر میں وفات پائی اور اس کا پیغام بعد میں ایک مذہب کی صورت اختیار کر گیا اور مشرق بعید کے ممالک میں خاص طور پر مقبول ہوا۔

گے اور اس کو وہ اٹل مقدر سمجھتے تھے ۔

یہاں کا راجا اپنے عوام کے نقطۂ نظر سے خائف ہو کر بھاگ گیا اور شہر پر عربوں کا قبضہ ہوگیا ۔ اس کے بعد سیسم کا شہر بھی بغیر کسی جنگ کے فتح ہوگیا ۔

راجا داہر سے جنگ

محمد بن قاسم کی فتوحات اور عام لوگوں میں اس کی مقبولیت کے باعث بہت سے سردار محمد بن قاسم کے ساتھ مل گئے یا انھوں نے اس کو مدد کا یقین دلایا ۔

راجا داہر اس وقت راوڑ میں مقیم تھا، اور محمد بن قاسم اس کے ساتھ لڑائی کی تیاریاں کر رہا تھا ۔ اسی اثنا میں عرب لشکر میں قحط پڑ گیا ، جانوروں میں بیماری پھیل گئی ۔ سپاہی قحط کی وجہ سے ان بیمار جانوروں کو کھانے لگے جس سے وہ خود بھی بیمار ہو گئے ۔

یہ خبر جب راجا داہر کو ملی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے محمد بن قاسم کو اپنا سفیر بھیجا ۔ سفیر نے یہ پیغام دیا :

"اگر تم واپس جانے کا ارادہ کرو تو غلہ اور چارہ بھیج دیں گے !"

محمد بن قاسم نے جواب دیا :

"تم اطاعت قبول کر کے دو سال کا خراج ادا کرو تو ہم صلح کے لیے تیار ہیں"۔

حجاج کو جب قحط کی خبر ملی تو اس نے فوراً ضروری سامان روانہ کر دیا اور سخت تاکید کی کہ جس قدر جلدی ممکن ہو دشمن پر حملہ کر دیا جائے ۔ دریا کو کم چوڑی جگہ سے عبور کیا جائے اور اس کے لیے کشتیوں کا پل بنانے کا حکم دیا ۔

ادھر راجا داہر کا یہ حال تھا کہ دن رات سیر و شکار میں مصروف رہتا ۔ ایک دن اس کے وزیر نے اس سے کہا کہ دشمن سر پر آگیا ہے اور آپ عیش و عشرت میں مصروف ہیں ۔ راجا داہر نے اس سے کہا "پھر تمھی بتاؤ کہ میں کیا کروں ؟" — وزیر نے جواب دیا کہ تمام قابل اعتماد ساتھی لے کر ریگستانی علاقوں میں نکل جائیں ، وہاں پر

طاقت مجتمع کر کے لڑائی کی جائے یا اپنے اہل و عیال کو ہندوستان (۱) بھیج دیں اور دل کھول کر لڑیں یا پھر ایک معتمد راجا سے مدد لے کر دشمن کو ملک سے نکال دیا جائے ۔

راجا داہر نے جواب دیا "مجھے کسی سے مدد مانگتے شرم اور غیرت آتی ہے"۔ وزیر نے پوچھا پھر کیا ارادہ ہے ؟ تو اس نے جواب دیا ——— "میں یا تو اپنا ملک دشمنوں سے خالی کرا لوں گا یا پھر اپنی جان دے دوں گا۔"

عربی فوج نے ایک رات کشتیوں کو دریا کی دوسری جانب بڑھانا شروع کر دیا اور جب بہاؤ پر پہنچیں تو تیزی کے ساتھ اُس پار جا لگیں ، کشتیوں پر تیر انداز موجود تھے تاکہ کسی قسم کی مزاحمت کا مقابلہ کیا جا سکے ۔ اس کے بعد پُل تیار ہوا اور فوج نے دریا عبور کرنا شروع کر دیا ۔

صبح سویرے راجا داہر کو عربوں کے دریا پار کرنے کی خبر ملی۔ راجا پہلے ہی پریشان تھا ، اس نے اس خبر کو بدشگونی سمجھتے ہوئے ، پیغام دینے والے کو فوراً مار ڈالا ۔ راجا داہر کے امرأ پہلے ہی راجا داہر کی کمزور فوجی طاقت سے خائف تھے ۔ انھوں نے پیغام دینے والے کے قتل کو ظلم قرار دیا اور اس کی آڑ میں راجا داہر کا ساتھ چھوڑنے کو تیار ہو گئے ۔

محمد بن قاسم نے لشکر کے گرد خندق کھدوائی تاکہ کسی بھی اچانک حملے سے محفوظ رہا جا سکے ۔ راجا داہر کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے محمد علافی سے اپنے احسانات کو دہرا کر مدد طلب کی ۔ محمد علافی نے اس بات پر کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ، ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے لڑ کر اپنی عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتا ، لڑائی میں شمولیت سے معذرت کر لی ۔ تاہم اس نے کسی بھی اور کام کو نبھانے کی پیش کش کی ۔ راجا داہر نے اسکو صلاح مشورے کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا ۔

راجا داہر سے حتمی جنگ سے پہلے کئی ایک مقامات پر جنگیں ہوئیں ، جن میں عربوں کو فتح حاصل ہوئی اور انھوں نے بہت سا علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا ۔

1- اس زمانے میں سندھ کو ہندوستان سے ایک الگ علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی حدود ملتان تک تھیں۔

راجا داہر نے اپنے وزیر کے مشورے پر یکبارگی حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور فوج کو محمد بن قاسم کی طرف بڑھا دیا ۔ راجا داہر کے لشکر میں جنگی ہاتھی آگے آگے تھے ، ان کے پیچھے دس ہزار مسلح زرہ پوش گھوڑ سوار اور ان کے بعد تیس ہزار پیادہ فوج تھی ۔ ان سب کے درمیان راجا ایک بہت بڑے سفید ہاتھی پر سوار جنگ کی ہدایات دے رہا تھا ۔

جنگ کا نقشہ

جون 712 ء میں جنگ شروع ہوئی ۔ جنگ سے قبل راجا داہر نے نجومیوں سے شگون مانگا ۔ نجومیوں نے جواب دیا کہ فتح عربوں کی نظر آتی ہے ، کیونکہ زُہرہ ستارہ ان کے پیچھے اور آپ کے سامنے ہے ۔ اس خبر سے راجا بہت پریشان ہوا ۔ نجومیوں نے اس کی تسلی کے لیے زہرہ کی ایک مورتی راجا کے پیچھے ہاتھی کی زین سے باندھ دی تاکہ ستاروں کا معاملہ پلٹ جائے ۔

محمد بن قاسم نے مروجہ معیار کے مطابق بہت بہتر اور جدید طریقے سے سپاہیوں کی صف بندی کی اور فوج میں جذبے کو ابھارنے کے لیے ان سے اس طرح مخاطب ہوا :

"اے عربی نژاد لوگو ! تم اپنے وطن اور اہل و عیال سے دور اس سرزمین پر ہو ، جہاں تمھارے دشمن تم سے جنگ پر آمادہ ہیں ۔ تمھارا کوئی مددگار نہیں ۔ اس لیے سارا بھروسہ خدا پر رکھو ، وہی کامیابی عطا کرے گا ۔ جب جنگ شروع ہو تو ہر شخص کو اپنے فرائض کا خیال رکھنا چاہیئے ۔"

جنگ شروع ہوئی ، داہر اپنی فوج کو گروہوں کی شکل میں میدان میں اتار رہا تھا اور مسلمان ان کو سخت مصیبت میں دوچار کر رہے تھے ۔ اسی دوران چند برہمن آئے اور انھوں نے مخبری کی کہ راجا داہر کی فوج کا پچھلا حصہ غیر محفوظ ہے ۔ ادھر سے حملہ کیا گیا تو دشمن کے پیر اکھڑ گئے اور داہر کا لشکر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ۔ عرب سپاہیوں نے راجا کی فوج میں کھلبلی مچا دی اور ان میں سے چند راجا داہر کی سواری تک

پہنچ گئے ۔ اس دوران محمد بن قاسم نے پچکاریوں کے ذریعے تیل پھینکنے والے آتشبازوں کو آگ لگانے کا حکم دے دیا ۔ اس سے داہر کی فوج میں ہر طرف آگ لگ گئی ۔ ہاتھی آگ سے گھبرا کر جو بھاگے تو اپنی ہی فوج کو روندتے چلے گئے ۔

راجا داہر کے ہاتھی پر تیل پھینک کر آگ لگائی گئی تو وہ پانی کی طرف بھاگا ۔ راجا سخت زخمی تھا ۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سپاہی اور معتمد سردار سب مارے گئے ہیں ، اس میں غیرت نے پھر جوش مارا اور انتہائی بہادری سے لڑنے لگا ۔ اس اثنا میں ایک عرب سپاہی نے تلوار سے اس کی گردن کاٹ دی ۔

راجا داہر کے بیٹے سے جنگ

راجا داہر کے خاتمے کے بعد عرب فوج چھوٹے موٹے قلعہ جات فتح کرتے ہوئے ، سندھ کی راجدھانی برہمن آباد کی طرف بڑھے ۔ (دیکھیں نقشہ) — یہاں راجا داہر کا بیٹا جے سنگھ ، (عام طور پر جیسہنہ کے نام سے مشہور تھا) مقابلے کی تیاری کر رہا تھا ۔ عرب فوج نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا اور جیسہنہ کے سپاہیوں نے چھاپہ مار جنگ شروع کر دی اور رسد کا راستہ بند کر دیا ۔ چھ ماہ تک یہ صورتحال جاری رہی ۔ راجا جیسہنہ کے سرداروں نے موقع پرستی سے کام لیا اور اپنی قوم سے غداری کر کے عربوں کے ساتھ مل گئے ۔ ان میں سے ایک سردار نے جیسہنہ کو شکست دے کر اسے کشمیر کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا ۔

جیسہنہ کے جانے کے بعد قلعہ میں محصور لوگ کچھ دن تک مقابلہ کرتے رہے ۔ لڑنے کی تاب ختم ہونے پر بھی وہ وقفے وقفے سے حملے کرتے رہے ۔ اسی اثنا میں شہر کے چار اکابرین نے محمد بن قاسم سے خفیہ معاہدہ کر کے ایک مصنوعی جنگ کے بعد قلعے کے دروازے کھول دیے ۔ محمد بن قاسم نے یہاں انتظامی اور دوسرے امور میں بڑا معتدل اور منصفانہ انداز اختیار کیا ۔

اس دوران محمد بن قاسم کو حجاج نے یہ خط بھیجا :

"میرے چچا زاد بھائی ، محمد بن قاسم ! تم نے اپنی بہادری اور تدبر سے

سندھ کی فتح اور اس پر حکمرانی کرنے میں جو تکلیف اٹھائی ، وہ قابل ستائش ہے ——— اب تم کو ان شہروں پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے ، سندھ اور ہندوستان کے مرکزی دو شہر ، ارور اور ملتان ہیں ۔ یقین ہے کہ ان میں قدیم زمانے سے دولت جمع ہو ، اس لیے ان کی طرف قدم بڑھاؤ"۔

محمد بن قاسم ، حجاج بن یوسف کے حکم کی تعمیل میں ارور (دیکھیں نقشہ) اور دوسرے شہر فتح کرتا ہوا ملتان پہنچا ۔

ملتان کی فتح :

ملتان کے شہریوں نے اپنے آپ کو قلعہ میں محصور کر لیا ۔ محاصرہ کئی روز تک جاری رہا ۔ سامان رسد میں کمی کے باعث ، محمد بن قاسم کی پریشانی بڑھ رہی تھی ۔ سپاہی باربرداری کے جانور ذبح کر کے کھانے لگے ۔ آخر ایک سپاہی نے ایک نالے کا پتہ لگا لیا جس کا پانی ملتان کے شہری استعمال کرتے تھے ۔ عربوں نے نالے کے پانی کا رخ ملتان شہر کی بجائے دوسری طرف موڑ دیا ۔ ملتانی پیاس سے مرنے لگے اور مجبوراً قلعہ سے باہر آکر لڑنے پر آمادہ ہو گئے ۔ ایک طویل عرصے تک جنگ جاری رہی مگر فیصلہ نہ ہو سکا ۔ ملتانی حملہ کرتے اور واپس قلعہ بند ہو جاتے ۔ آخر کوشش کی گئی کہ فصیل کے کمزور حصوں کو توڑ کر حملہ کیا جائے ۔ یہ ترکیب کامیاب رہی اور آمنے سامنے جنگ شروع ہو گئی ۔ آخر کار ملتان فتح ہو گیا ۔

یہاں ایک مندر سے سینکڑوں من سونا ملا ۔ اس خزانے کی نشاندہی ایک برہمن نے کی تھی ۔ اسی دوران حجاج بن یوسف کا ایک خط موصول ہوا ، متن یہ تھا :

"اے چچا کے لڑکے ، تمھیں یاد ہو گا کہ تمھاری روانگی سے پہلے میں نے خلیفہ سے یہ عہد کیا تھا کہ بیت المال سے جس قدر روپیہ اس مہم پر صرف کیا جائے گا ، اس کی دوگنی رقم داخل کر دی جائے گی ۔ اس عہد کا پورا کرنا ہم پر فرض ہے ۔ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتے رہو ۔ اشاعتِ اسلام کا خاص خیال رکھو ، جو بڑا شہر ہو ، وہاں مسلمانوں کے لیے مسجد

ضرور تعمیر کرو ۔"

محمد بن قاسم نے اس خط کے ملتے ہی خزانہ ، بصرہ روانہ کر دیا ۔ صرف شدہ رقم کا دوگنا خزانے میں جمع کروانے کے بعد حجاج کو کئی کروڑ درہم کا فائدہ ہوا ۔

محمد بن قاسم کی کامیابی کے محرکات

عربوں کا سندھ پر حملہ حقیقت میں دو تہذیبی دھاروں اور ثقافتی مزاجوں کا ٹکراؤ تھا ۔ ان دونوں کا معاملاتِ دنیا کو دیکھنے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف تھا ۔ عربوں نے اسلام کی آمد کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں اپنے تجربات اور علم کو وسعت دی تھی ۔ سندھ پر حملے سے پہلے وہ دنیا کی کئی اقوام سے مڈبھیڑ کر چکے تھے اور ان جنگوں میں فتح حاصل کرنے کے بعد ان میں خوداعتمادی اور حربی فنون بہت حد تک پختہ ہو چکے تھے ۔ اس کے برعکس ہندوستانی اپنی ثقافتی ہیئت کے اعتبار سے حربی معاملات میں کم تجربہ رکھتے تھے اور ان کی تکنیک بھی روایتی تھی ۔ تاہم ہندوستان میں محمد بن قاسم کی کامیابی کی وجوہات اور محرکات کا مختصر تجزیہ پیش کیا جاتا ہے ۔

1 - جدید آلاتِ حرب

کسی بھی جنگ کو جیتنے میں جہاں کئی دوسرے عوامل کا کارگر ہونا ضروری ہوتا ہے وہاں آلاتِ حرب کا جدید تر ہونا ایک فیصلہ کن محرک بن جاتا ہے ۔

محمد بن قاسم کی فوج اس زمانے کے معیار کے مطابق نہایت کارگر اور جدید ہتھیاروں سے لیس تھی ۔ ان ہتھیاروں میں منجنیق اور تیل پھینک کر آگ لگانے والے ہتھیار اہم تھے ۔ منجنیق سے پتھروں کی بارش ہو سکتی تھی اور آگ لگانے والے آلات لشکر کی صفوں اور انتظام کو تباہ کرنے کے لیے کارآمد تھے ۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانیوں کی فوج زیادہ تر غیر تربیت یافتہ سپاہیوں ، روایتی ہتھیاروں ، تلوار ، نیزے اور تیر وغیرہ پر مشتمل تھی ۔ اگرچہ ہاتھیوں کا جنگ میں استعمال ہندوستانی فن حرب میں بہت پرانا اور مؤثر تھا تاہم عربوں کے آگ لگانے سے نہ صرف یہ غیر مؤثر

ہو گئے بلکہ انھوں نے عربوں کے حق میں کام کیا اور اپنی فوج کو ہی کچلنا شروع کر دیا ۔

تلوار یا نیزے سے لڑائی کا دائرہ چند افراد تک محدود رہتا ہے ، تیر سے ایک وقت میں ایک ہی شخص متاثر ہو سکتا ہے ـــــ مگر منجنیق سے پتھروں کی بارش کرنے سے فوج کا ایک حصہ تباہ ہو سکتا تھا ۔ مطلب یہ کہ ان ہتھیاروں میں نقصان پہنچانے کی صلاحیت اور دائرہ کار میں بہت بڑا فرق تھا ۔

2 - بہتر جنگی حکمت عملی

اُس زمانے میں فوج کی صف بندی اور جنگی حکمت عملی آج کے مقابلے میں خاصی سادہ تھی ، تاہم اس کا مؤثر ہونا ضروری تھا۔ جنگی حکمت عملی طے کرتے وقت ان اُمور کا دھیان رکھا جاتا ہے :

(1) فوج کا جانی و مالی نقصان کم سے کم ہو ۔

(2) دشمن کو ایسے موقعے پر پکڑا جائے جب اس کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جا سکے ۔

(3) اردگرد کے علاقوں سے متوقع مداخلت کا پیشگی بندوبست کرنا ۔

(4) فوج کے حوصلے بلند رکھنا ۔

محمد بن قاسم کسی بھی حملے سے پہلے اپنی فوج کو محفوظ کرنے کے لیے اس کے اردگرد خندقیں کھدواتا تھا ۔ اچانک حملے سے بچنے کے لیے پہرے کا بندوبست کرتا تھا ۔

جنگ میں دشمن کی شہ کے باوجود محمد بن قاسم مناسب وقت کا انتظار کرتا ۔ جب حملہ کرتا تو پوری قوت لگا دیتا ، جس کے نتیجے میں اسے فتح ہوتی یا دشمن محصور ہو جاتا تھا ۔

محمد بن قاسم جس علاقے میں حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تھا ، وہاں کے اہم اکابرین اور راجاؤں کے بارے میں ضروری کوائف جمع کر کے ان کو مختلف حربوں سے دشمن کے ساتھ ملنے یا اس کی مدد کرنے سے روک لیتا تھا ۔

محمد بن قاسم کی فوج ایک اجنبی ملک میں اپنے وطن سے سینکڑوں کلومیٹر دور آ کر مہم جوئی کر رہی تھی ۔ یہاں مہم کے امور پر عدم توجہی یا سستی کا مطلب موت تھا ، اور فتح کی صورت میں عزت اور وقار ۔۔۔ اس جذبے کے باعث فوج میں یک نظری اور ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ اگر کبھی اس میں کمی آتی تو محمد بن قاسم فوراً تقریر سے یا کوئی دوسرا اقدام کر کے ان کے حوصلے بڑھاتا رہتا تھا۔

ہندوستانی فوج اپنی تنظیم کے اعتبار سے کم تربیت یافتہ تو تھی ہی ، ان کے سپہ سالاروں کی حکمتِ عملی بھی ناقص تھی ۔ وہ یا تو قلعہ بند ہو کر لڑتے یا پھر مختلف گروہوں میں جنگ کرتے تھے ۔ ان دونوں صورتوں میں ان کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا ۔ قلعہ بند ہونے کی صورت میں رسد کی سپلائی ختم ہو جاتی تھی ، یا لوگ تنگ آ جاتے تھے اور اس سے چھٹکارے کے لیے ہیجانی انداز میں لڑنے پر اتر آتے اور مات کھا جاتے تھے ۔

محمد بن قاسم کے مقابلے میں راجا داہر جنگی فنون میں کم تجربہ تو رکھتا ہی تھا ، اس میں قوتِ فیصلہ کی بھی شدید کمی تھی ، جنگ اروڑ سے پہلے وزیر سے مکالمہ اس کا واضح ثبوت ہے ۔

3 - مقامی لوگوں کی توہم پرستی :

اس زمانے میں سندھ کے باسی نجوم اور شگون کو اپنی حقیقی صلاحیتوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے تھے ۔ ان کی مذہبی پیش گوئی کہ سندھ پر عرب قبضہ کر لیں گے ، عوام و خواص میں مشہور تھی ۔ وہ اسے اپنے مذہب کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے اٹل سمجھتے تھے ۔ اس نقطۂ نظر کے ناطے وہ عربوں سے جنگ کو بھی بے سود اور گناہ گردانتے تھے ۔

چچ نامے میں بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ جب عرب کسی قلعے کا محاصرہ کرتے تو کوئی نہ کوئی مذہبی رہنما ان کے پاس پہنچتا اور انھیں شہر فتح کرنے کی ترکیب بتاتا ۔ ضیعف الاعتقادی کی واضح مثال دیبل کی فتح ہے جس میں مندر کا ایک جھنڈا گرنے سے پورا شہر فتح ہو گیا ۔

اگر یہ کہا جائے کہ سندھ میں عربوں کی لڑائیاں اصل میں خوداعتمادی اور ضعیف الاعتقادی کے مابین لڑائی تھی تو مناسب ہو گا ۔ عرب ایک شاندار ابھرتی ہوئی طاقت کے نمائندہ تھے اور نفسیاتی طور پر یہ احساس ان کی خوداعتمادی کے لیے کافی تھا ۔ پھر وطن سے دور ، اجنبی علاقے میں لڑائی کے ماحول میں اپنے آپ پر یقین اور اعتماد پہلی ضرورت بھی تھا ۔

4 - محمد بن قاسم کا حُسنِ سلوک

ابتدائی فتوحات کے بعد محمد بن قاسم نے مقامی لوگوں کے اندر اپنے اور اپنی فوج کے بارے میں یہ تأثر پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی کہ وہ رواداد اور نرم خُو ہیں ۔ اس کی فوج اس زمانے کی افواج کے مقابلے میں غیر تشدد پسند تھی ۔ محمد بن قاسم نے فوج کو سخت تاکید کر رکھی تھی کہ فتح کے بعد کسی کو قتل نہ کیا جائے ۔ بوڑھوں ، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے ۔ علاقہ فتح ہونے کے بعد رعایا کو عام معافی دے دی جاتی تھی ۔ ان کی زمینوں اور مال و اسباب کو لوٹا نہ جاتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کو اپنے مذہبی امور میں مکمل آزادی دے دی جاتی تھی ۔

مقامی لوگ ، راجا داہر کے مظالم کی وجہ سے محمد بن قاسم کو ایک نجات دہندہ سمجھتے تھے ۔ راجا داہر عوام میں حد درجہ غیر مقبول تھا ۔ اس نے عام لوگوں پر سخت پابندیاں لگا رکھی تھیں ۔ مثال کے طور پر ایک گروہ پر پابندیوں کا تذکرہ چچ نامے میں اس طرح ہے :۔

> "وہ نیچے اور اوپر کالی گدڑی پہنتے تھے ، کھردری چادر کاندھوں پر ڈالتے تھے ، سر اور پیر برہنہ رکھتے تھے ۔ ان میں سے کوئی (اگر کسی خاص موقع پر) نرم کپڑا پہنتا تو اس کو جرمانہ کیا جاتا تھا ۔ یہ لوگ گھر سے باہر کتے کے ساتھ چلتے تھے تاکہ دور سے پہچانے جا سکیں ——— اگر کوئی ان میں سے چور ثابت ہو جاتا تو اسے اس کے عیال سمیت جس میں بچے وغیرہ شامل تھے ، آگ کی نذر کر دیا جاتا تھا ۔"

یہ ذکر یہاں بسنے والے ایک قبیلے کے بارے میں تھا جو راجا داہر کے پیدا کردہ

انتظامی ، معاشی اور معاشرتی ماحول میں سخت پس ماندہ تھے ۔ راجا ان کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان کو سختی سے دبا رہا تھا ، جس کے نتیجے میں یہ لوگ بھوک افلاس سے تنگ آکر چوری پر اتر آتے تھے ۔ ان کے جائز مسائل حل کرنے کی بجائے ان پر مزید پابندیاں لگا دی گئیں تھیں ۔

راجا داہر کی رعایا میں لوگوں کی اکثریت بدھ مت کی پیرو کار تھی ۔ راجا داہر کے والد چچ نے بدھ مت کے ماننے والے ایک بادشاہ سے حکومت چھینی تھی ۔ اس وجہ سے بدھ مت کے لوگ راجا داہر سے ناخوش تو تھے ہی ، اس کی پالیسیوں کے باعث ان میں ایک جذبۂ مخاصمت نے جنم لے لیا تھا ۔

محمد بن قاسم کے حملے کے وقت بدھ آبادی نے مسلمانوں کا ساتھ دینا بہتر سمجھا کیونکہ اس سے ایک بہتر تبدیلی کا امکان تھا ۔

محمد بن قاسم کی انتظامی حکمتِ عملی

مفتوحہ علاقے میں عام طور پر دو طرز کے انتظام کی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں ۔ ایک یہ کہ موجود انتظامی ڈھانچے میں اپنی خواہش کے مطابق تبدیلی یا ترمیم کر دی جائے اور اس میں تمام اہلکاروں کی تقرری بھی فاتح قوم سے کی جائے ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انتظامی ڈھانچے میں ضروری تبدیلی کر لی جائے مگر مقامی کارندوں کو بدستور بحال رکھا جائے ۔

پہلی صورت میں نئے نظام اور نئی انتظامی مشینری کے قیام کی وجہ سے مفتوحہ لوگ اپنے آپ کو بےگانہ محسوس کریں گے اور حاکم و محکوم کے درمیان تال میل تو دور کی بات ہے ان کے مابین باہمی اعتماد ختم ہو جائے گا ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فاتح کتنا ہی اچھا ہو ، اس کے اور مفتوح کے درمیان تعلقات میں ایک ناہمواری ضرور رہتی ہے ۔ اس پر اگر انتظامی ڈھانچے میں فاتح قوم کے افراد کی اکثریت ہو تو دونوں اطراف

کے مابین سمجھنے سمجھانے کا معاملہ ٹھپ ہو جائے گا۔

محمد بن قاسم نے دوسرا طریقۂ انتظام اپنایا۔ اس نے سندھ میں رائج انتظامی ڈھانچے میں معمولی سی ترامیم کیں۔ ان ترامیم میں بھی اس بات کا خصوصی خیال رکھا گیا کہ ان سے مروجہ نظام پر منفی اثرات مرتب نہ ہوں۔

حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو انتظامی امور کے سلسلے میں ایک خط لکھا، جس میں انتظام کی روح اور مقاصد کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں درج ہے:

"سلطنت کو چلانے کے چار طریقے ہیں۔

اول — صلح، ہمدردی، چشم پوشی اور رشتہ داری۔

دوم — مال کا خرچ کرنا، انصاف اور عطیے دینا۔

سوم — دشمنوں کی مخالفتوں میں صحیح رائے قائم کرنا اور ان کے مزاج معلوم کرنا۔

چہارم — رعب، مصیبت، دلیری اور قوت سے دشمنوں کو دفع کرنے کی کوشش کرنا۔"

اس انتظامی روح کو محمد بن قاسم نے سندھ میں انتظام کے لیے ایک بنیاد کے طور پر استعمال کیا۔ اس نظام میں اہم باتیں یہ تھیں۔

1- برہمن آباد کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے اعلان کیا کہ جن لوگوں نے بخوشی اسلام قبول کر لیا ہے ان کے حقوق عرب مسلمانوں کے مساوی ہوں گے اور وہ غلامی اور جزیے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ جو لوگ اپنے مذہب پر رہیں گے، ان پر ان کے مذہب کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں کی جائے گی، البتہ ان کو اپنے تحفظ کے انتظام کے لیے حکومت کو جزیہ دینا ہوگا۔ جس کی شرح یہ ہوگی:

الف۔ دولت مندوں سے 48 درہم (موجودہ معیار کے مطابق قریباً 480 روپے سالانہ)۔

ب۔ متوسط طبقے سے 24 درہم (موجودہ معیار کے مطابق قریباً 240 روپے سالانہ)۔

ج ۔ کم حیثیت والوں سے 12 درہم (موجودہ معیار کے مطابق قریباً 120 روپے سالانہ) ۔

اس اعلان کے بعد بہت سے لوگوں نے جن کا تعلق زیادہ تر کم حیثیت والے طبقے سے تھا مسلمان ہونے لگے ۔ برہمنوں اور مندروں کو جو رعائتیں مل رہی تھیں ، ان کو برقرار رکھا گیا ۔

2- محمد بن قاسم نے سندھ کے نظم ونسق کے مروّجہ طریقوں میں بنیادی تبدیلیاں کیے بغیر اسے جاری رہنے دیا ۔ اس نے راجا داہر کے بیشتر عمّال کو ان کے عہدوں پر بحال رکھا ، البتہ صوبوں میں عرب گورنر مقرر کیے ۔ نچلی سطح پر مالیاتی اور دیوانی نظام مقامی عہدیداروں کے پاس ہی رہا ۔

محمد بن قاسم نے تمام عہدیداروں کو حکم دیا کہ "تمھارا سب کا فرض یہ ہو گا کہ رعایا اور حکومت کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرو"۔ مالگزاری وصول کرنے والے برہمنوں کو نصیحت کی کہ مالگزاری وصول کرنے میں رعایا پر ظلم و ستم نہ کیا جائے ، اتنا محصول ، لگان یا جزیہ کسی پر نہ لگایا جائے جو اس کی استطاعت سے باہر ہو ۔ محمد بن قاسم نے یہ عام اعلان کروا دیا تھا کہ رعایا کی بھلائی کے لیے اگر کسی کے پاس کسی قسم کی تجویز ہو تو وہ فوراً حکومت کو اطلاع دے تاکہ اس پر عمل کیا جا سکے ۔

ان تمام اقدامات کا عام لوگوں پر مثبت اثر ہوا اور انھوں نے محمد بن قاسم کو راجا داہر کے مقابلے میں ایک بہتر اور مخلص حکمران جانا ۔ اس خیال کو مزید تقویت برہمنوں نے دی ۔ برہمن ، معاشرتی طور پر ہندوؤں میں خاصے اثر کے حامل تھے ۔ ابتدا میں ہندو ، محمد بن قاسم کو اچھا نہ جانتے تھے کیونکہ محمد بن قاسم نے آکر ہندوؤں کی حکومت ختم کر دی تھی ۔ چونکہ محمد بن قاسم نے برہمنوں کے مقام اور عہدے کو بالکل نہ چھیڑا بلکہ ان کے حقوق کو تحفظ دینے کا اعلان کیا تو یہ لوگ محمد بن قاسم سے بہت خوش ہوئے ۔ انھوں نے گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو سمجھایا ۔ جس طرح برہمن لوگوں کو سمجھاتے تھے اس کا تذکرہ چچ نامے میں اس طرح ہے :

"ہماری سلطنت تباہ ہو گئی ہے اور فوجی طاقت جاتی رہی ، اب ہم میں

مقابلے کی تاب نہیں ۔ یقیناً ہم گھر سے نکال دیے جاتے اور تمام جائیدادوں سے محروم کر دیے جاتے ۔ فقط حاکم قوم کی مروّت اور عدل و انصاف سے ہم اس وقت بھی معزز عہدوں پر ہیں اور ہر چیز ہمارے ہاتھ میں ہے ۔ اب صورت یہ ہے کہ یا تو ہم لوگ اہل و عیال کو لے کر ہندوستان ہجرت کر جائیں ۔ ایسی صورت میں ہم لوگ بالکل مفلس ہو جائیں گے ۔ کیونکہ تمام جائیدادیں اسی جگہ چھوڑنی پڑیں گی اور یا پھر مطیع رہ کر جزیہ ادا کریں اور آرام و عزت سے زندگی بسر کریں۔"

برہمنوں کی اس تلقین سے لوگوں میں خاصا اطمینان آیا اور انھوں نے جزیہ ادا کر کے سندھ میں ہی زندگی بسر کرنے کو فوقیت دی ۔

محمد بن قاسم کا انجام

محمد بن قاسم ذاتی طور پر ایک شاندار شخصیت کا مالک تھا ۔ اس میں ایک کامیاب جرنیل اور ایک مؤثر منتظم کی خوبیاں موجود تھیں ۔ انہی خوبیوں کو بروئے کار لاکر اس نے برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم مہم کو کامیابی سے ہم کنار کیا ۔ اس مہم کے اثرات آئندہ تاریخ پر بڑی گہرائی کے ساتھ مرتب ہوئے اور اس نے یہاں بسنے والوں کی زندگیوں کو بدل کر رکھ دیا ۔

اس قد آور شخصیت کا اختتام بڑا کربناک تھا ۔ محمد بن قاسم ابھی ہندوستان میں ہی تھا کہ حجاج بن یوسف کا انتقال ہوگیا ۔ اموی حکومت کا حکمران ولید بن عبدالملک بھی اسی زمانے میں انتقال کر گیا ۔ اس کے بعد سلیمان بن عبدالملک نے عنانِ حکومت سنبھالی ۔ سلیمان کا حجاج سے سیاسی اختلاف چلا آ رہا تھا ۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عبدالملک بن مروان نے اپنے بیٹے ولید کے بعد سلیمان کو ولی عہد مقرر کیا تھا ۔ ولید نے اپنے بھائی سلیمان کی جگہ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد مقرر کرنا چاہا ۔ اس سیاسی تگ و دو میں حجاج ، ولید کا ایک سرگرم ساتھی رہا ۔

سلیمان نے ولید کے مرنے کے بعد تخت پر قبضہ کر لیا ۔ اب وہ اپنے سیاسی حریفوں سے انتقام لینا چاہتا تھا ۔ اس ضمن میں حجاج اس کی فہرست میں سب سے اوپر تھا ۔ چونکہ اس کا انتقال ہو چکا تھا ، لہذا اس نے حجاج کے قریبی لوگوں کو پکڑنا شروع کر دیا ۔

سلیمان کے حکم سے محمد بن قاسم کو معزول کر دیا گیا اور اسے گرفتار کر کے مجرموں کی طرح ٹاٹ کے کپڑے پہنا کر، ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ڈال کر عراق لایا گیا ۔ یہاں اسے جیل میں بند کر دیا گیا اور اسے ہر طرح کی سزائیں دی گئیں ۔ یہیں جیل میں سخت تکلیف اور مصیبتیں جھیل جھیل کر محمد بن قاسم فوت ہوا ۔ انہی ایامِ کرب میں محمد بن قاسم ایک شعر پڑھا کرتا تھا ، جس کا ترجمہ یہ ہے :

"لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور اس نوجوان کو ضائع کر دیا جو مصیبت کے دن کام آتا تھا اور سرحدوں کو مضبوط کرنے کے لیے سب سے مناسب تھا ۔"

محمد بن قاسم کی موت پر ، اہل سندھ نے گہرے افسوس اور غم کا اظہار کیا ۔ اس کی بہادری ، فیاضی ، مروّت اور احسانات کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس کی ایک مورتی بنا کر ایک شہر میں نصب کر دی ۔

تجزیہ :-

کسی بھی تاریخی واقعے یا حالت کے تجزیے کے لیے سب سے بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس کے عمل پذیر ہونے کے اسباب اور محرکات کا جائزہ لیا جائے ۔ ان محرکات یا اسباب کو کسی بھی تعصب یا پہلے سے طے شدہ معیار سے الگ رکھ کر ڈھونڈ لیا جائے اور ان کو بہتر طور پر سمجھ لیا جائے تو وہ تاریخی واقعہ یا حالت اپنی اصل صورت میں واضح ہو جاتی ہے ۔ یہی باتیں تاریخی تجزیے کی بنیاد ہیں ۔

سندھ پر عربوں کے قبضے کے واقعات کے محرکات کا بغور مطالعہ کریں تو درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں ۔

1- عربوں کے لیے سندھ پر حملہ کرنا سیاسی طور پر ضروری تھا ، کیونکہ ایران کی فتح کو قائم رکھنے کے لیے سندھ کو زیر اثر لانا اہم تھا ۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں سندھ اور ایران میں عربوں کے خلاف سرگرم گروہ اس علاقے میں ان کے لیے مسئلہ کھڑا کر سکتے تھے ۔ سندھ کے حکمران کا عرب باغیوں کو پناہ دینا اور محمد علافی کی پذیرائی کرتے ہوئے اس کو ایران کی سرحد کے قریب علاقہ دینا ، عربوں کے خلاف اس قسم کے مقاصد کی غمازی کرتا ہے ۔ اس جگہ پر محمد علافی کے ساتھ بے شمار باغی لوگ بھی جمع ہو چکے تھے ۔

اس سیاسی تناظر میں لنکا کے جہاز کو لوٹنے کا واقعہ عربوں کو چوکنا کرنے کے لیے کافی تھا ۔ اس واقعہ سے یہ تأثر کہ عرب اپنے عزائم اور مقاصد کی حفاظت نہیں کر سکتے ، قائم ہو سکتا تھا ۔ یہ ان کی ابھرتی ہوئی سیاسی طاقت کے لیے غیر مناسب اور غیر موزوں تھا ۔ اس سے اس خطے میں عربوں کی تجارت بھی سخت مخدوش ہو سکتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ حجاج جیسے صاحبِ بصیرت نے اس واقعے کو غیر معمولی طور پر اہمیت دی جس کا اظہار اس کی خلیفہ سے اجازت لینے کے لیے کوششوں اور بعد ازاں محمد بن قاسم کو بھیجے جانے والے خطوط سے کیا جا سکتا ہے ۔

2- جس زمانے میں عربوں نے سندھ پر حملہ کیا اس وقت سندھ کے داخلی حالات عربوں کے حق میں تھے ۔ ملک کی اکثریتی آبادی اپنے حکمرانوں سے نالاں تھی ۔ اپنی حالت زار

کو بدلنے کے لیے وہ کسی بھی خوشگوار تبدیلی کے منتظر تھے۔

بعض مؤرخین کے نزدیک اس دور میں عوام کی سوچ، سیاسی تبدیلی میں خاطر خواہ کردار اور عمل دخل نہیں رکھتی تھی۔ اس کی یہ دلیل دی جاتی تھی کہ وہ معاشی طور پر نہ تو کسی کی مدد کر سکتے تھے اور نہ ہی اتنا معاشرتی اثر رکھتے تھے کہ امرأ اور راجاؤں کو مزاحمت کی طرف مائل کر سکتے۔ یہ باتیں اپنے طور پر درست ہیں مگر یہ بات بڑی واضح ہے کہ عام لوگوں میں حکمرانوں کے بارے میں ناپسندیدگی، سیاسی حالات میں ایسا میلان پیدا کر دیتی ہے جو کسی بھی حکومت کے لیے نہایت خطرناک ہو جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں لوگ اپنی نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار لڑائی کے وقت نہ لڑ کر یا پھر بد دلی سے لڑ کر کرتے تھے۔ محمد بن قاسم کے ابتدائی حملوں میں ایسے کئی واقعات نظر آتے ہیں۔

ابتدائی فتوحات کے دور میں جب محمد بن قاسم کی یہ شہرت ہوئی کہ وہ بڑا روادار اور ہمدرد ہے تو اپنی حکومت کے مقابلے میں محمد بن قاسم کی ذات میں انھیں ایک بہتر متبادل محسوس ہوا۔ انھوں نے محمد بن قاسم کو دل و جان سے نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کی ہر طرح سے مدد بھی کی۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے کئی ایک شہر بغیر کسی جنگ کے فتح کر لیے۔ یہاں لوگ شہر سے باہر آکر اس کا استقبال کرتے اور اسے عزت و احترام سے سلطنت سنبھالنے کو کہتے۔ یہی تأثر عام لوگوں کے علاوہ امرأ طبقے میں بھی پیدا ہو رہا تھا۔ انھوں نے بھی اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ محمد بن قاسم کا ساتھ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی راجا بغیر کسی جنگ کے محمد بن قاسم سے مل گئے۔

سندھ پر محمد بن قاسم کی فتح محض ایک واقعہ نہ تھا۔ اس سے یہاں کی زندگیوں میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ عرب سندھ میں محض حملہ آور بن کر نہیں آئے تھے، ان کے ساتھ اسلام کا ایک ضابطۂ حیات بھی تھا۔ اس سے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ اسلامی سوچ اور مزاج، مقامی اندازِ زندگی اور فکر پر اثرانداز ہو اور مقامی رجحاناتِ معاشرت میں تبدیلیاں بھی رونما ہوں۔ مختصر طور پر یہ امکانات حسب ذیل تھے۔

1۔ اسلام کی اشاعت

2 - ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومتوں کا قیام

3 - تجارتی روابط

4 - ثقافتی اور علمی روابط ۔

یاد دہانی کے لیے چند نکات

1 - عربوں کے سندھ پر حملے کے محرکات میں ، ایران کی فتح ، باغیوں کا سندھ میں جمع ہونا ، تجارتی راستوں کا عدم تحفظ اور جہاز کو لوٹنے کا واقعہ شامل تھے ۔

2 - حملے کے وقت سندھ میں حکومت کرنے والا راجا لوگوں میں اپنے انتظامی رویوں کی وجہ سے غیر مقبول تھا، اور لوگ ایک بہتر تبدیلی کے خواہاں تھے ۔

3 - عربوں کی فوج بہتر عسکری تیاری اور مؤثر حکمتِ عملی کے باعث راجا داہر کی فوج کے مقابلے میں بہت اعلیٰ کارکردگی اور اہلیت رکھتی تھی ۔

4 - محمد بن قاسم کے رویے سے مقامی آبادی میں عربوں کے حق میں اہم تبدیلیاں آئیں ۔

5 - سندھ کی فتح سے مقامی تہذیب اور عرب مسلمانوں کی تہذیب کے درمیان علمی ، فنی اور ثقافتی میدانوں کے علاوہ تجارتی سطح پر روابط میں وُسعت اور اشتراک کے امکانات پیدا ہوئے ۔

6 - کسی تاریخی واقعہ یا کیفیت کو سمجھنے کے لیے اس کے محرکات اور اسباب کو بغیر کسی تعصب یا پہلے سے طے شدہ اصول کے بغیر سمجھنے سے تاریخی واقعہ اور کیفیت درست طور پر سمجھ آتی ہے ۔

غور و فکر کے لیے چند سوالات

الف ۔

1 - تصور کریں کہ آپ محمد بن قاسم کے قریبی آدمیوں میں سے ایک ہیں ۔ آپ کا لشکر دیبل پہنچ چکا ہے ۔ آپ نے دیبل پہنچنے سے ملتان کی فتح تک کیا کچھ

دیکھا — ؟ اس کو تحریر کریں اور اپنے احساسات اور خیالات کو اس تحریر میں شامل کریں ۔

2 - محمد بن قاسم کی فتح سندھ میں ، سندھ کے مقامی حالات نے زیادہ اہم کردار ادا کیا یا محمد بن قاسم کی حکمت عملی نے ؟ بحث کریں ۔

3 - سندھ کا ایک عام آدمی محمد بن قاسم کی فتح کے بعد کیا محسوس کرتا تھا ، کیا یہ تبدیلی اس کے لیے خوشگوار تھی ، کلاس میں بحث کریں ۔

4 - درج ذیل مقامات کو نقشے میں تلاش کریں ۔

(1) دیبل (2) نیرون (3) سیوستان (4) اروڑ

ب ـ مختصر جواب دیں :

I - ظہور اسلام سے پہلے عرب تاجروں کی فن جہاز رانی میں کیا حیثیت تھی ؟

II - راجا داہر کے عوام میں غیر مقبول ہونے کی کیا وجوہات تھیں ؟

III - عربوں کے سندھ پر حملہ کرنے کے اہم اسباب کیا تھے ؟

IV - حجاج بن یوسف کو کس شرط پر خلیفہ نے ، سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت دی ؟

V - وہ کون سی اہم باتیں تھیں ، جن کی بنیاد پر محمد بن قاسم کو راجا داہر پر فوجی برتری حاصل تھی ؟

VI - محمد بن قاسم کی وفات کن حالات میں ہوئی ؟

VII - کسی تاریخی واقعہ یا کیفیت کو درست طور پر سمجھنے کے لیے کیا کرنا چاہئیے ؟

ج ـ ہاں یا نہیں میں جواب دیں۔

1 - ظہور اسلام سے پہلے عرب تاجروں کے برصغیر سے تجارتی روابط قائم تھے ۔

2 - آریا قوم نے سندھ کے علاقے کا نام انڈیا رکھا ۔

3 - راجا داہر کے والد نے ایک معمولی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا ۔

4 - راجا داہر کے دورِ حکومت میں عام ہندوؤں اور بدھ مت کے ماننے والوں

کو خاص مراعات حاصل تھیں۔

5- محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے سے پہلے کبھی کسی نے ایسا کرنے کا سوچا تک نہ تھا۔

6- تکنیکی اعتبار سے منجنیق، محمد بن قاسم کے دور میں ایک جدید ترین ہتھیار تھا۔

7- دیبل کی فتح میں، مقامی شہریوں کی جھنڈے اور مندر کے بارے ضعیف الاعتقادی نے مرکزی کردار ادا کیا۔

8- محمد بن قاسم کی سندھ میں فتوحات میں ہندو اور بدھ مت کے رہنماؤں نے اس کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔

9- محمد بن قاسم نے سندھ میں جو نظام حکومت رائج کیا، اس سے مقامی آبادی کو سکون اور خوشحالی نصیب ہوئی۔

10- سلیمان بن عبدالمالک نے محمد بن قاسم کو اس کی خدمات کے سلسلے میں اعلیٰ انعامات دیے۔

د — نیچے ایک بیان کے ساتھ اس کی چند وجوہات دی گئی ہیں۔ یہ وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں تاہم ان میں کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور سب سے بہتر پر ✓ کا نشان لگائیں۔

1- سندھ پر محمد بن قاسم کے قبضے کا سب سے اہم سبب!

(الف) اس کے پاس جدید ترین ہتھیاروں کا ہونا تھا۔

(ب) مقامی لوگوں کا راجا داہر کے خلاف ہونا تھا۔

(ج) مقامی رہنماؤں کا ضعیف الاعتقاد ہونا تھا۔

(د) مقامی مذہبی رہنماؤں کا محمد بن قاسم کو مخبری کرنا تھا۔

2- عربوں کے سندھ پر حملہ کرنے کے محرکات میں سب سے اہم!

(الف) سندھ میں عرب باغیوں کا پناہ لینا تھا۔

(ب) ایران میں عرب مقبوضات میں سندھ کے راجا کی مداخلت تھی۔
(ج) عرب سے مشرقِ بعید آنے والے بحری راستوں کا غیر محفوظ ہونا تھا۔

کتابیات برائے مزید مطالعہ

اس سبق کو تحریر کرتے وقت درج ذیل کتب سے مدد لی گئی۔ طلبہ و طالبات مزید مطالعہ کے لیے ان کو بغور پڑھیں۔

1- تاریخ سندھ۔ مصنفہ اعجاز الحق قدوسی
مطبوعہ اردو سائنس بورڈ، لاہور اپریل 1985ء
2- تاریخ سندھ از مولانا سید ابو ظفر ندوی
مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، بھارت۔ 1947ء
3- آبِ کوثر، از ایس۔ ایم۔ اکرام
مطبوعہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور 1986ء
4- چچ نامہ (انگریزی ترجمہ) مرزا قلیچ بیگ

2

محمود غزنوی

تاریخی پس منظر :۔ ایک عام آدمی سے لے کر ایک حکمران تک کوئی بھی اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ماحول کی استواری میں تاریخی ورثہ، سماجی روایات اور اقتصادی حالات سب سے اہم اور مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس معاشرے اور ماحول کے تانے بانے کو جانچا جائے، جہاں محمود غزنوی پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔

اسلام کے فروغ کے ساتھ ہی عرب دنیا ایک سیاسی اور تہذیبی طاقت کے طور پر ابھری اور اس نے دنیا کے تمام اہم حصّوں پر اپنا اثر چھوڑا۔ مسلم ریاست کی تاریخ کو ان ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

1۔ پہلا دور (622ء – 748ء) : اس دور میں عرب، عراق، شام، ایران اور شمالی افریقہ میں فتوحات کی گئیں۔ یہ دَور خلفائے راشدینؓ اور اُمیّہ خاندان کا تھا۔

2 – دوسرا دور (748ء – 900ء) : یہ عباسی خلفاء کا دور تھا۔ اس میں فتوحات کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی۔ البتہ اس دور میں امن و خوشحالی تھی اور سلطنت مضبوط اور متحد رہی۔ اس دَور میں تہذیبی طور پر عربی انداز غالب رہا۔

3 – تیسرا دَور (900ء – 1000ء) : یہ دَور چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی حکومتوں کا دَور تھا۔ اس دَور میں خلیفہ کی انتظامی گرفت کمزور ہو رہی تھی، اور چھوٹی

چھوٹی ریاستیں جنم لے رہی تھیں ۔ ان ریاستوں پر تہذیبی طور پر ایرانی اثر غالب تھا اور ایرانی زبان و ادب کو فروغ مل رہا تھا اسی دَور میں نئے نئے علاقوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں

4 - چوتھا دور (1000ء - 1220ء) : یہ ترکی اور ایرانی سلطنت کا دَور ہے ۔ اس دَور میں ایرانی تہذیب و ثقافت کے نظریات کی ایک عملی شکل نظر آتی ہے ۔ اسی دَور میں غزنوی خاندان کا سیاسی تناظر اُبھرتا ہے ۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید (813ء - 833ء) کے زمانے میں ایک خاندان سامانہ کے لوگوں کو پہلی دفعہ اہمیت حاصل ہوئی ۔ یہ لوگ ترک (1) تھے اور امراء کے معتمد پہرے داروں میں شامل کیے جاتے تھے ۔ مامون الرشید نے اس خاندان کے کچھ لوگوں (خاندان 'سامانہ' کے بانی سامان کے چار بیٹوں) کو ایشیا میں چند اہم علاقے دے دیے جہاں انھوں نے ایک ریاست قائم کر لی ۔

1- ترک : اُس زمانے میں اناطولیہ کے مغرب اور بحرالکاہل کے مشرق کے درمیانی علاقوں میں بہت سے قبائل رہتے تھے ۔ یہ منگول نسل سے تعلق رکھتے تھے ۔ ان قبائل میں ترک ، تاتار ، ترکمان ، تبتی ، چینی اور منگول قابلِ ذکر ہیں ۔ یہ سب ایک مشترک رسم الخط رکھتے تھے جو اوپر سے نیچے لکھا جاتا تھا ۔ ان کے قد چھوٹے ، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں اور آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں ۔ یہ لوگ جسمانی طور پر حد درجہ مضبوط اور سخت حالات کو برداشت کرنے کی اہلیت رکھتے تھے ۔

عربوں کی فتوحات جب ایران کے شمال اور مغرب کی طرف بڑھیں تو یہ قبائل آہستہ آہستہ اسلامی سلطنت میں شامل ہونے لگے ۔ ان لوگوں نے اپنی شاندار جرأت سے اپنے فاتحین کو بہت متاثر کیا ۔ ان قبائل میں ترکوں کو بادشاہ کی حفاظت اور پہرہ داری کے لیے سب سے موزوں سمجھا جاتا تھا ۔ آہستہ آہستہ خود اعتمادی بڑھنے سے یہ لوگ محلّاتی سازشوں میں شریک ہونے لگے اور انھوں نے سیاسی طور پر اہم مقام حاصل کر لیا ۔ اب یہ سمجھا جانے لگا کہ ان علاقوں میں صرف تُرک ہی حکومت کر سکتا ہے اور ترک ہی میدان جنگ میں لشکر کا سپہ سالار ہو سکتا ہے ۔ ایشیا میں دسویں سے اٹھارھویں صدی عیسوی کے درمیان جن خاندانوں نے حکومت کی وہ ترکوں ہی سے تھے ۔ ترکوں کی انتظامی معاملات میں دلچسپی نہ ہونے کے باعث ، ایرانیوں کو یہ معاملات سونپے جاتے تھے ۔ اس طرح ایرانیوں نے بھی اس ناطے ترکوں کے برابر رتبہ حاصل کر لیا تھا۔

962ء میں سامانی بادشاہ کا انتقال ہو گیا تو اس کے بھائی اور چچا بادشاہت کے دعویدار بن گئے ۔ الپتگین (1)، اُس وقت خراسان کا حاکم تھا ۔ ریاستی امرأ نے الپتگین کے پاس قاصد بھیجا اور یہ دریافت کیا کہ ان دونوں دعویداروں میں سے کس کو حکومت کا اہل سمجھا جائے ۔ الپتگین نے جواب میں چچا کا نام دیا ، لیکن اس سے قبل کہ قاصد الپتگین کا جواب لے کر واپس پہنچتا، امرائے سلطنت نے اتفاقِ رائے سے مرحوم بادشاہ کے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا ۔

نئے بادشاہ نے حکومت سنبھالتے ہی الپتگین کو دارالحکومت (بخارا) طلب کیا ۔ الپتگین اس بلاوے سے ڈر گیا ، کیونکہ اُس نے بادشاہ کو حکومت نہ دینے کی رائے دی تھی ۔ اُس نے دارالحکومت آنے کی بجائے علم بغاوت بلند کیا اور غزنی کو فتح کر کے اپنی حکومت قائم کر لی ۔ آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہوا ۔ اس کے بعد اُس کے بیٹے نے حکومت سنبھالی مگر اُس کا بھی جلد ہی انتقال ہو گیا۔

امیر سبکتگین : 977ء میں امیر سبکتگین (2) نے غزنی کی حکومت سنبھالی ۔ اُس نے سلطنت میں امن و سکون قائم کرنے کے لیے عدل اور ہمدردی پر مبنی اصولوں کو اپنایا ۔ اس میں اسے کامیابی ہوئی تو اُس نے وسعتِ سلطنت کی طرف توجہ دی۔ اردگرد کے علاقوں پر قبضے کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کی طرف پیشقدمی کی اور اس طرف چند ایک قلعوں پر قبضہ کر لیا ۔ اُس وقت بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا ، مگر بعد میں تاریخی طور پر اس کی اہمیت بہت زیادہ ثابت ہوئی ۔

آٹھویں صدی عیسوی تک افغانستان سیاسی اور تہذیبی طور پر ہندوستان کا ایک

1- الپتگین : غزنی کی سلطنت کا بانی تھا۔ بچپن میں اُسے ایک غلام کی حیثیت سے ایک سامانی امیر کے ہاتھ بیچ دیا گیا ۔ اس امیر نے اُسے اپنے ذاتی محافظوں میں رکھ لیا ۔ بعد میں الپتگین اپنی قابلیت کی بنیاد پر ترقی کرتا رہا اور اسے خراسان کا حاکم بنا دیا گیا۔ یہیں ، اُس نے سامانی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے غزنی کی ریاست قائم کی ۔

2- سبکتگین ترکی نژاد تھا اور الپتگین کا غلام تھا ۔ اس کو ترکستان سے لایا گیا تھا ۔ الپتگین نے اس کے مزاج اور صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ، اسے اپنے خاص ساتھیوں میں شامل کر لیا ۔ غزنی کو فتح کرنے کی جنگ میں سبکتگین نے اہم کارنامے انجام دیے ۔

حصّہ تھا ۔ یہاں پر ترک آبادی نے بدھ مت قبول کر لیا تھا ۔ غزنی میں علٰحدہ حکومت قائم ہونے کے بعد افغانستان کے دُور دراز علاقوں میں اسلام کا اثر و نفوذ محسوس کیا جانے لگا ۔ ان حالات میں افغانستان کے جنوب میں لمغاں صوبہ میں دو متحارب قوتیں برسرِ پیکار ہوگئیں، جن میں ایک پنجاب کا ہندو راجا جے پال تھا جو سلطنتِ غزنی کے اثرات کو روکنا چاہتا تھا ۔ دوسری قوت خود سلطنتِ غزنی کے حکمران تھے جو اس علاقے میں اپنا اثر بڑھانا چاہتے تھے ۔

سبکتگین کے حملوں کی وجہ سے پنجاب کا حکمران راجا جے پال اپنے آپ کو غیر سلامتی کی فضا میں محسوس کرنے لگا ۔ اُس نے اس غیر یقینی صورتحال کو ختم کرنے کے لیے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ لمغاں کی طرف پیشقدمی کی ۔ (دیکھیں نقشہ) ۔ اس لشکر کی تیاری مقامی راجاؤں نے مل کر کی ۔ سبکتگین نے اپنے بیٹے محمود کو ساتھ لے کر لشکر کا سامنا کیا ۔ سات دِن تک جنگ ہوتی رہی مگر صورتحال واضح نہ ہوئی ۔ "اسی اثنا میں آسمان پر گہرے بادل چھا گئے اور گرج اور چمک شروع ہو گئی ۔ دِن کی روشنی رات کے اندھیرے میں بدل گئی اور سردی اس قدر ہو گئی کہ بہت سے گھوڑے اور جانور اس سے مر گئے ۔" راجا جے پال کی فوج ایسے موسم کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی جبکہ سبکتگین اور اس کی فوج ایسے موسم کی عادی تھی، اس لیے وہ متحرک رہی ۔

جے پال کے پاس اب صرف یہی چارہ تھا کہ وہ ہار مان لے۔ اُس نے دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی بطورِ تاوان دینے کا وعدہ کیا اور ضمانت کے طور پر کچھ آدمی بطورِ یرغمال سبکتگین کے سپرد کر دیے۔

کچھ عرصے کے بعد سبکتگین نے جے پال سے تاوان وصول کرنے کے لیے قاصد روانہ کیا ۔ جے پال نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے نہ صرف قاصدوں کو قید کر دیا بلکہ تاوان ادا کرنے سے بھی انکار کر دیا ۔ مزید برآں سبکتگین پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ قاصدوں کو اس وقت تک رہا نہ کرے گا جب تک تاوان کے لیے بطورِ ضمانت رکھے اشخاص کو وہ آزاد نہ کردے ۔

اب سبکتگین نے جے پال کو سزا دینے کے لیے حملہ کیا۔ اس جنگ میں بھی جے پال کو اس کے حلیف راجاؤں کی مدد حاصل تھی۔ سبکتگین نے انھیں شکست دی اور پشاور اور لمغان کا درمیانی علاقہ فتح کر لیا ۔ یہاں نگرانی کے لیے اپنے اہلکار مقرر کر دیے ۔

سبکتگین کی زندگی کے آخری ایام میں سامانہ کے حکمرانوں کے خلاف خراسان کے حاکم نے بغاوت کر دی ۔ سبکتگین نے سامانہ کے حکمرانوں کی مدد کی اور اس کے بدلے میں انھوں نے اس کے بیٹے محمود کو خراسان کا حاکم مقرر کر دیا ۔ اس طرح ایران کا ایک خوبصورت صوبہ سلطنتِ غزنی کا حصہ بن گیا ۔

امیر سبکتگین کا 997ء میں انتقال ہو گیا ۔

محمود غزنوی — ایک طاقتور بادشاہ

" سلطان محمود کے پیدا ہونے سے ایک گھڑی پہلے اس کے باپ سبکتگین نے خواب میں دیکھا کہ اس کے مکان میں آتشدان کے اندر سے ایک درخت نکلا اور اس قدر بلند ہوا کہ ساری دنیا اس کے سائے میں آگئی ۔ سبکتگین کی جب آنکھ کھلی تو وہ اس خواب کی تعبیر کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے آکر اسے محمود کے پیدا ہونے کی خبر سنائی "۔

(تاریخ فرشتہ)

حقیقت میں بھی ، محمود غزنوی نے اپنی اہلیت اور فہم سے ایسے کارنامے انجام دیے کہ اس کی شہرت کا محور تمام دنیا بنی ۔ آج تک وہ ایک کامیاب فاتح ، ایک مؤثر منتظم اور ایک علم دوست بادشاہ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے ۔ گویا سلطان محمود نے اپنے باپ کے خواب کی تعبیر اپنے عمل و کردار سے کی ...... !

محمود غزنوی یکم نومبر 971 ء کو پیدا ہوا ۔ جب اس کے والد سبکتگین کا انتقال ہوا تو اس کی عمر 27 برس تھی ۔ سبکتگین کی وصیت کے مطابق اس کے ایک دوسرے بیٹے اسماعیل کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ محمود اپنے باپ کی وصیت کو مناسب خیال نہ کرتا تھا ۔ تاہم اُس نے اپنے بھائی کے بارے میں باپ کی وصیت کو عزیز جانا اور کسی قسم کے نزاع سے احتراز کیا ۔ بعد ازاں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ان دونوں بھائیوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی ۔ اس میں محمود غزنوی کی جیت ہوئی اور اسماعیل کو ایک قلعے میں نظربند کر دیا گیا ، جہاں اسے ہر قسم کی سہولتیں دی گئیں ۔

محمود غزنوی 998 ء میں تخت نشین ہوا ۔ اس کی سلطنت میں افغانستان اور خراسان (مشرقی ایران) کے علاقے شامل تھے ۔ چند سالوں میں اس نے سیستان کا علاقہ بھی سلطنت میں شامل کر لیا ۔ اب محمود غزنوی نے سلطان کا لقب اختیار کر لیا ۔

یہ لقب کسی بھی مسلمان حاکم کے لیے پہلی دفعہ استعمال کیا گیا ۔ خلیفۂ بغداد (1) نے رسمی طور پر اسے تسلیم کرلیا ۔ اسے خلعت بھجوائی اور یمین الدولہ (حکومت کا دایاں ہاتھ) اور امینِ ملت (ملت کے امین) کے خطابات سے نوازا ۔

جب سلطان محمود غزنوی اقتدار میں آیا ، اس وقت سامانہ کی حکومت خاصی کمزور ہوچکی تھی ۔ محمود غزنوی کی سلطنت اس کے مقابلے میں بہت مضبوط اور طاقت ور تھی مگر وہ کسی بھی انتہائی اقدام سے گریز کر رہا تھا، مبادا اس پر اپنے مربی کو تباہ کرنے اور فتح کرنے کا الزام آئے ۔ انھی ایام میں محمود غزنوی کو ایسے حالات مل گئے ، جن میں اسے اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع مل گیا ۔ سامانہ کے حکمران نے محمود غزنوی کے علاقے پر قبضہ کرنا چاہا تو محمود غزنوی نے کاشغر کے حاکم ایلک خان کی مدد سے سامانہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا ۔ ان دونوں نے حکومت کو آپس میں بانٹ لیا اور اس سیاسی تعلق کو خاندانی رشتہ داریوں سے مزید مضبوط بنا لیا گیا ۔

1- بغداد کا خلیفہ اس زمانے میں اپنی سیاسی حیثیت اور اقتدار کھو چکا تھا ۔ اب اس کی حیثیت اور سیاسی اثر محض ایک رسمی سرپرست سے زیادہ نہ تھا ۔ اس وقت اسلامی ریاست میں خودمختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں ۔ اکثر حاکم ایک تعلق کے اظہار کے طور پر خلیفہ سے رسمی سرپرستی کی درخواست کرتے تھے اور اس کے جواب میں خلیفہ انھیں القابات اور خلعت دے کر اس رسمی تعلق کی توثیق کرتا تھا ۔

ہندوستان پر حملے

محمود غزنوی اگرچہ سلطنتِ غزنی کے ارد گرد مخالفتوں میں گھرا رہا اور یہاں اُسے بہت سے سیاسی اور فوجی مسائل کا سامنا بھی تھا ۔ انھی مسائل کے تناظر میں اُس نے ہندوستان پر کئی ایک حملے کیے ۔ ان حملوں نے ہندوستان کی تاریخ پر بہت اہم اثرات چھوڑے ۔ محمود غزنوی نے اپنی تیس سالہ مدّتِ حکومت میں ہندوستان پر سترہ حملے کیے ۔ مختصر حال اس طرح ہے ۔

(1) 1000ء میں محمود غزنوی نے درۂ خیبر کے راستے سرحدی علاقوں پر حملہ کیا اور چند ایک قلعے فتح کر کے واپس چلا گیا ۔

(2) پنجاب میں ابھی تک راجا جے پال کی حکومت تھی ۔ یہ راجا محمود غزنوی کے والد سبکتگین سے کئی ایک لڑائیاں لڑ کر ہار چکا تھا ۔ محمود غزنوی کے تخت نشین ہوتے ہی ، اس نے اپنی سرگرمیاں پھر تیز کر دیں ۔ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس حاصل کرنا چاہتا تھا ۔ اسی سلسلے میں سب سے پہلے اُس نے خراج کی ادائیگی بند کر دی ۔ محمود غزنوی نے اُسے سزا دینے کے لیے حملہ کیا ۔ طرفین نے بڑی بہادری سے جنگ میں حِصّہ لیا۔ آخر فتح محمود غزنوی کی ہوئی ۔ جے پال قید ہوا ۔ جے پال نے دو لاکھ پچاس ہزار دینار دے کر رہائی پائی ۔ ایک روایت کے مطابق اُس نے حکومت اپنے بیٹے انند پال کو سونپ دی اور اپنی ناکامیوں پر چتا میں جل کر مر گیا ۔

(3) اگلے دو سال محمود غزنوی سیستان میں مصروفِ جنگ رہا ۔ 1003ء میں دریائے سندھ کی جانب سے اُس نے جہلم دریا کے کنارے بھیرہ پر حملہ کیا ۔ اس طرف سے ہندوستان پر حملہ اُس نے پہلی مرتبہ کیا تھا ۔

بھیرہ کا راجا خود مختار تھا اور اُس نے جے پال یا سبکتگین کے اثر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ راجا قلعے سے باہر آکر لڑا۔ تین دِن لڑائی ہوتی رہی اور محمود غزنوی کی فوجی حالت خاصی بگڑنے لگی ۔ چوتھے دِن محمود غزنوی نے خود کمان سنبھالی اور چاروں طرف سے حملہ کر دیا ۔ بھیرے کا راجا قلعہ بند ہو گیا ۔

ایک رات راجا نے قلعے سے بھاگنے کی کوشش کی مگر محمود غزنوی کے سپاہیوں

نے اُسے دھر لیا اور اُسے مار ڈالا۔ بھیرہ اور اس کے ملحقہ علاقوں کو سلطنتِ غزنوی کا حصہ قرار دے دیا گیا۔

(4) آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تھا۔ دسویں صدی عیسوی میں یہاں پر قرامطیوں (1) نے اپنی حکومت قائم کرلی۔ ملتان کا ایک حاکم خاصا دُور اندیش تھا۔ وہ اکثر سبکتگین کو تحائف وغیرہ بھجوا کر اپنی فرمانبرداری کا یقین دلاتا رہتا تھا۔ اس حاکم کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ وہ اس سیاسی ضرورت او مصلحت کو سمجھنے سے عاری تھا — جب محمود غزنوی نے بھیرہ پر حملہ کیا تو اسے خدشہ ہوا کہ محمود غزنوی کسی وقت بھی ملتان پر حملہ کرسکتا ہے۔ اسی خدشے کے پیش نظر اُس نے بھیرہ کے راجا کی مدد کرنا چاہی۔ محمود غزنوی کو اس کا سخت رنج تھا۔

1005-6ء میں محمود غزنوی نے ملتان کے حاکم کے خلاف جنگ کرنے کے لیے پیش قدمی شروع کی۔ حاکم ملتان نے یہ خبر پاکر جے پال کے بیٹے انند پال سے مدد کی اپیل کی۔ انند پال نے محمود غزنوی کا راستہ روکنا چاہا مگر محمود نے لڑائی سے اجتناب کیا اور ملتان (2) پہنچ گیا۔

ملتان کے حاکم نے کُھلے میدان میں لڑنے سے گریز کیا اور اپنے آپ کو قلعہ بند کر لیا۔ سات دِن کے بعد حاکم ملتان نے قرامطی فرقہ کو ماننے سے توبہ کرلی اور اس نے سالانہ دو ہزار درہم بطورِ خراج دینے کا وعدہ کیا۔

ابھی حاکمِ ملتان سے معاہدہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ محمود غزنوی کو خبر ملی کہ اس کے

1- قرامطیہ فرقے کے لوگ، عرب کے رہنے والے تھے۔ عباسی حکمرانوں کے اندازِ حکومت سے ان کو اتفاق نہ تھا اور اس کے خلاف یہ سخت احتجاج کیا کرتے تھے۔ حکومت نے ان کو سختی سے دبانے کی کوشش کی تو یہ لوگ پناہ کی غرض سے سندھ چلے آئے۔ یہاں عام لوگوں میں ان کے خیالات کافی پسند کیے گئے جس سے آہستہ آہستہ ان کو سیاسی اثر حاصل ہوگیا اور ان کی یہاں حکومت قائم ہو گئی۔

2- ملتان اُس وقت سندھ کا ایک حصہ تھا۔

دارالحکومت پر ایلک خان حملہ کرنے والا ہے ۔ ایلک خاں اور محمود غزنوی کے درمیان 999ء میں سامانہ کی ریاست کو تقسیم کرنے کا معاہدہ ہوا تھا ۔ ایلک خان نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے علاقوں کو وسعت دینے کی کوشش شروع کر دی ۔ جب محمود غزنوی ملتان میں مصروفِ جنگ تھا تو ایلک خاں نے اس کو موقع غنیمت جانا اور خراسان ، بلخ اور ہرات وغیرہ کے علاقے فتح کر لیے ۔

محمود غزنوی بڑی سُرعت کے ساتھ واپس پہنچا۔ غیر متوقع طور پر محمود کی آمد نے ایلک خاں اور اس کی فوج کو ششدر کر دیا ۔ محمود غزنوی کا ایلک خان سے بلخ کے نزدیک معرکہ ہوا ۔ ابتدا میں ایلک خاں کا پلہ بھاری رہا مگر بعد میں محمود کے بھرپور حملے سے ایلک خان کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ بھاگ نکلا ۔

(5) ملتان سے واپسی پر محمود غزنوی نے نواسہ شاہ (سکھ پال) کو بھیرہ کا گورنر مقرر کردیا ۔ یہ انند پال کا بیٹا تھا اور اس نے اسلام قبول کر لیا تھا ۔ اُس نے جب دیکھا کہ محمود غزنوی وسط ایشیا میں ترکوں کے خلاف بُری طرح برسرِ پیکار ہے تو اُس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور دوبارہ ہندو ہوگیا ۔ اُس نے محمود غزنوی کے افسروں کو برخاست کر دیا اور اپنی حکومت کا اعلان کردیا ۔

محمود غزنوی نے ایلک خان سے جنگ کے بعد بھیرہ کا رُخ کیا مگر اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی سرحدی امرأ نے سکھ پال کو پکڑ کر محمود غزنوی کی طرف بھیج دیا ۔ اُس کے جمع شدہ چار لاکھ درہم اُس سے چھین لیے گئے اور اسے عمر قید کی سزا دی گئی ۔ اس کا انتقال قید میں ہی ہوا ۔

(6) بھیرہ کو سیاسی اور جغرافیائی طور پر خاصی اہمیت حاصل تھی ۔ بھیرہ سے جنوب میں ملتان کی طرف مہم جوئی آسان تھی اور اس کے مشرق میں پنجاب کے انندپال سے بآسانی مقابلہ کیا جاسکتا تھا ، ملتان پہلے ہی محمود غزنوی کے زیرِ اثر تھا ، البتہ ہندوستان کے دروازے ، پنجاب پر انند پال کا قبضہ تھا ۔

محمود غزنوی ، انند پال سے ملتان کے مہم کے دوران راستہ روکنے پر ناخوش

تھا ۔ مگر ایلک خان سے جنگ کے دوران اتند پال کے رویے سے حالات میں بہتر پیش رفت ہوئی ۔ اتند پال نے اس جنگ کے دوران محمود غزنوی کو ایک خط لکھا ۔ البیرونی نے اس کے مندرجات اس طرح پیش کیے ہیں ۔

"مجھے علم ہوا ہے کہ ترکوں نے تمھارے خلاف بغاوت کردی ہے اور خراسان میں ان کا اثر پھیل رہا ہے ۔ اگر تم چاہو تو پانچ ہزار گھوڑ سواروں ، دس ہزار پیادہ سپاہیوں اور ایک سو ہاتھیوں کے ساتھ خود چلا آؤں اور اگر تم چاہو تو اس کی تعداد کو دوگنا کر کے اپنے بیٹے کو تمھاری مدد کے لیے بھیج دوں ۔ ایسا کرنے سے مجھے اندازہ نہیں کہ تم کیسے محسوس کروگے ؟ تاہم تم نے مجھ پر قبضہ کر لیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی تم پر قبضہ کرے ۔"

اس مکتوب میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا تھا ، اس کا دونوں اطراف نے خاطر خواہ احترام کیا گیا اور آئندہ تین سال کے لیے امن و امان رہا ۔ تاہم مخفی طور پر اتند پال اور محمود غزنوی دونوں ایک دوسرے سے محتاط تھے اور وہ کسی قسم کے حالات کے مقابلے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے ۔

1007-8 ء میں محمود غزنوی نے اتندپال کے خلاف مہم کا آغاز کیا ۔ اتند پال نے اردگرد کی تمام ریاستوں کے راجاؤں سے مدد کی اپیل کی ۔ یہ تمام راجا اپنی اپنی فوجیں لے کر پنجاب کی طرف بڑھے ۔ پورے ہندوستان میں قوم پرستی کی ایک لہر کا دَور دورہ تھا ۔ ہندو عورتوں نے اپنے زیور بیچ کر رقوم فوج کی تیاری کے لیے روانہ کیں ۔ جن عورتوں کے پاس زیور وغیرہ نہ تھا ، انھوں نے مزدوری پر سوت کاتا اور جو رقم حاصل ہوئی اسے فوجی تیاری کے لیے راجاؤں کو بھیج دیا ۔ ان سب کا خیال تھا کہ ان کی قومی وراثت ، مذہب اور تہذیب سخت خطرے میں ہے اور اس کو بچانا ان کا فرض ہے ۔

مگر یہ تمام تر کارروائیاں اُس عدم اعتماد کے باعث ماند پڑ گئیں جو مختلف راجاؤں کے مابین موجود تھا ۔ عدم اعتمادی کی یہ فضا ان کے درمیان مفادات کے ٹکراؤ کے باعث پیدا ہوئی تھی ۔ ہر راجا ، دوسرے راجا کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا ۔ اس

قسم کے جذبات ان کے سپاہیوں کے درمیان بھی سرایت کر گئے تھے ۔ ان تمام افواج کا سپہ سالار انند پال تھا، جو تجربے اور خوداعتمادی سے عاری تھا ۔

محمود غزنوی کو انند پال کی طاقت کا اندازہ تھا ، اُس نے بچاؤ کے لیے اپنے کیمپ کے دو جانب خندق کھدوائی اور خود پہل کرنے سے گریز کیا۔ چالیس روز تک فوجیں ایک دوسرے کے سامنے پڑی رہیں ۔ آخر محمود غزنوی نے سوچا کہ انند پال کو مزید موقع دینے سے ممکن ہے اسے مزید کمک مل جائے ۔ اُس نے حملہ کر دینے کو ہی مناسب سمجھا ۔

اسی اثنا میں ایک مقامی قبیلے کھکھڑ کے لوگوں نے محمود غزنوی کی فوج پر حملہ کر دیا ۔ ان لوگوں کے سر اور پاؤں ننگے تھے ۔ دونوں جانب سے خندق عبور کر کے ، کھکھڑوں نے محمود غزنوی کی فوج کو سخت نقصان پہنچانا شروع کر دیا ۔ اس حملے میں انند پال کی فوج بھی شامل ہو گئی ۔ محمود غزنوی اس حالت میں سخت پریشان تھا ۔ اس نے آگ لگانے والے تیروں کی بوچھاڑ کرنے کا حکم دیا ۔ ان تیروں کے دھماکے سے انند پال کے ہاتھی بوکھلا گئے اور انھوں نے اپنی ہی فوج کو کچلنا شروع کر دیا ۔ اب جنگ کی کیفیت محمود غزنوی کے حق میں ہو رہی تھی ، انند پال کے سپاہیوں نے بھاگنا شروع کر دیا ۔ محمود غزنوی نے ان کا تعاقب شروع کر دیا اور اس تعاقب کو دو دِن تک جاری رکھا ۔

اس جنگ میں محمود غزنوی کی فتح کی بنیادی وجہ مقامی راجاؤں کی باہمی نااتفاقی تھی ۔ محموو غزنوی کی اس سیاسی ماحول سے کافی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس نے نگرکوٹ (کانگڑہ) کے علاقے پر حملہ کی ٹھانی ۔ یہ بھیم کے قلعہ کے نام سے بھی مشہور تھا ۔ یہ ایربیاس کے کنارے ایک پہاڑی پر واقع تھا ۔ اس قلعے پر بہت بڑا مندر تھا اور پورے قلعے پر عملی طور پر انتظامی کنٹرول مندر کے اہلکاروں اور پجاریوں کا تھا ۔

قلعے پر سات دن کے محاصرے کے بعد پجاریوں نے قلعے کے دروازے کھول دیے اور محمود غزنوی کو چند ساتھیوں کے ساتھ قلعہ دیکھنے کی دعوت دی ۔ مؤرخین کے مطابق مندر میں اس قدر دولت تھی کہ اُس زمانے میں کوئی بادشاہ اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ محمود غزنوی کو یہاں سے سات لاکھ سونے کے دینار ، سات سو من خام
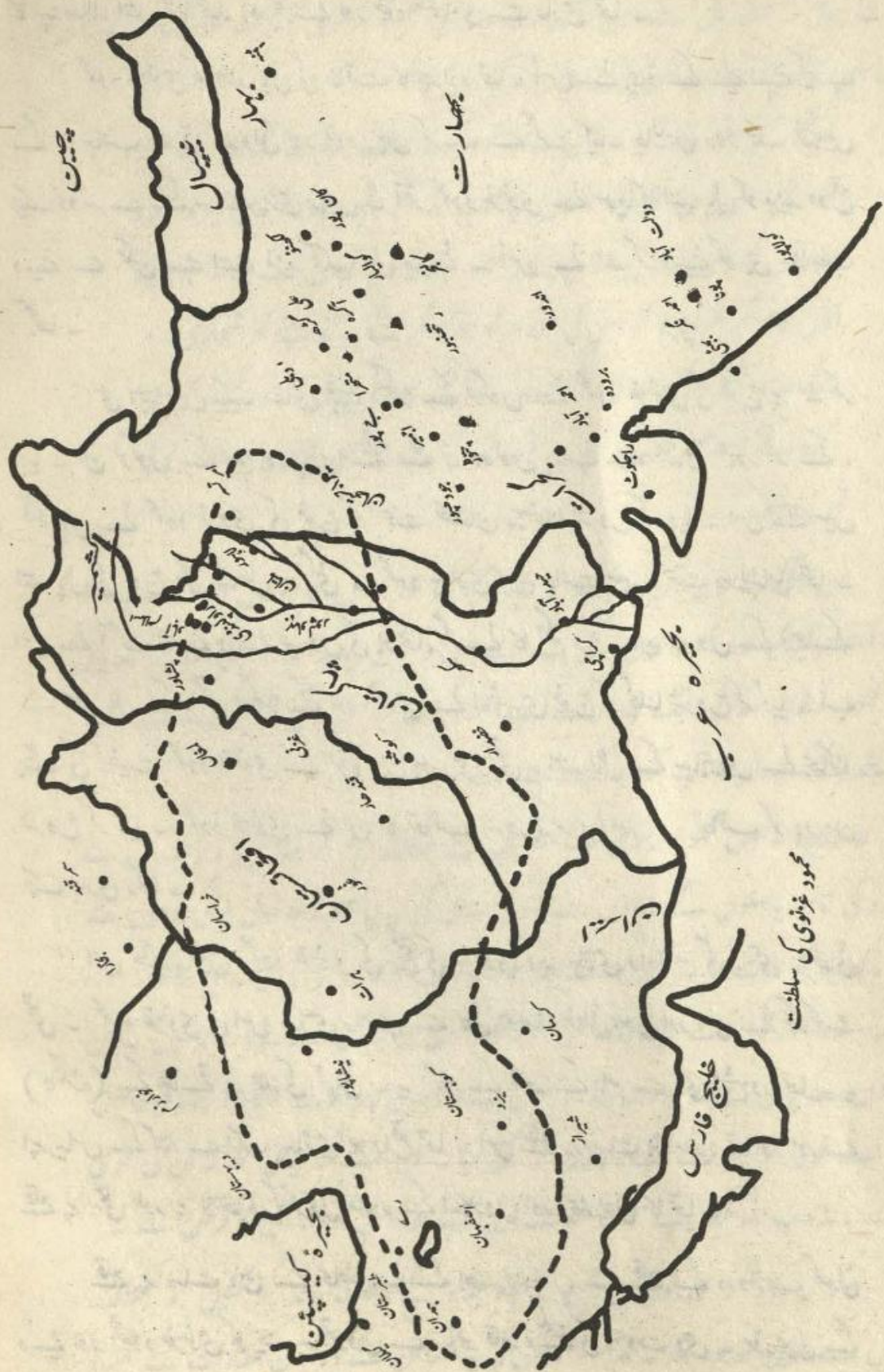
محمود غزنوی کی سلطنت

سونا ، چاندی کے برتن ، دوسو من خالص سونا ، دو ہزار من خام چاندی اور بیس من مختلف جواہر حاصل ہوئے ۔ ہندوستان سے محمود غزنوی کو اتنی مقدار میں خزانہ پہلی مرتبہ ملا ۔

(8) 11 - 1010 ء میں محمود غزنوی نے ملتان کی طرف پیشقدمی کی ۔ شہر پر قبضہ کر کے بہت سے شرپسندوں کو قتل کروا دیا گیا اور کئی کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیے گئے۔ حاکمِ ملتان کو پکڑ کر جیل بھیج دیا گیا ۔

(9) 12 - 1011 ء میں محمود غزنوی نے تھانیسر پر حملہ کیا ۔ یہاں پر ہندوؤں کا ایک بت چکرسوامی تھا جسے ہندوؤں کے تمام فرقے نہایت مُقدّس سمجھتے تھے ۔

ایک معاہدے کے مطابق انند پال نے محمود غزنوی کو اس کے علاقے سے گزرتے وقت ہر قسم کی سہولت فراہم کی اور اس کے بدلے میں محمود غزنوی نے انندپال کے علاقے میں کسی چیز کو نہ چھیڑا۔ ایک روایت کے مطابق انند پال نے محمودغزنوی کو سالانہ خراج اور مال دولت کی پیش کش کر کے تھانیسر پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی ۔ مگر محمود غزنوی نے یہ کہتے ہوئے یہ پیشکش ردّ کر دی:

"میری خواہش ہے کہ میں ہندوستان بھر سے بُت پرستی کی رسم ختم کر دوں ۔"

محمود غزنوی کے مقابلے میں مقامی راجاؤں نے اتحاد کی کوشش کی مگر اس کے مؤثر ہونے سے پہلے ہی محمود غزنوی نے تھانیسر پر قبضہ کر لیا ۔ انند پال بھی موقع سے بھاگ گیا ۔ محمود غزنوی نے بت کو یہاں سے اٹھوا کر غزنی بھجوا دیا اور یہاں شہر کے ایک چوراہے میں اسے نصب کروا دیا گیا ۔ محمود غزنوی کو یہاں سے بہت سی دولت اور خزانہ بھی ملا ۔

(10) اسی اثنا میں انند پال کی موت ہو گئی ۔ اب محمود غزنوی کو نئے حکمران کے ساتھ روابط کو نئے سرے سے استوار کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ نیا حکمران ترلوچن پال ، اپنے پیشرو کے محمود غزنوی کے ساتھ معاہدہ کی پاسداری کرنا چاہتا تھا مگر اس کا انتظامی امور پر عمل دخل بہت کم تھا ۔ اُس کا بیٹا بھیم جیسے عام طور پر 'نڈر' کہا جاتا تھا ، اس معاہدے کے خلاف تھا اور اس کو اُس نے یک طرفہ طور

پر ختم کر دیا ۔

محمود غزنوی ہر قیمت پر لاہور کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ ہندوستان میں داخلے کے راستے پر اس کا اختیار رہے ۔ یاد رہے کہ اتندپال نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں ایک معاہدے کے تحت محمود کو پنجاب سے گزرنے کی اجازت دے دی تھی ۔ اب بدلی صورت حال میں اُس نے حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا ۔ 1013ء میں یہ حملہ کیا گیا ۔ نڈر بھیم نے مرگلہ (1) کے درّے میں اپنے آپ کو بند کر لیا اور لشکر مکمل کر کے محمود غزنوی کو جنگ کی دعوت دی ۔ ایک سخت جنگ کے بعد محمود غزنوی کو فتح حاصل ہوئی ۔

جنگ ہارنے کے بعد بھیم نے بالناتھ (2) کے ٹیلے پر فوج متعین کر دی تاکہ محمود غزنوی کا راستہ روکا جاسکے اور خود کشمیر کی طرف چلا گیا ۔ محمود غزنوی نے اب پنجاب کے الحاق کا فیصلہ کر لیا تھا ۔ اُس نے یہاں کچھ فوج چھوڑ کر نڈر بھیم کا پیچھا کیا مگر اسے کامیابی نہ ہو سکی اور وہ واپس چلا آیا ۔

(11) 16 - 1015ء میں محمود غزنوی نے کشمیر کے درّے کی طرف مہم جوئی کی ۔ اس نے یہاں ایک قلعے کو فتح کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی ۔ مزید کمک کے پہنچنے تک برفباری شروع ہو گئی ، جس میں یہاں ٹھہر کر لڑنا ممکن نہ تھا ۔ محمود غزنوی نے کوئی کامیابی حاصل کیے بغیر واپس جانے کا ارادہ کیا ۔

(12) 1018ء میں محمود غزنوی نے دریائے گنگا کو عبور کر کے پیشقدمی شروع کر دی ۔ اب اس کی فوج پہلے کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور اور تعداد کے اعتبار سے بھی زیادہ تھی ۔ پچھلی مہموں میں محمود غزنوی نے ہندوؤں پر مشتمل ایک علٰحدہ فوجی دستہ قائم کیا تھا ۔ اس کو بھی اس موقع پر فوج میں شامل کر لیا گیا ۔

1- اسلام آباد کے عقب میں پہاڑی سلسلہ ۔

2- یہ جہلم کے قریب ایک علاقہ ہے ۔ اس کو "ٹلہ جوگیاں" بھی کہتے ہیں ۔ روایت ہے کہ یہاں ایک جوگی بالناتھ نامی بیٹھا کرتا تھا ، ہیر وارث شاہ میں ذکر ہے کہ رانجھا اس کا مرید ہوا اور اس نے اسی کے کہنے کے مطابق کانوں میں چھید کروا کر بالیاں پہنیں ۔

اس دستے کی سپہ سالاری کا کام بھی ایک ہندو کے سپرد تھا ۔

ہندوستان کے مقامی راجاؤں کے درمیان بداعتمادی کے باعث ، محمود غزنوی کو کسی قسم کی شدید مخالفت کا اندیشہ نہ تھا ۔ پنجاب پر اس کا قبضہ تھا اور کشمیر کے راجا نے محمود غزنوی کے ساتھ تعاون کا معاہدہ کر لیا تھا ۔

محمود غزنوی نہایت احتیاط اور خاموشی سے اس علاقے کے جنگلات سے گزرتا ہوا متھرا پہنچ گیا۔ ایک مؤرخ نے اس پیشقدمی کو اس طرح لکھا ہے کہ "وہ ان جنگلات سے ایسے گزر گیا جیسے بالوں میں سے کنگھی گزرتی ہے......"

دریائے جمنا کے اُس پار متھرا کا شہر تھا۔ اس شہر کے چاروں طرف فصیل تھی اور دریا کی جانب اس کے دو دروازے کھلتے تھے ۔ اس شہر میں بے شمار مندر تھے ۔ شہر کے وسط میں باقی مندروں کی نسبت ایک بہت بڑا مندر تھا ۔

متھرا کے لوگوں نے شہر کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی ۔ محمود غزنوی نے حکم دیا کہ تمام مندروں کو آگ لگا دی جائے اور انھیں زمین پر گرا دیا جائے ۔ محمود غزنوی نے اس شہر کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح قلمبند کیے "یہاں ایک ہزار عالیشان بلند محل ہیں ، جو پتھروں سے بنے ہیں ۔ مندر اِس قدر ہیں کہ ان کو گننا مشکل ہے ۔ اگر کوئی ان کو بنانا چاہے تو اُسے لاکھوں دینار خرچ کرنا پڑیں گے ۔ اسے اعلیٰ کاریگروں کی ضرورت ہوگی جو دو سو سال تک کام کریں تو یہ مندر مکمل ہو پائیں گے ۔"

اس شہر سے محمود غزنوی کو 98,300 مثقال (1) سونا ، سینکڑوں من چاندی کے بت اور دوسرے جواہر اور مال و اسباب ملا ۔

یہیں سے محمود غزنوی نے قنوج کا رخ کیا ۔ یہاں کا راجا بھاگ گیا۔ محمود نے اس علاقے میں سات قلعے صرف ایک دن میں فتح کیے ۔ یہاں سے محمود غزنوی کو بے حساب دولت ملی ۔

(13) اب تک محمود غزنوی ہندوستان کے دور دراز علاقوں کو تہ و بالا کر چکا تھا ۔

1- ایک مثقال ساڑھے چار ماشے وزن کے برابر ہوتا ہے ۔

پنجاب میں نڈر بھیم کا اثر ابھی تک برقرار تھا ۔ کالنجر کے راجے کا رویہ مخاصمانہ ہو رہا تھا ۔ اُس نے قنوج کے راجا کو محمود غزنوی کے حملے کے وقت بھاگنے کو بزدلی قرار دیا اور اُسے سزا کے طور پر قتل کروا دیا ، اور قنوج پر قبضہ کر لیا ۔ ایسے حالات میں پنجاب کے سیاسی گروہ اور کالنجر کا راجا ایک دوسرے کے قریب آ گئے ۔

محمود غزنوی کے لیے اس قسم کا الحاق خطرناک ہو سکتا تھا ۔ اُس نے ، اس سے پیشتر کہ اُسے کسی غیر متوقع صورتحال کا سامنا ہو ، فوری حملے کا فیصلہ کیا ۔ 20-1019ء میں محمود غزنوی نے حملہ کر دیا ۔ ابتدا ہی میں اس نے پنجاب کے ترلوچن پال کو سخت شکست دے دی ۔

کالنجر کا راجا ایک بڑا لشکر لے کر آگے بڑھا ۔ دونوں حریف ایک دوسرے سے خائف تھے۔ دونوں طرف پریشانی بڑھنے لگی ۔ کالنجر کا راجا تو اس قدر گھبرا گیا کہ ایک رات بوریا بستر سمیٹ کر میدان ہی سے بھاگ گیا ۔ محمود غزنوی نے راجا کی فوج پر حملہ کر دیا اور اُسے کامیابی ہوئی ۔ محمود غزنوی اب فکر مند تھا کہ راجا اگرچہ میدان سے بھاگ گیا ہے مگر اُسے مکمل شکست نہیں ہوئی ۔ وہ کوئی بھی نامناسب حرکت کر سکتا ہے ۔ اس میں قرین قیاس یہی تھا کہ راجا محمود غزنوی کی فوج کے لیے مال و اسباب کی سپلائی لائن کاٹ دے یا اچانک حملہ کر کے اسے نقصان پہنچائے ۔ محمود غزنوی نے غزنی واپس جانے میں ہی خیریت سمجھی ۔

(14) محمود غزنوی کی خواہش تھی کہ پنجاب پر اس کا مستقل قبضہ ہو جائے اور اس طرح ہندوستان کے دوسرے علاقوں تک اس کی رسائی قائم رہے ۔ 1021ء میں اس ارادے سے وہ غزنی سے چلا اور اپنے ساتھ بہت سے معمار ، لوہار اور سنگ تراش بھی لایا ۔

محمود غزنوی نے فتوحات کی ابتدا شمالی علاقہ جات ، سوات اور کافرستان وغیرہ کے علاقوں سے کی ۔ یہاں پر بدھ مت کے ماننے والے لوگ رہتے تھے ۔ یہ بدھ کی ایک شیر کے رُوپ میں پوجا کرتے تھے ۔ محمود غزنوی کے آنے کے بعد ان لوگوں نے

اسلام قبول کر لیا ۔ یہ علاقے فتح کرنے کے بعد اُس نے درہ کشمیر کے راستے سے پنجاب کا رخ کیا ۔ پنجاب پر قبضے کی تکمیل کے بعد یہاں باقاعدہ حکومت کے انتظام کا بندوبست کیا گیا ۔ اُس وقت پنجاب کا راجا ترلوچن پالا مرچکا تھا اور اُس کا بیٹا بھیم نڈر بھی یہاں سے بھاگ چکا تھا ۔ بھیم نڈر کا انتقال 1026ء میں ہوا ۔

(15) 23-1022ء میں محمود غزنوی نے لاہور کے راستے کالنجر کی طرف پیش قدمی کی ۔ راستے میں گوالیار کے راجا نے محمود غزنوی کو تحفے تحائف دے کر صلح کرلی ۔ اس کے بعد محمود غزنوی نے کالنجر کا محاصرہ کرلیا ۔ محاصرہ چند روز جاری رہا ۔ کالنجر کے راجا نے قلعے کا پھاٹک کھول کر تین سو ہاتھی کھلے میدان میں چھوڑ دیے ، تاکہ محمود کے سپاہی ان کو پکڑ لیں ۔ اس کے علاوہ اس نے محمود غزنوی کے لیے تعریفی شعر بھی لکھ کر بھیجے ۔ محمود غزنوی نے راجا کو فرمان بھیج دیا کہ وہ کالنجر کے 15 قلعوں پر متمکن رہے اور اسے امان بھی دے دی گئی۔ اس فرمان کے جواب میں اظہارِ تشکر کے طور پر راجا نے محمود غزنوی کو زروجواہر کی نذر پیش کی ۔ اس کے بعد محمود غزنوی واپس چلا گیا ۔

(16) اب تک محمود غزنوی کی توجہ کا مرکز شمالی ہندوستان رہا تھا۔ جنوبی علاقوں، خاص طور پر گجرات کی طرف اس نے ابھی تک توجہ نہ دی تھی ۔

اکتوبر 1026ء میں محمود غزنوی نے غزنی سے ایک مہم شروع کی ۔ یہ مہم سومنات کو فتح کرنے کے لیے تھی ۔ یہاں ایک قلعے میں بہت بڑے مندر میں ایک دیوتا کا بُت تھا ۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ تمام روحیں ، جسموں سے نکل کر سومنات کے مندر میں آتی ہیں۔ یہاں دیوتا ان روحوں کو انتخاب کے بعد دوسرے جسموں میں جانے کا حکم دیتا ہے ۔ یہ ہندوؤں کا نظریہ 'آواگون' تھا ، یہاں کے برہمنوں اور عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ دیوتا کسی بھی حملہ آور کو اپنی حفاظت کے لیے تباہ و برباد کردے گا ۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے لاکھوں ہندو یہاں جمع ہوتے تھے ۔ دُور دُور سے یہاں نذرانے بھجوائے جاتے تھے ۔ ہندوستان کے مختلف راجاؤں نے اس مندر کے ساتھ دس ہزار دیہات وقف کرر کھے تھے ۔ ایک ہزار برہمن ہر وقت یہاں عبادت میں مصروف رہتے تھے ۔ مندر کے ایک کونے میں سونے کی بڑی زنجیر لٹکی تھی ۔ اس کے

ساتھ گھنٹیاں لگی تھیں جن کو خاص رسم کے لیے بجایا جاتا تھا ۔ پانچ سو گانے اور ناچنے والیاں دیوداسیاں اور دو سو موسیقار مندر کی خدمت پر مامور تھے ۔ یہاں مندر میں خدمت گزاری کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ کئی راجا اپنی لڑکیوں کو مندر کی خدمت کے لیے بھیج دیتے تھے ۔ مندر میں پڑا بت دو میٹر لمبا تھا۔ یہ پتھر سے تراشا گیا تھا ۔

محمود غزنوی کی پیشقدمی کے دوران کئی ایک شہر بغیر کسی جنگ کے فتح ہوئے ۔ اُس کے رعب اور دبدبے سے اُس کی آمد سے پہلے ہی شہر خالی ہو جاتے تھے ۔ آخر کار محمود غزنوی سومنات پہنچ گیا ۔

ہندو قلعہ (۱) سومنات کے اوپر چڑھے ہوئے تھے اور چلا رہے تھے "ہمارے دیوتا نے تمھیں ادھر بلوایا ہے تاکہ وہ تمھیں برباد کردے ۔" محمودغزنوی قلعے پرچڑھنے میں کامیاب ہو گیا ۔ جنگ شروع ہوئی، مگر شام سے پہلے ہی ہندوؤں نے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ اگلے دن محمود غزنوی شہر میں داخل ہوا ۔ مندر کے ارد گرد بے شمار ہندوؤں نے جمع ہونا شروع کر دیا تھا ۔ یہ لوگ اپنے دیوتا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے ۔ قتل عام شروع ہوا اورمندر کے دروازے پر چند ہی ہندو بچ پائے۔

اسی اثنا میں گجرات کے راجاؤں نے مندر کی حفاظت کے لیے پیشقدمی کی ۔ محمود غزنوی نے چند سپاہیوں کو مندر میں چھوڑ کر اس لشکر کا سامنا کیا ۔ دونوں طرف سے جی توڑ کر مقابلہ ہوا ۔ اسی دوران میں ہندوؤں کا ایک اور لشکر آن پہنچا ۔ اب محمود

1- ہندوستانی معاشرے میں مندر کو ایک اہم ادارے کی حیثیت حاصل تھی ۔ بڑے مندروں کو قلعوں میں تعمیر کیا جاتا تھا ۔ یہاں مختلف راجا اپنے زر و جواہر کو محفوظ رکھنے کے لیے بطورِ امانت جمع کرواتے تھے ۔ اسی جگہ اسلحہ خانے ہوتے تھے اور ایک مخصوص تعداد میں فوج رکھی جاتی تھی ۔ چونکہ عام لوگوں کا مندر کے ساتھ ایک جذباتی تعلق ہوتا تھا ، اس لیے مندر کے برھمن آہستہ آہستہ ایک سیاسی اثر کے حامل ہوگئے تھے ۔ مقامی سیاست میں ان کا ایک اہم کردار ہوتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی حملہ آور کے لیے ان مندروں کو ان کے قلعوں سمیت تباہ کرنا ضروری ہوتا تھا تاکہ یہاں راجاؤں کی دولت چھین کر ان کو معاشی طور ختم کیا جاسکے ۔ مندر کے منسلکہ اداروں کو ختم کرنے سے سیاسی اور معاشرتی طور پر مؤثر گروہوں کو توڑنا بھی ممکن ہوتا تھا ۔

غزنوی سخت مشکل میں تھا ۔ اُس نے ہمت سے مقابلہ شروع کیا اور ہندو راجاؤں کی فوجوں کو ہلا کر رکھ دیا ۔ ان کے لشکر میں خوف و ہراس پھیل گیا اور آخر فتح محمود غزنوی کو حاصل ہوئی ۔

محمود غزنوی مندر میں داخل ہوا ۔ اُسے ناقابلِ یقین حد تک یہاں سے زر و جواہر ملے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو یہاں سے ملنے والی دولت کا دسواں حصّہ بھی کسی ہندوستانی بادشاہ کو میسر نہ تھا ۔

(17) جب محمود غزنوی سومنات سے واپس غزنی جارہا تھا توملتان کے نزدیک سندھی جاٹوں نے اُس سے مال و دولت چھیننے کے لیے حملہ کیا ۔ اُس وقت تو محمود غزنوی نے کچھ نہ کہا مگر کچھ عرصے کے بعد ، 1027 ء میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر اپنا آخری حملہ کیا۔ یہ حملہ جاٹوں کو سزا دینے کے لیے تھا ۔ یہ جنگ دریائے سندھ میں کشتیوں پر لڑی گئی اور فتح محمود غزنوی کو ہوئی ۔

سلطان محمود غزنوی کو اپنی عمر کے آخری حصّے میں تپ دق کا مرض ہوگیا اور اسی بیماری سے 1030 ء میں اس کا انتقال ہوا ۔

محمود غزنوی کی کامیابی کے محرکات

محمود غزنوی کو ایک کامیاب جرنیل مانا جاتا ہے ۔ اُس نے اپنی فوجی صلاحیت، فہم وفراست اور بہتر حکمت عملی سے ایک بہت بڑی ریاست قائم کی ۔ یہ ریاست سمرقند ، اصفہان اور لاہور تک پھیلی ہوئی تھی ۔

محمودغزنوی کی مجموعی کامیابی میں درج ذیل محرکات بنیادی حیثیت کے حامل تھے ۔

1- فنونِ جنگ میں مہارت : محمود غزنوی کا تعلق وسط ایشیا سے تھا جہاں زندگی کا ڈھنگ اس طرح کا تھا کہ فنونِ جنگ سیکھنا ، یہاں کے رہنے والوں کی ایک بنیادی ضرورت بن گیا تھا ۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنی وسعت پسندی اور سیاسی اثر کے لیے آپس میں ہر وقت لڑتی رہتی تھیں ۔ اس مستقل حالتِ جنگ کے باعث یہاں فنِ

حرب میں بہت ترقی ہو گئی تھی اور لوگ اسے اپنی شخصیت کو ابھارنے کے لیے بڑے شوق سے سیکھتے تھے ۔

اگرچہ ہندوستان میں بھی مختلف ریاستوں کے درمیان سیاسی چپقلش جاری رہتی تھی، مگر ان کا اندازِ جنگ صدیوں پرانا اور روایتی تھی ۔ وسط ایشیا کے مقابلے میں ان کی جنگی تکنیک اور حکمتِ عملی غیر مؤثر اور کم درجہ تھی ۔ ہندوستانی افواج اکثر غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم ہوتی تھیں ، جبکہ محمود غزنوی کی فوج تنظیم ، اعلیٰ تربیت کا ایک بہترین نمونہ تھی ۔

2- فوج میں یک جہتی : محمود غزنوی کے سپاہی اپنے وطن سے دُور ایک اجنبی ملک میں آکر لڑتے تھے ۔ اگرچہ کسی بھی لڑائی میں زندگی اور موت کا سوال تو ہوتا ہی ہے ، مگر پردیس میں یہ احساس زیادہ شدّت اختیار کر لیتا ہے ۔ یہی احساس فوجیوں کے درمیان باہمی تعلق کو مضبوط تر کرتا ہے ۔

محمود غزنوی کے سپاہیوں میں یہ احساس بہت گہرائی تک موجزن تھا اور اس کی وجہ ایک لمبے عرصے تک اکٹھے مہم جوئی اور لڑائیاں لڑنا تھا ۔ اس سے سپاہیوں میں ایک داخلی تعلق پیدا ہو گیا تھا ۔ ایسے داخلی تعلق کے ساتھ جب وہ لڑتے تو ان کے انداز میں بہت شدت آجاتی تھی ۔

اِس کے برعکس مقامی ہندوستانی فوج میں راجاؤں کی باہمی جنگوں کی وجہ سے عدم اعتماد کی فضا حاوی رہتی تھی ۔ اکثر اوقات یہ سب راجا مل کر اپنی فوجیں محمود غزنوی کے مقابل لاتے مگر داخلی بداعتمادی سے ان کو نقصان پہنچتا ۔ اِس کا اثر عام سپاہیوں میں بھی موجود ہوتا تھا اور وہ اکثر لڑنے سے گریز کرتے تھے ۔

مقامی فوج میں اکثر سپاہی کرائے پر لائے جاتے تھے۔ ان سے معمولی عوضانے کے بدلے میں جان پر کھیل کر لڑنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی ۔ کسی بھی نازک حالت میں یہ ہمیشہ بھاگ جاتے تھے ۔

3- محمود غزنوی کا رعب و دبدبہ : محمود غزنوی کی ابتدائی حملوں میں کامیابی کے بعد ، اس کی فوج کا اس قدر دبدبہ ہو گیا تھا کہ عام سپاہی تو دُور کی بات ہے اچھے خاصے مضبوط راجے بھی اس سے ٹکرانے سے گھبراتے تھے ۔ مثال کے طور پر قنوج اور

کالنجر کے راجاؤں کو پیش کیا جاسکتا ہے ۔ محمود غزنوی کی آمد کی خبر سن کر شہر خالی ہو جاتے تھے جیسا کہ جنوبی ہندوستان میں گجرات کے علاقے میں ہوا ۔

4- بہتر حکمتِ عملی : محمود غزنوی جنگی حکمت عملی میں نہایت مشاق تھا ۔ وہ اپنے حریف کو سنبھلنے کا موقع کم ہی دیتا تھا ۔ اکثر مہمات میں اپنے حریف کی توقع کے برعکس اچانک حملہ کر دیتا تھا ۔ متھرا پر حملہ کرنے سے پہلے محمود غزنوی نے بڑی سُرعت سے جنگلات میں سے پیش قدمی کی اور اس نے راجا کی توقع سے بہت پہلے اس پر حملہ کر دیا ۔

اگر حالات مخدوش ہوتے تو محمود غزنوی خود حفاظتی کا انداز اختیار کرتا مگر مناسب موقع پاتے ہی حملہ کر دیتا ۔

مقامی راجا عموماً قلعے میں محصور ہو کر لڑتے تھے ۔ یہ حکمت عملی حملہ آور کے لیے ہمیشہ سود مند ثابت ہوتی تھی ۔ کیونکہ محصور رہ کر زیادہ عرصے تک مدافعت کرنا وسائل کے لحاظ سے ناممکن تھا ۔ وسائل اور رسد کم ہوتے ہی مقامی راجا بھاگ جاتے تھے یا معمولی سی لڑائی کے بعد ہتھیار ڈال دیتے تھے ۔

5- دانشمندانہ فیصلے : محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملوں اور فتوحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں لڑی جانے والی لڑائیاں دراصل ضعیف الاعتقادی اور باعمل رویّوں کے درمیان تھیں ۔

ہندوستانی غیر ضروری طور پر ہر معاملے کو اپنی ضعیف الاعتقادی پر پرکھتے تھے اور باعمل رویّوں سے گریز کرتے تھے ۔ اس کے برعکس محمود غزنوی ایک حقیقت پسند اور باعمل حکمت عملی کا حامل تھا ۔ وہ ہر معاملے کو موجودہ حالات کی روشنی میں پرکھتا اور عقل و دانش کی بنیاد پر عمل کرتا تھا ۔

سومنات پر حملے کے وقت مقامی لوگوں نے پہلے تو قلعے کی دیواروں پر اپنے اعتقاد کے مطابق یہ چلّانا شروع کر دیا کہ محمود غزنوی کو اُن کے دیوتا نے سزا دینے کے لیے بلوایا ہے اور پھر جب محمود غزنوی قلعے میں داخل ہوگیا تو عملی کارروائی کرنے کی بجائے اپنی تمام تر کوشش مناجات تک محدود کر دی --- اور شکست کھائی ۔

تجزیہ :-

کوئی بھی حکمران اپنے دَور کے مجموعی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اثرات کے تحت ہی اپنی پالیسیاں مرتب کرتا ہے۔ اِن پالیسیوں پر عمل درآمد کا طریقۂ کار بھی اس کے ہم عصر رجحانات پر ہی مبنی ہوتا ہے۔

تاریخی تجزیے میں کسی بھی شخصیت کے کارناموں اور کردار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہم عصر حالات اور تأثرات کو سمجھا جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ گیارھویں عیسوی کی شخصیت کے کارناموں کا تجزیہ، ہم آج کل کے معیار پر کریں۔

سلطان محمود غزنوی کی زندگی کے اہم کارنامے اور اس کا اپنا کردار، اُس دَور کے انداز معاشرت اور اہم سیاسی رجحانات سے وابستہ ہیں۔ اس تناظر میں ان کا تجزیہ کیا جانا مناسب ہے :-

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ گیارھویں صدی کی ابتدا میں وسط ایشیا میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں جنم لے رہی تھیں۔ ان سب ریاستوں کی اہم خواہش یہ ہوتی تھی کہ وہ ایسی حکمتِ عملی پر عمل کریں جس سے ان کا سیاسی اثر مضبوط ہو اور ان کی ریاست کا علاقہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو۔

سلطان محمود غزنوی نے بھی اسی سیاسی ماحول میں اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ سلطان محمود غزنوی سے پہلے سبکتگین نے سامانی ریاست سے علٰحدہ ہو کر سلطنتِ غزنی کی بنیاد ڈالی۔ اس ریاست کو شروع ہی سے اردگرد کے حکمرانوں کی وسعت پسندی سے خطرہ لاحق تھا۔ محمود غزنوی کے سامنے درج ذیل امور پر توجہ دینا اہم اور ضروری تھا۔

1- خارجی طور پر اردگرد کی ریاستوں سے غزنی کی سیاست کو محفوظ رکھنا۔

2- علاقے میں اپنا سیاسی اثر قائم رکھنے کے لیے سلطنت غزنی کو وسعت دینا۔

سبکتگین کو بھی ان امور کا شدّت سے احساس تھا، اور اُس نے افغانستان میں پیش قدمی کر کے اپنے سیاسی اثر کو بڑھانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کا

تصادم پنجاب کے راجا سے ہونا قدرتی امر تھا کیونکہ افغانستان اُس وقت پنجاب کا ہی ایک حصہ تھا۔

یہی تصادم سلطان محمود غزنوی کو ورثے میں ملا اور پنجاب سے جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ سلطان محمود غزنوی کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنیادی طور پر وسطِ ایشیا ہی تھا اور وہ مقامی طور پر سلطنتِ غزنی کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ ہندوستان پر حملہ کرنے کا مقصد یہاں کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا نہ تھا بلکہ ان علاقوں پر حملے کرکے یہاں کے وسائل کو حاصل کرنا تھا، تاکہ ان وسائل کو استعمال کرکے وہ غزنی کی سلطنت کو وسعت دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان پر حملے کرتا اور یہاں سے مال و زر لے کر واپس چلا جاتا۔

ہندوستان میں صرف پنجاب کا علاقہ اُس نے مستقل طور پر ریاستِ غزنی میں شامل کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں حملوں کے وقت اسے آسانی رہے۔ واضح رہے کہ پنجاب اپنے محل وقوع کے اعتبار سے سلطنتِ غزنی اور ہندوستان کے درمیان رابطے کے لیے ایک دروازے کی حیثیت رکھتا تھا۔

مجموعی طور پر محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملوں سے درج ذیل اثرات پیدا ہوئے۔

1- ایک طویل عرصے سے، ہندوستان کے باشندے اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر خیال کرتے تھے۔ اِس کے لیے وہ اپنے ورثے اور روایات پر اتراتے تھے۔ محمود غزنوی کے حملوں نے بیرونی دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان نہ صرف قابلِ تسخیر ہے بلکہ یہاں مقامی طاقت اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ یہاں جب چاہیں حملے کیے جاسکتے ہیں اور فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ محمود غزنوی کے بعد کئی خاندانوں نے ہندوستان پر نہ صرف حملے کیے بلکہ یہاں آکر اپنی حکومتیں بھی قائم کیں۔

2- ہندوستان کی بے شمار دولت غزنی منتقل ہوگئی۔ اس سے مقامی معیشت تباہ ہو کر رہ گئی۔ زراعت اور صنعت کے شعبے خاص طور پر متأثر ہوئے۔ سب سے

بڑھ کر یہ کہ مقامی ریاستوں پر غزنی کو قابل ادا سالانہ خراج اس قدر زیادہ تھا کہ ان کی مجموعی معاشی ترقی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ۔ اس صورتحال سے عام لوگوں کی زندگی بُری طرح متأثر ہوئی ۔

3- لاہور میں غزنوی حکومت کے قیام کے ساتھ بہت سے علماء اور دانشور وسطِ ایشیا سے یہاں آکر بس گئے ۔ ان کے خیالات کی ترویج سے یہاں ایرانی ثقافت اور زبان و ادب متعارف ہوئے ۔ واضح رہے کہ اُس وقت وسطِ ایشیا میں ایرانی اندازِ ثقافت اور تہذیب کو ہی اعلیٰ سمجھا جاتا تھا ۔ اس نئے اندازِ ثقافت کے تعارف سے آئندہ صدیوں میں ہندوستان کی مقامی تہذیب میں نہایت منفرد انداز نمودار ہوئے ۔

اسی زمانے میں البیرونی (1) ہندوستان آیا ۔ اُس نے مقامی علوم اور اندازِ معاشرت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک کتاب لکھی ، جس کا نام کتاب الہند ہے۔ اس کتاب کو آج بھی اُس زمانے کی ہندوستانی معاشرت کو سمجھنے کے لیے ایک بنیادی مأخذ کی حیثیت حاصل ہے ۔

محمود غزنوی کے دَور میں بہت سے صوفیا کرامؒ وسطِ ایشیا سے ہندوستان تشریف لائے اور انھوں نے یہاں مختلف مذاہب کے لوگوں کو انسان دوستی اور محبّت کے نظریات سمجھائے ۔انہی سے متأثر ہو کر بہت سے مقامی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ۔

یاد دہانی کے لیے اہم نکات

1- گیارھویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے جنم لیا ۔ یہ آپس میں برسرِ پیکار رہتی تھیں ۔ اِسی زمانے میں سبکتگین نے سلطنت

1- البیرونی، ابوریحان ، 973ء میں خوارزم (وسطِ ایشیا) کے ایک گاؤں 'بیرون' میں پیدا ہوا، اسی گاؤں کی مناسبت سے وہ البیرونی مشہور ہوا۔ البیرونی عربی ، فارسی ، ترکی اور سنسکرت زبانوں کا عالم تھا۔ اِس کے علاوہ ریاضی اور جغرافیہ کے علوم میں پورے عالم میں اس کو ایک مقام حاصل تھا۔ البیرونی کی وفات پچھتر برس کی عمر میں ہوئی۔ اس نے اپنی زندگی میں ایک سو چودہ قابلِ قدر کتب تصنیف کیں۔

سامانہ سے علٰحدہ ہو کر سلطنتِ غزنی قائم کی۔

2- سبکتگین نے سلطنت کو وُسعت دینے کے لیے افغانستان کے علاقوں پر حملے کیے جس سے پنجاب کے راجا اور اُس کے درمیان چپقلش شروع ہو گئی۔ یہی حالات محمود غزنوی کو ورثے میں ملے۔

3- سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر حملے کرنے کا مقصد یہاں کے علاقوں کو غزنی کی ریاست میں شامل کرنا نہ تھا، بلکہ دولت حاصل کر کے سلطنتِ غزنی کو مضبوط بنانا تھا۔ پنجاب پر قبضے کا مقصد ہندوستان پر حملے کے لیے اہم راستے پر قبضہ کرنا تھا۔

4- سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوستان کے مقامی لوگوں کا یہ نظریہ ختم ہو گیا کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہیں۔ بلکہ خارجی دنیا کے لیے ہندوستان کی راہیں کھل گئیں۔

5- سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے دوران غزنی سے لاہور آنے والے علماء اور اہلِ قلم نے یہاں ایک علمی مرکز قائم کیا۔ اس سے ایرانی زبان و ادب اور ثقافت ہندوستان میں متعارف ہوئی۔

واقعاتی تسلسل

1- مسلمانوں کا کابل فتح کرنا ——— 870ء

2- غزنی سلطنت کی بنیاد ——— 870ء

3- سبکتگین کی حکومت ——— 977ء سے 997ء

4- سبکتگین کا پشاور اور لمغاں پر قبضہ ——— 986ء — 987ء

5- سبکتگین کا انتقال اور محمود غزنوی کا تخت سنبھالنا ——— 998ء

6- محمود غزنوی کا لاہور کو سلطنتِ غزنی میں شامل کرنا ——— 1021ء

7- سومنات پر حملہ ——— 1026ء

8- محمود غزنوی کا انتقال ——— 1030ء

غور و فکر کے لیے سوالات

الف 1- جن حالات میں سلطنتِ غزنی قائم کی گئی ، ان کا جائزہ لیں ۔

2- گیارھویں صدی تک دنیا میں یہ تأثر تھا کہ ہندوستان ناقابلِ تسخیر ہے ۔ محمود غزنوی نے یہ تأثر ختم کرنے کے لیے اہم کردار ادا کیا ۔ بحث کریں ۔

3- محمود غزنوی کے حملوں کے دوران ہونے والی جنگیں دراصل باعمل حقیقت پسندی اور ضعیف الاعتقادی کے درمیان تھیں۔ محمود غزنوی کے حملوں اور اس کی کامیابی کے تناظر میں تجزیہ کریں ۔

4- محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملوں کے مقاصد کیا تھے؟ تجزیہ کریں ۔

5- نقشے میں درج ذیل مقامات کی نشاندہی کریں ۔
لمغاں ، بلخ ، کاشغر ، کانگڑہ ، بھیرہ ، کالنجر ۔

ب ۔ مختصر جواب دیں ۔

(i) ترک کون تھے ؟

(ii) سبکتگین نے افغانستان پر کیوں حملے کیے ؟

(iii) سبکتگین کے حملوں کی وجہ سے پنجاب کا حکمران اپنے آپ کو کیوں غیر محفوظ سمجھنے لگا ؟

(iv) سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر کیوں حملے کیے ؟

(v) قرامطیہ کون تھے ؟

(vi) سلطان محمود غزنوی پنجاب پر کیوں اپنا قبضہ رکھنا چاہتا تھا ؟

(vii) ہندوستان میں ، سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے وقت مندروں کو کیا مقام اور حیثیت حاصل تھی ؟

(viii) ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کی کامیابی کی صرف چار وجوہات بیان کریں۔

(ix) سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوستان کی معیشت پر کیا اثرات مرتب ہوئے ؟

(x) سلطان محمود غزنوی کے حملوں کی وجہ سے لاہور میں ثقافتی اور ادبی طور پر کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں ؟

(ج) "ہاں" یا "نہیں" میں جواب دیں :۔

I- یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی شخص پر اس کے اردگرد کے ماحول کا کوئی اثر ہو ۔

II- مسلم سلطنت کے تیسرے دَور (900ء - 1000ء) میں چھوٹے چھوٹے خاندانوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں ۔

III- الپتگین نے ہندوستان پر حملوں کی ابتدا کی ۔

IV- سبکتگین ، الپتگین کا بیٹا تھا ۔

V- سلطان محمود غزنوی کے دَورِ حکومت میں راجا جے پال نے غزنی پر کئی حملے کیے ۔

VI- سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں خلیفۂ بغداد اپنی سیاسی طاقت کھوچکا تھا ۔

VII- سلطان محمود غزنوی کے رعب اور دبدبے کے باعث اس کی آمد سے قبل ہی کئی شہر خالی ہو جاتے تھے ۔

VIII- سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں بہت سے علماء اور صوفیاء کرامؒ ہندوستان تشریف لائے ۔

IX- سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوستان کی معیشت کو سخت نقصان پہنچا ۔

د - نیچے ایک بیان کے ساتھ چند وجوہات دی گئی ہیں ۔ یہ وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں ، تاہم ان میں کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے ۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور سب سے بہتر پر ✓ کا نشان لگائیں :۔

1- ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کی کامیابی کا سب سے اہم

سبب :

(ا) سلطان محمود غزنوی کی اعلیٰ فوجی حکمتِ علی تھی ۔

(ب) سلطان محمود غزنوی کی فوج میں داخلی یک جہتی تھی ۔

(ج) ہندوستان میں حکمرانوں کا باہمی نفاق تھا ۔

(د) سلطان محمود غزنوی کا رعب و دبدبہ تھا ۔

II- ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کی اصل وجہ :-

(ا) ہندوستان سے مال اسباب اکٹھا کر کے ، اس سے وسطِ ایشیا میں اپنے اقتدار کو مضبوط بنانا تھا ۔

(ب) ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرنا تھا ۔

(ج) ہندوستان میں ایرانی زبان و ادب اور ثقافت کو متعارف کروانا تھا ۔

(د) ہندوستان کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کروانا تھا ۔

کتابیات برائے مزید مطالعہ

اِس سبق کی تصنیف میں درج ذیل کتب سے مدد لی گئی ۔ طلبہ و طالبات مزید معلومات کے لیے ان کا مطالعہ کریں ۔

1- آبِ کوثر مصنفہ ایس ۔ ایم ۔ اکرم

مطبوعہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور 1986ء

2 – The Life and times of Sultan Mahmud of Ghazna

by Muhammad Nazim

Published by Khalid & Co. Lahore 1973

3- تاریخِ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ

(جلد اوّل) مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور 1962ء

3

ہندوستان میں مُسلم حکومت کا قیام

ہندوستان کے مقامی حالات

معروضی (1) طور پر دیکھا جائے تو محمود غزنوی کے کامیاب حملوں کے بعد دنیا میں یہ تأثر پیدا ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے داخلی حالات نہایت افراتفری کا شکار ہیں اور یہاں قوتِ مزاحمت نہ ہونے کے برابر ہے۔

محمود غزنوی کے آخری حملے اور محمد غوری کے حملوں کی ابتدا کا درمیانی عرصہ تقریباً 148 سال بنتا ہے ۔ اس عرصے میں مقامی حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی ،

1- معروضی طریقہ (OJECTIVE METHOD) کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی کیفیت یا واقعے کو کسی قسم کی خواہش یا تعصب کے بغیر جانچا جائے۔ اس طریقے کے مطابق کسی حالت یا واقعے کو اس کے اسباب و محرکات اور اثرات کو پیش نظر رکھ کر سمجھا جاتا ہے اور اسی کی بنیاد پر نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس پورے عمل میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ تاریخی حالات اور واقعے کی اصل شکل بگڑنے نہ پائے۔

عام طور پر تاریخ کے مطالعہ میں کسی شخصیت سے خاص تعلق یا غیر پسندیدگی کی وجہ سے مطالعہ سے پہلے ہی ایک معیار بنا لیا جاتا ہے۔ اس طرح تاریخ کا مطالعہ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی بنیاد پر ادھورا رہ جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ طریقہ واقعات کے تجزیے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ حد درجہ ناقص اور غیر مناسب ہے، کیونکہ اس سے اصل حقیقت حال واضح نہیں ہوتی اور اس سے اخذ شدہ نتائج بھی درست نہیں ہوتے۔ معروضی طریقہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ تاریخ کو نہایت ذمے داری سے ایک منصف کی طرح پڑھا جائے۔ تمام حالات اور شہادتیں جانچنے کے بعد فیصلہ دینا ہی ایک اچھے منصف کی خصوصیت ہے۔

سوائے اس کے کہ یہاں پر مختلف راجا بدل گئے اور ان کی ریاستوں کی حدود تبدیل ہو گئیں ۔ ریاستوں کے مابین طاقت کے حصول کے لیے رسہ کشی بدستور جاری رہی ۔

اُس زمانے میں جاگیرداری نظام (1) اپنی تمام تر برائیوں کے ساتھ موجود تھا ۔ چونکہ یہ نظام عام لوگوں کے لیے غیر مناسب اور ناپسندیدہ تھا ، اس لیے یہاں بسنے والے مختلف درجوں کے لوگوں میں تلخی اور نفرت کی فضا موجود تھی ۔ جاگیروں میں عام لوگ مسلسل ظلم اور زیادتیوں سے سخت نالاں تھے ۔ وہ کسی بھی بہتر تبدیلی کے خواہاں تھے ۔

دوسری طرف اس ظلم و زیادتی میں یہاں مذہبی بنیادوں پر ذات پات کی تقسیم بھی برابر کا کردار ادا کر رہی تھی ۔ بلکہ جاگیرداری نظام کے لیے ہر طرح کی مدد مذہبی رہنما (پنڈت) اور کھشتری فراہم کر رہے تھے ۔ ویش اور شودر ذاتوں کے لوگوں کو جاگیرداری اور مذہب کی دو دھاری تلوار سے ذبح کیا جارہا تھا ۔

عورتوں کو انسانی درجے سے کم تر سمجھا جاتا تھا ۔ ان کی حیثیت کو انسان کے بجائے "چیزوں" کی سطح پر پیش کیا جاتا تھا ۔ مطلب یہ کہ عورت کو مرد کی ادنیٰ غلام اور خدمت گزار کی حیثیت حاصل تھی ۔ خاوند کے مرنے کے بعد اس کا مرنا ضروری سمجھا

1- جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) ایسا نظام ہے، جس میں کسی بھی علاقے میں ایک شخص کو مکمل اختیار حاصل ہو۔ اس علاقے میں زمین کا مالک تو وہ ہوتا ہی ہے، یہاں بسنے والے تمام افراد اُس فردِ واحد کی مرضی کے بغیر کوئی کام اور حرکت نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ یہاں ایسے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ لوگ اُس شخص کی مرضی کے بغیر کوئی سوچ بھی نہ رکھ سکیں۔ جو شخص اس علاقے کا مالک ہوتا ہے اسے جاگیردار (FEUDAL) اور وہ جو نظام استوار کرتا ہے، اسے جاگیرداری نظام (FEUDALISM) کہتے ہیں۔

انسانی تاریخ میں ہزاروں سال پہلے جب لوگوں نے کاشت کاری کرنا سیکھی تو ان میں یہ شعور پیدا ہوا کہ اپنی ضرورت کے لیے کچھ زمین پر ان کا قبضہ ہونا چاہیے۔ یہیں سے ملکیت کا تصور پیدا ہوا۔ کچھ لوگوں نے ضرورت کے مطابق زمین پر اکتفا نہ کیا اور ایک حرص اور لالچ کے تحت زیادہ سے زیادہ زمین کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کی۔ یہی مقام ہے جہاں سے جاگیرداری نظام کی ابتدا ہوئی۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

جاتا تھا اور اسے خاوند کی چتا کے ساتھ ہی زندہ جلا دیا جاتا تھا ۔

مذہبی طور پر ہندومت پر برہمنوں کی اجارہ داری تھی ۔ انھیں کو مذہبی کتب پڑھنے اور سمجھنے کا اہل سمجھا جاتا تھا ۔ عام لوگوں میں مذہبی تعلیم کی ترویج برہمنوں کی معرفت ہی ہوتی تھی ۔ برہمن اپنے مذہبی مقام کو سیاسی اثر کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس سے ان کی حیثیت اور کردار کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور عام لوگوں میں ان کا اثر کم ہونے لگا تھا۔ دوسری طرف چونکہ عام لوگ مذہب کو براہ راست سیکھ نہ سکتے تھے اس لیے ان کا مذہب سے لگاؤ بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں لوگوں کا دوسرے مذاہب کی طرف میلان بڑھنے لگا ۔

معاشی طور پر ہندوستان ایک خوشحال ملک تھا ۔ یہاں زرعی اور صنعتی میدان میں بہت ترقی ہو رہی تھی بلکہ یہاں کی صنعتی اشیاء مغربی اور جنوبی ایشیا کے ممالک کو برآمد بھی کی جاتی تھیں ۔ زرعی پیداوار میں ہندوستان خود کفیل تھا ۔

بادشاہت کے دَور میں جاگیرداری نظام کو بہت اہم مقام حاصل تھا۔ جاگیردار، بادشاہ کے لیے مالی، فوجی اور سیاسی امداد مہیا کرتا تھا۔ یہ سب ضرورتیں جاگیردار اپنے علاقے کے وسائل سے پوری کرتا تھا۔ جاگیر کے باشندے جاگیردار کے ادنیٰ کارکن اور غلام تصوّر کیے جاتے تھے اور ان کی حیثیت محض کام کرنے والوں سے زیادہ نہ تھی۔ "کام کرنے" کے معیار کے مطابق ان سب کو جانوروں کے برابر سمجھا جاتا تھا اور ان سے جانوروں جیسا سلوک ہی کیا جاتا تھا۔ ان سب کو 'کمین' سمجھا جاتا تھا۔ یہ تصوّر آج بھی مختلف علاقوں میں موجود ہے۔ ان کو صرف اتنی سہولت دی جاتی تھی کہ یہ صرف زندہ رہ سکیں اور جاگیردار کا کام چلتا رہے۔

جاگیردار، ہندوستان کی سیاسی تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ان کے لیے وہی بادشاہ بہتر ہوتا تھا جو ان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دیتا تھا۔ جب کبھی سیاسی حالات مخدوش ہوتے یا کوئی بادشاہ ان کی مرضی کے مطابق نہ چلتا تو یہ اپنی وفاداریاں بدل کر حکومت میں تبدیلی لانے کی کوشش شروع کر دیتے تھے۔

جاگیرداری نظام اپنی تمام برائیوں کے ساتھ بادشاہوں کے بعد انگریزوں کی حکومت میں بھی جاری رہا۔ انگریزوں نے ان کی مدد سے بہت سی کامیابیاں حاصل کیں۔ اب جیسے جیسے صنعتی نظام پھیل رہا ہے، جاگیرداری کے اثر سے لوگوں نے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے شہروں میں نقل مکانی شروع کر دی ہے تاکہ وہ آزاد رہ کر اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

روپیہ رکھنے کا اختیار صرف راجاؤں ، امرا ، جاگیرداروں ، بڑے تاجروں اور مذہبی رہنماؤں کو حاصل تھا ۔ اعلیٰ ہنرمندوں اور کارکنوں سے محض یومیہ مزدوری پر کام لیا جاتا تھا ۔ یومیہ مزدوری حد درجہ قلیل ہوتی تھی ۔ محدود فوجی اور ذاتی اخراجات کے بعد بچی رقم کو راجا محلوں اور مندروں میں جمع کروا دیتے تھے ۔ یہ رقم بیرونی حملہ آوروں کے لیے کشش پیدا کرتی تھی ۔

مجموعی طور پر اُس وقت ہندوستان کا معاشرہ ایک زوال پذیر معاشرہ تھا ۔ یہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اس میں کسی بھی خارجی حملے کی مدافعت کی اہلیت نہ تھی ۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ایسے معاشرے کسی طاقتور قوم کے زیر تسلّط آجاتے ہیں ۔ یہی حال ہندوستانی معاشرے کا ہوا ، اور یہاں ایک طویل مدّت تک غیر ملکی حکمرانوں نے حکومت کی ۔

4

ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام کی طرف پہلا قدم

شہاب الدین محمد غوری

"جب یہ عظیم الشان لشکر پشاور کے قریب پہنچا تو ایک بوڑھے امیر نے ، جسے بادشاہ کی خدمت میں اثر و رسوخ حاصل تھا ، درخواست کی ، "اب تک آپ کے جانثاروں کو یہ علم نہیں ہو سکا کہ جہاں پناہ کا ارادہ کیا ہے اور کس دشمن کی تباہی و بربادی کے لیے اتنا بڑا لشکر ساتھ لے کر سفر کی زحمت گوارا کی جا رہی ہے" ۔ شہاب الدین نے جواب دیا ۔ "کیا تجھے معلوم نہیں کہ جس دن سے میں نے ہندوؤں سے شکست کھائی ہے اُس دن سے میں نے اپنے گھر والوں کا منہ نہیں دیکھا اور نہ ہی لباس تبدیل کیا ہے ، یہ سارا سال میں نے انتہائی رنج و غم میں بسر کیا ہے ، جن امرأ نے نمک حرامی کی ہے ، میں نے ان سے سلام دعا تک ترک کر دی ہے ، —— اب خدا کے بھروسے پر ہندوستان پر حملہ کرنے جا رہا ہوں ۔"

(تاریخ فرشتہ)

شہاب الدین غوری ایک عزم کے ساتھ ہندوستان آیا اور اُس نے فتح پائی ۔ اس فتح سے اُس نے ایسے حالات پیدا کر دیے جن سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں نے فائدہ اُٹھایا اور یہاں ایک مضبوط حکومت قائم کی ۔

تاریخی پس منظر

سلطان محمود غزنوی کے آخری حملے کے قریباً ڈیڑھ سو سال بعد ایشیا سے ہندوستان پر حملوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ۔ ان حملوں کی نوعیت محمود غزنوی کے حملوں سے مختلف تھی ۔ محمود غزنوی کے حملوں کا مقصد ہندوستان کے علاقوں کو نہ تو فتح کرنا تھا اور نہ ہی انہیں اپنی ریاست میں شامل کرنا تھا ۔ وہ وسط ایشیا مین اپنی سیاسی اور فوجی ضروریات کے لیے یہاں سے مال اسباب اور دولت حاصل کرکے واپس چلا جاتا تھا ۔ اس طرح محمود غزنوی نے اہلیت کے باوجود یہاں حکومت قائم کرنے سے گریز کیا ۔

سلطان محمود غزنوی کے برعکس محمد غوری کے حملوں کی نوعیت اور مقصد ہندوستان میں مسلم حکومت کا قیام تھا ۔ اِن حملوں کے محرکات کو سمجھنے کے لیے سیاسی حالات کا مطالعہ ضروری ہے ۔ اس کا مختصر جائزہ یہ ہے :-

سلطان محمود غزنوی کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت نشینی کے لیے جنگیں ہوتی رہیں ۔ بعد ازاں بڑی تیزی سے کئی بادشاہ تبدیل ہوئے مگر سلطنت کو استحکام نصیب نہ ہو سکا اور 1151 ء میں سلطنت غزنی کا خاتمہ ہوگیا ۔

سلطنتِ غزنی کے لیے سب سے بڑا اور اہم چیلنج غوریوں کی طرف سے تھا ۔ غور(۱) ، غزنی اور ہرات (افغانستان) کے درمیان ، 3334 میٹر بلندی پر واقع ایک جگہ ہے ۔ گیارھویں صدی کی ابتدا تک یہ علاقہ آزاد تھا مگر 1009 ء میں محمود غزنوی نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ یہاں کے رہنے والوں پر خراج مقرر کر دیا گیا ۔ جب غزنی کی حکومت کمزور ہونے لگی تو غوریوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ یہ زمانہ بارھویں صدی کی ابتدا کا تھا ۔ اس طرح غزنویوں اور غوریوں کے درمیان اقتدار کے حصول کے لیے

1- غور میں بسنے والے مشرقی ایران سے تعلق رکھتے تھے ۔ یہ نسلاً ترک تھے ۔ اس علاقے میں لوگوں کا عام پیشہ کاشت کاری تھا مگر ان کی وجۂ شہرت یہاں کے خوبصورت گھوڑے اور لوہا تھا ۔ چونکہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ دونوں نہایت ضروری سمجھے جاتے تھے ، اس لیے غوری ان کی تجارت میں بہت مشہور ہوئے ۔

چپقلش شروع ہو گئی ۔ اس چپقلش کا نقطۂ عروج علاؤالدین حسین غوری کا غزنی کو تباہ و برباد کرنا تھا ۔ اسی مناسبت سے اسے علاؤالدین 'جہاں سوز' یعنی دنیا کو جلانے والا بھی کہتے ہیں ۔

1173-74 ء میں شہاب الدین غوری نے غزنی کو فتح کیا ۔ شہاب الدین غوری کا ایک اور بھائی غیاث الدین غوری بھی تھا ۔ غیاث الدین غوزی نے ایران میں اپنی سلطنت کو بڑھانے کی کوششیں شروع کر دیں اور شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام کے لیے حملے شروع کر دیے ۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے تاہم یہ دونوں آزاد حکمران تھے ۔

شہاب الدین محمد غوری کے حملے

محمد غوری نے اپنے حملوں کی ابتدا ملتان سے کی ۔ یہ حملہ 1175 ء میں کیا گیا ۔ جنوبی ہندوستان میں ملتان ، اُچ اور دیبل کے علاقے فتح کیے ۔

1181 ء میں محمد غوری نے لاہور کا محاصرہ کیا ۔ پنجاب کے آخری غزنوی بادشاہ خسرو ملک نے اپنے بیٹے کو بطور یرغمال دینے کی شرط پر صلح کر لی ۔ محمد غوری نے 1184 ء میں سیالکوٹ فتح کیا اور 1186 ء میں اس نے لاہور پر دوبارہ حملہ کیا۔ خسرو ملک کو گرفتار کر لیا گیا اور لاہور پر مکمل قبضے کے بعد غزنوی حکومت کا خاتمہ بھی مکمل ہو گیا ۔ اب محمد غوری پنجاب اور سندھ کا حکمران بن گیا۔

اِس کے بعد محمد غوری نے شمالی ہند کی طرف پیشقدمی کی ، تاکہ راجپوتوں کی طاقت کو ختم کیا جا سکے۔ اس وقت پرتھوی راج راجپوت ریاستوں کا مسلّمہ رہنما تھا ۔ راجپوتوں نے مل کر ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا ، جسمیں دو لاکھ سوار اور تین ہزار جنگی ہاتھی شامل تھے ۔

محمد غوری اور پرتھوی راج کے درمیان ترائن (دہلی سے قریباً 120 کلو میٹر دُور) کے مقام پر پہلی لڑائی ہوئی ۔ یہ لڑائی 1190-91 ء میں ہوئی ۔ اس جنگ میں محمد غوری کو شکست ہوئی اور وہ شدید زخمی ہو گیا ۔ وہ اسی حالت میں لاہور پہنچا اور پھر غزنی چلا گیا ۔
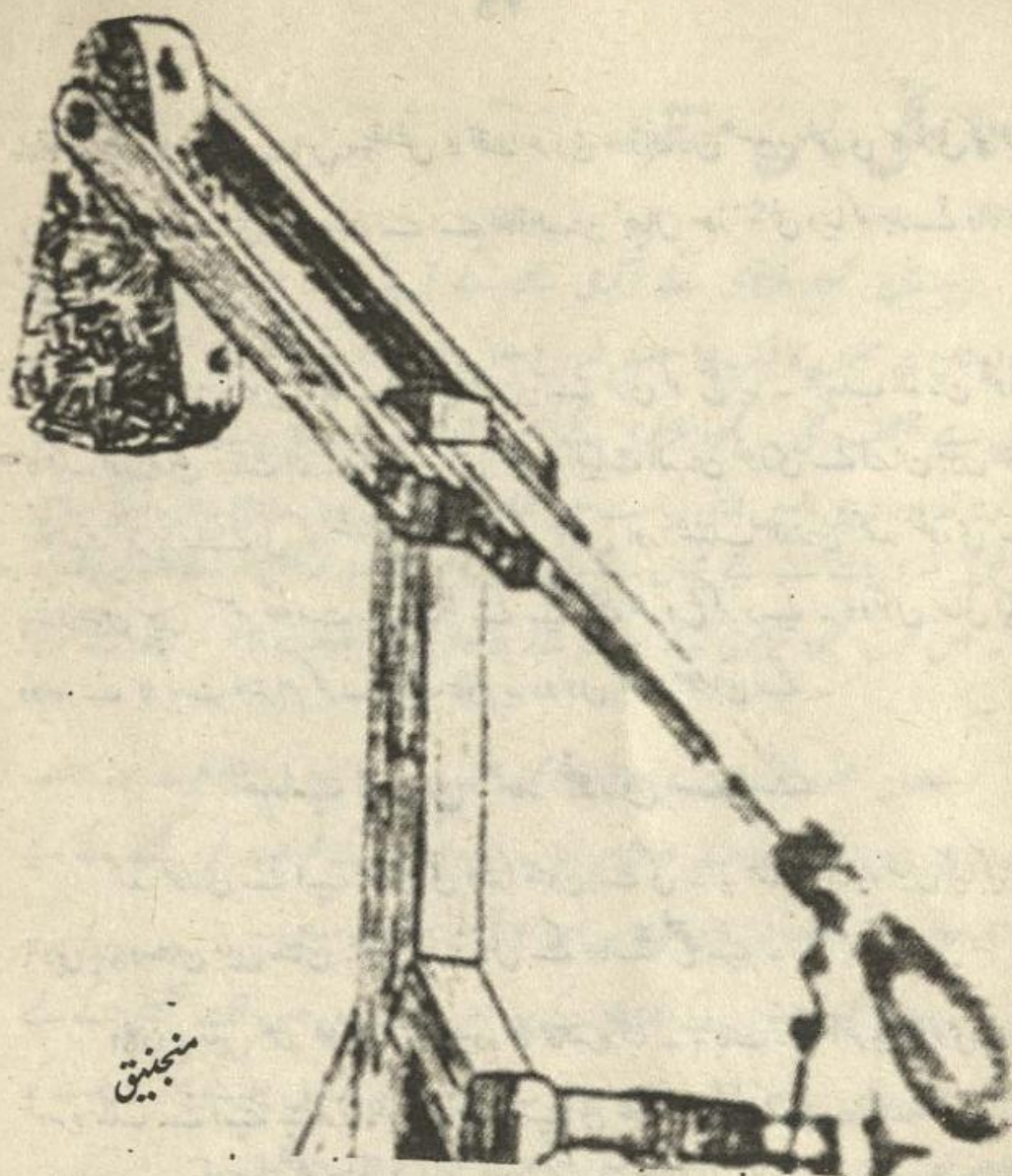
منجنیق
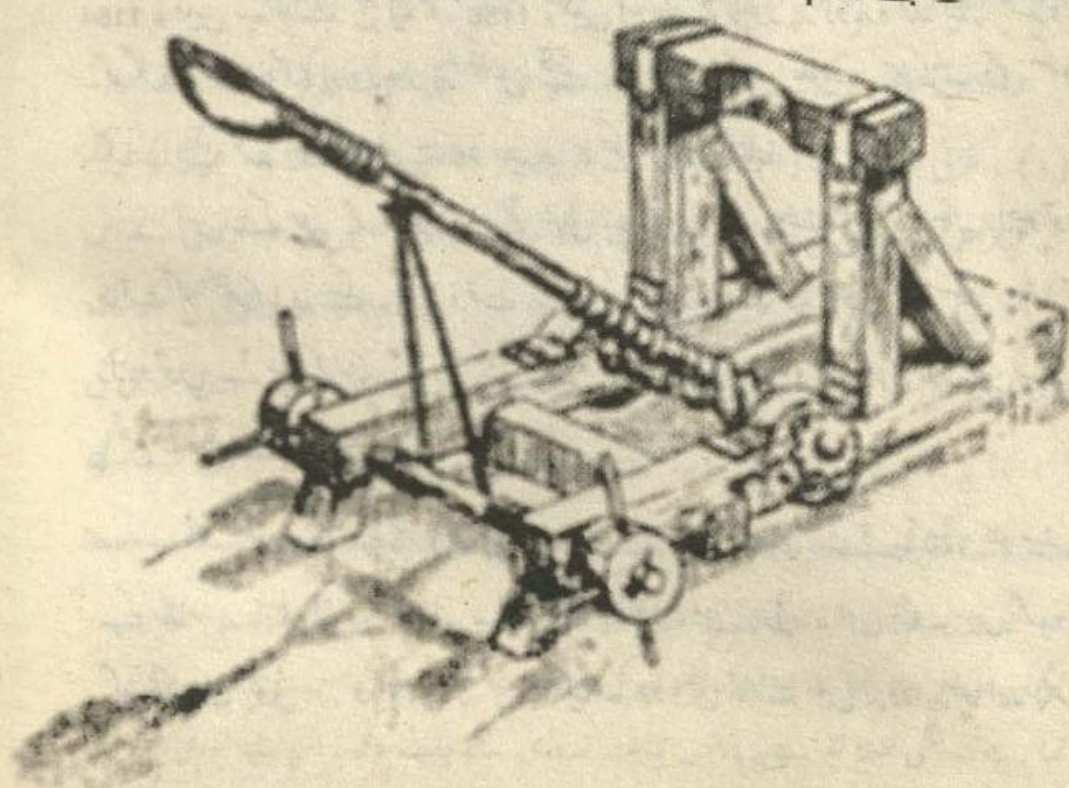
اس جنگ میں محمد غوری کو شکست دینے کا مطلب اس کی ہندوستانی میں فتوحات کو روکنا تھا ۔ دوسری طرف محمد غوری کے لیے یہ شکست ، اسکی ابھرتی ہوئی سیاسی طاقت کے لیے غیر موزوں بھی تھی ۔ محمد غوری نے سال بھر بڑی محنت سے لشکر کی تیاری کی ۔ اُس نے بدلہ لینے کی دُھن میں پورا سال لباس تبدیل نہ کیا اور جن امرأ نے اس کے ساتھ بد دیانتی کی تھی ، ان سے سلام دعا تک ترک کر دی ۔

1192 ء میں محمد غوری ایک لاکھ سے زائد فوج لے کر غزنی سے چلا۔ مقامی راجاؤں نے بھی خوب محنت کر کے ایک فوج تیار کی۔ دونوں کا مقابلہ پھر ترائن کے مقام پر ہوا۔ محمد غوری نے جنگ کی حکمت عملی بڑی احتیاط سے تیار کی ۔ اُس نے احتیاط کے طور پر ایک دستہ ایسی جگہ متعین کر دیا جو راجپوتوں کی فوج سے اوجھل رہا ۔ باقی فوج کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ۔

جنگ شروع ہوئی ۔ محمد غوری نے طے شدہ منصوبے کے تحت پسپا ہونا شروع کر دیا اور راجپوتوں کو تعاقب کرنے کی ترغیب دی ۔ اچانک محمد غوری نے پلٹ کر راجپوتوں کی فوج کو نرغے میں لے لیا ، محفوظ دستے نے بھی پیچھے سے حملہ کر دیا ۔ راجپوتوں کی فوج اس صورتحال کو سمجھنے سے قاصر رہی ، ان کی صفیں ٹوٹنے لگیں ۔ زوروں سے لڑائی ہوئی ۔ بہت سے راجپوت سردار مارے گئے اور محمد غوری کو فتح حاصل ہو گئی ۔

اِس لڑائی سے راجپوتوں کی طاقت تباہ ہو گئی اور یہ کئی سال تک بحال نہ ہو سکی ۔ دوسری طرف محمد غوری کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ اب دُور ہو چکی تھی اور اُس نے اپنی فتوحات کا سلسلہ تیز تر کر دیا ۔ اُس نے اجمیر ، دہلی اور سرسوتی کے علاقے فتح کر لیے ۔ شمالی ہندوستان میں پرتھوی راج کے بعد دوسری اہم طاقت قنوج کے راجا کی تھی ۔ محمد غوری نے 1194 ء میں اسے بھی زیر کر لیا ۔

1194 ء میں محمد غوری نے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود واپس غزنی چلا گیا ۔

قطب الدین ایبک نے شمالی اور وسطی ہندوستان کا بیشتر علاقہ مسلم حکومت میں

شامل کر لیا ۔ محمد غوری کے ایک جرنیل بختیار خلجی نے مشرقی ہندوستان میں بہار پر قبضہ کر لیا ۔ بختیار خلجی نے اب بنگال کی طرف توجہ دی ۔ یہاں ایک ضعیف العمر راجا کی حکومت تھی ، جو ضعیف الاعتقاد بھی تھا ۔ اُس نے برھمنوں اور منجموں سے یہ پیش گوئی سن رکھی تھی کہ بنگال پر ترکوں کا قبضہ ہو جائے گا ۔ اُس نے دِل چھوڑ دیا ۔ بختیار خلجی محافظوں کو قتل کر کے محل میں داخل ہو گیا ۔ راجا عقبی دروازے سے بھاگ گیا ۔ اس طرح بنگال پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا ۔

بختیار خلجی نے 1205 ء میں تبت کے علاقے کو فتح کرنے کی کوشش کی مگر غیر موزوں موسمی حالات کے باعث ناکام رہا ۔ اسی سال بختیار خلجی کا انتقال ہو گیا ۔

اپنے بڑے بھائی غیاث الدین کے انتقال کے بعد محمد غوری ، غور کا خود مختار بادشاہ بن گیا ۔ اُس نے وسط ایشیا میں سب سے طاقت ور بادشاہ خوارزم شاہ کو شکست دی مگر خوارزم شہر پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا۔ اسی زمانے میں (1204 ء) اس کی ناکامی کے باعث ہندوستان میں یہ افواہ گرم ہو گئی کہ محمد غوری مارا گیا ہے ۔ اس افواہ کے نتیجے میں پنجاب ، ملتان اور لاہور میں بغاوتیں شروع ہو گئیں ۔ قطب الدین ایبک نے محمد غوری سے مدد کے لیے ہندوستان آنے کی درخواست کی ۔ محمد غوری نے آکر بغاوتوں پر قابو پایا اور پھر واپس غزنی روانہ ہو گیا۔ راستے میں 1206 ء میں ملتان کے ایک باشندے نے اسے قتل کر دیا ۔

تجزیہ

کسی بھی کام کی کامیابی میں بنیادی مقتضیات یہ ہوتے ہیں کہ (1) کام کو نبھانے کا عزم اور ارادہ مضبوط ہو ۔ (2) ہر طرح سے ممکن کوشش اور تیاری کی جائے (3) موزوں حالات میسّر ہوں اور (4) حالات کو بہتر حکمت عملی سے اپنے حق میں استعمال کیا جائے ۔

جب ہم شہاب الدین محمد غوری کے ہندوستان پر حملوں اور اس کی کامیابیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو مندرجہ بالا تمام باتیں واضح طور پر عمل پذیر نظر آتی ہیں ۔

شہاب الدین غوری ، اپنی تربیت کے لحاظ سے بڑے مضبوط ارادے کا مالک تھا ۔ اُس نے اس ارادے سے نہ صرف وسط ایشیا میں اپنی مضبوط حکومت قائم کی بلکہ ہندوستان میں ترائن کی پہلی جنگ میں شکست کے باوجود ہمت نہ ہاری ۔ اُس نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے پورا سال بھرپور تیاری کی ، اور اس تیاری میں وہ اس قدر مگن تھا کہ اس نے کئی ماہ تک نہ اپنے گھر والوں کا منہ دیکھا ، نہ ہی لباس تبدیل کیا ۔ جن لوگوں نے اس کے ساتھ نمک حرامی کی ، ان سے قطع تعلق کر لیا ۔ یہ سب باتیں اسکے مضبوط ارادے کی شہادت دیتی ہیں کہ اُس نے یہ طے کر لیا کہ جب تک وہ ترائن کی شکست کا بدلہ نہ لے لے ، دنیا کی کوئی شئے اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتی ۔ اُس وقت اس کے سامنے سب سے اعلیٰ انتخابِ کار صرف بدلہ لینا تھا ۔

شہاب الدین غوری نے امرأ سے ناراضگی اور ان کی مدد کے بغیر ایک لاکھ کی مضبوط فوج تیار کی ۔

اس وقت ہندوستان میں مجموعی طور پر سیاسی اور معاشرتی حالات زوال پذیر تھے ۔ یہاں مختلف طبقات میں باہمی نفرت اور شک کی فضا تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ محمد غوری کے مقابل ایک لشکرِ جرّار تیار کرنے کے باوجود مقامی راجہ کامیاب نہ ہو سکے ۔ ہندوستانی راجا ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرتے تھے ۔ مثال کے طور پر قنوج کے راجا نے محمد غوری کے خلاف لشکر کی تیاری میں حصہ نہ لیا ۔ راجاؤں کے درمیان باہمی چپقلش کے باعث ان کی فوجوں میں بھی شک اور عدم اعتماد کی فضا برقرار تھی ۔

واضح رہے کہ ترائن کی پہلی جنگ میں غوری کی شکست کی وجہ افغانی امیروں کی غیر ذمے داری تھی ۔ وہ میدان سے موقع پا کر بھاگ گئے تھے ۔ اِس جنگ میں محمد غوری کی تیاری بھی موزوں نہ تھی ۔ تاہم تیاری کے بعد جب اُس نے حملہ کیا تو کامیاب رہا ۔

کامیابی کے جو معیار اوپر بیان کیے ہیں ان میں آخری ، حکمت عملی کا مناسب استعمال ہے ۔ ترائن کی دوسری جنگ کی مثال لیں ۔ اس میں محمد غوری نے اپنے لشکر کو مناسب طور پر تقسیم کیا ۔ ایک گروہ کو حفاظت اور اچانک حملے کے لیے علٰحدہ رکھا اور خود ایک طے شدہ منصوبے کے تحت پسپا ہوتا گیا ۔ اس نے راجپوتوں کو پیچھا کرنے کی ترغیب دی اور اچانک پلٹ کر اس نے راجپوتوں کا صفایا کر دیا ۔

ترائن کی دوسری جنگ وہ موڑ ہے جہاں سے محمد غوری کے لیے فتوحات کی راہیں کُھل گئیں ، اور اُس نے ہندوستان میں وسیع علاقوں پر قبضہ کر لیا ۔

شہاب الدین محمد غوری اگرچہ ہندوستان میں اپنی حکومت باقاعدہ طور پر قائم نہ کر سکا ۔ تاہم اُس نے فتوحات کر کے ایسے حالات پیدا کر دیے جن میں اس کے تربیت یافتہ افراد نے حکومت کی بنیاد رکھی ۔

یاد دہانی کے لیے اہم نکات

الف — واقعاتی تسلسل

1- سلطنت غزنی کا خاتمہ ——— 1151ء
2- محمد غوری کی ملتان اور اُچ پر چڑھائی ——— 1175ء
3- لاہور کی فتح ——— 1186ء
4- ترائن کی پہلی جنگ ——— 1191ء
5- ترائن کی دوسری جنگ ——— 1192ء
6- دہلی کی فتح ——— 1193ء
7- بنگال کی فتح ——— 1200ء
8- محمد غوری کی تخت نشینی ——— 1203ء
9- محمد غوری کا قتل ——— 1206ء

8 - محمد غوری کی تخت نشینی —— 1203ء

9 - محمد غوری کا قتل —— 1206ء

ب — اہم نکات برائے اعادہ

(1) شہاب الدین محمد غوری غور کے علاقے کا رہنے والا تھا ۔ معاشی طور پر اس کا تعلق درمیانے طبقے سے تھا ۔ اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس نے غزنی کی حکومت کو ختم کیا اور اپنی حکومت قائم کی ۔

(2) غوری کے حملے کے وقت ہندوستانی معاشرے میں مجموعی طور پر قوت مدافعت ختم ہو چکی تھی ۔ یہاں جاگیرداری نظام اور مخصوص مذہبی نظام کی وجہ سے لوگوں میں سخت بے چینی تھی ۔ یہ حالات کسی بھی حملہ آور کے لیے سازگار تھے ۔

(3) شہاب الدین غوری کو ابتدا میں شکست ہوئی مگر بعد میں اُس نے نہ صرف اپنی شکست کا بدلہ لیا بلکہ بے شمار علاقوں کو فتح بھی کیا ۔

(4) شہاب الدین غوری کی کامیابیوں میں اسکی شخصی خصوصیات اور کردار کے علاوہ ہندوستان کے مقامی حالات نے بھی اہم کردار ادا کیا ۔

(5) تاریخی تجزیے میں معروضی طریقۂ کار کو اپنانا سب سے پہلا اور بنیادی تقاضا ہے ۔ اس طریقۂ کار میں کسی تعصب ، پسند یا ناپسند ، اور پہلے سے طے شدہ اصول کے بغیر تاریخی حالات کا مطالعہ کیا جاتا ہے ۔ تاریخ پڑھنے والا ایک منصف کی طرح تمام حالات و شواہد کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہے ۔

غوروفکر کے لیے چند باتیں

الف 1- محمد غوری کی کامیابیوں میں اسکی ذاتی خُوبیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مقامی حالات نے بھی اہم کردار ادا کیا ۔ تجزیہ کریں ۔

2- ترائن کی دوسری جنگ میں محمد غوری کی کامیابی کی وجوہات کیا تھیں ، بحث کریں ۔

ب ۔ مختصر جواب دیں ۔

(i) کن وجوہات کی بنیاد پر سلطان شہاب الدین محمد غوری کے حملے محمود

غزنوی کے حملوں سے مختلف تھے ؟

(ii) ہندوستان میں سلطنت غزنی کا خاتمہ کب ہوا ؟

(iii) غوریوں میں غزنوی حکومت کے خلاف لڑنے کا شعور کیوں ابھرا ؟

(iv) سلطان محمد غوری کو ترائن کی پہلی جنگ میں شکست کے بعد کس بات کا خطرہ تھا ؟

(v) ترائن کی دوسری جنگ میں کون سی حکمت عملی سلطان محمد غوری کی کامیابی کا باعث بنی ؟

(vi) سلطان محمد غوری کی ہندوستان میں فتوحات کے کون سے محرکات سب سے اہم تھے ۔ صرف دو کا ذکر کریں ۔

کتابیات

اس سبق کو لکھتے وقت درج ذیل کتب سے مدد لی گئی ، طلبہ و طالبات مزید معلومات اور وضاحت کے لیے ان کا مطالعہ کریں ۔

1- تاریخ فرشتہ ، از محمد قاسم فرشتہ (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

2- Muslim Rule in India & Pakistan (711-1858 A.C.) By S.M.Ikram

Published by Star Book Depot Lahore 1966

3- آبِ کوثر مصنفہ ایس ۔ ایم ۔ اکرام

5
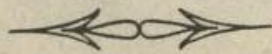
ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد

شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات کے بعد یہاں کئی خاندانوں نے حکومت کی اور یہ سلسلہ تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے سولھویں صدی عیسوی کے اوائل تک جاری رہا۔ اس عرصے میں یہاں حکومت کرنے والے بادشاہوں کو سلاطینِ دہلی (1) کہا جاتا ہے۔

کوئی بھی کام ہو ، اس کے شروع کرنے کا زمانہ یقیناً محنت طلب اور مشکلات سے بھرپور ہوتا ہے۔ اگر یہ معاملہ حکومت کے قیام کا ہو تو اسکی مشکلات اور مسائل مزید بڑھ جاتے ہیں ۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کا قیام اپنی نوعیت اور حالات کے تناظر میں حد درجہ مشکل اور محنت طلب تھا ۔ محض فتوحات حاصل کر لینا اگرچہ اپنی جگہ آسان کام نہیں تاہم اس کے برعکس ان فتوحات کو بنیاد بنا کر مستقل حکومت کا قیام یقیناً نہایت مشکل امر تھا ۔

1- 13 ویں صدی عیسوی سے 16 ویں صدی عیسوی کے اوائل تک ہندوستان میں جن بادشاہوں نے حکومت کی وہ اپنے آپ کو سلطان کہلواتے تھے ۔ چونکہ ان کا دارالحکومت دہلی تھا ، اسی مناسبت سے ان کو سلاطینِ دہلی کہا جاتا ہے۔

نوٹ :۔ اس دَور کا مطالعہ انفرادی بادشاہ کے ساتھ ساتھ اہم ادوار کے تناظر میں کیا گیا ہے ۔ یہ ادوار یہ ہیں (1) سلاطین کی حکومت کی بنیاد (2) حکومت کے استحکام کا دَور (3) حکومت میں وسعت اور اصلاحات کا دور (4) حکومت میں زوال کا دَور ۔

اس تقسیم سے مطالعہ بہتر طور پر ممکن ہو گا۔ مطالعے کی اس تقسیم سے سلاطینِ دہلی کی حکومت کے دور میں معاشی اور معاشرتی شعبہ جات کے بارے میں مطالعہ بھی ممکن ہو سکے گا۔

ہندوستان ، مسلمان حکمرانوں کے لیے اجنبی علاقہ تھا۔ یہاں کے حالات عمومی طور پر حملہ آوروں کے حق میں ساز گار ضرور تھے مگر حکومتی نقطۂ نظر سے ان کو ہندوستان کے اہم سیاسی گروہوں کی مخالفت کا سامنا رہتا تھا۔

ان حالات میں مسلم حکمرانوں نے کس طرح کی حکمت عملی اور طریقہ کار وضع کیا، یقیناً دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے :۔

سلطان قطب الدین ایبک

(1210-1206)

"ایک رات بزمِ نشاط آراستہ ہوئی، سلطان (محمد غوری) نے اس جشن میں اپنے تمام غلاموں کو سونا چاندی انعام میں دیا۔ قطب الدین کو جو انعام ملا، مجلس سے باہر آتے ہی، اُس نے پورے کا پورا ـــــ کارکنوں میں تقسیم کر دیا۔ اپنے پاس کچھ نہ رکھا۔ دوسرے دِن یہ اطلاع سلطان تک پہنچی تو اُس نے قطب الدین کو اپنی نوازش اور قرب کے لیے مخصوص کر لیا۔ اسے تخت گاہ اور ایوانِ دربار کے اہم کام سونپے جانے لگے اور وہ بڑا سردار بن گیا۔" (طبقاتِ ناصری)

یہ ایک غلام کی کہانی ہے، جو ایک سردار بن جانے کے بعد ختم نہیں ہوئی بلکہ اُس نے ہندوستان میں ایک حکومت کی بنیاد رکھی، اور وہ اس کا بادشاہ بنا۔ اس غلام کا نام قطب الدین ایبک تھا۔

قطب الدین ایبک نسلاً ترک تھا۔ اسے بچپن ہی سے غلام (1) بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ ایک گورنر نے ایبک کو خرید لیا اور اسکی پرورش اپنے بیٹوں کی طرح کی۔ اُسے قرآن پاک پڑھایا اور اُس زمانے کے رواج کے مطابق سواری اور تیر اندازی کے فنون سکھائے۔ آہستہ آہستہ ایبک کی شخصیت کے پہلو نکھرنے لگے۔ جرأت اور دوسری شخصی خصوصیات کے باعث اسے بہت پسند کیا جانے لگا۔ جب وہ جوان ہوا تو یہ گورنر اسے محمد غوری کے پاس لے آیا۔ محمد غوری نے اسکے اوصاف دیکھ کر اُسے خرید لیا۔

1- وسط ایشیا میں ایک عرصے تک غلامی کا رواج رہا۔ لوگ چھوٹی عمر کے لڑکوں کو خرید کر اپنی مرضی کے مطابق ان کی تربیت کرتے تھے اور ان سے اپنے فائدے کے لیے مختلف کام لیتے تھے۔ اس کام میں مقامی لوگوں کے خیال میں اُن کو معاشرتی عزت ملتی تھی۔ بلکہ جس کے پاس جتنے زیادہ غلام ہوتے تھے، اسے اتنا زیادہ عالی مرتبت سمجھا جاتا تھا۔

قطب الدین ایبک اگرچہ قابلِ ستائش اوصاف کا حامل تھا مگر ظاہری حسن و خوبی سے خالی تھا ۔ اسکی چھنگلی ٹوٹی ہوئی تھی ، اسے لیے اسے 'ایبک شل' کہا جاتا تھا ۔ یعنی وہ شخص جس کی ایک انگلی کمزور ہو ۔ اسی مناسبت سے قطب الدین ، 'ایبک' کے نام سے مشہور ہوا ۔

سلطان محمد غوری کے دربار میں ایبک نے اپنی عقل و دانش کے باعث جلد ہی اہم حیثیت حاصل کرلی ۔ ہندوستان میں مہم جُوئی کے وقت ایبک ، سلطان محمد غوری کے ساتھ رہا اور اس نے غیر معمولی خدمات انجام دیں ۔ سلطان محمد غوری واپس جانے لگا تو اُس نے قطب الدین ایبک کو 'ملک' کا خطاب دیا اور اُسے ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کر دیا ۔ محمد غوری نے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے قطب الدین ایبک کو آزاد کر دیا اور وہ ہندوستان کا خود مختار بادشاہ (1) بن گیا۔ یہ واقعہ 1206ء کا ہے۔

1- بادشاہت کا ادارہ :- ہزاروں سال پہلے لوگ کنبے اور پھر قبیلوں کی شکل میں رہتے تھے ۔ دفاعی اور معاشی ضروریات کے تحت مختلف قبائل نے مل کر رہنا شروع کر دیا ۔ یہ ریاست کے قیام کی ابتدائی شکل تھی ۔ یہاں تمام قبائل کی نمائندہ حکومت بنتی تھی اور ان میں سے ایک شخص سربراہِ اعلیٰ منتخب کیا جاتا تھا ۔ ابتدا میں تمام معاملات باہمی صلاح مشورے سے چلتے تھے مگر آہستہ آہستہ اس نظام میں منفی رجحانات پیدا ہونے لگے۔

قبائلی ریاست کے سربراہ نے آہستہ آہستہ اپنی ذاتی پسند ، نا پسند کے مطابق اختیارات حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی ۔ اُس میں مطلق العنان اور ہر لحاظ سے خود مختار سربراہ بننے کی خواہش پیدا ہوگئی تاکہ وہ کسی کی مداخلت کے بغیر اپنی حکومت قائم کر سکے ۔ یہیں سے بادشاہت کے ادارے نے جنم لیا اور یہ سلسلہ سینکڑوں سالوں تک چلتا رہا ۔

بادشاہت کو لوگوں میں بااثر بنانے کے لیے ، بادشاہ ایسا ماحول بنانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ لوگ اسے اپنے آپ سے مختلف اور اعلیٰ سمجھیں ۔ اسے عام لوگوں کے تصور میں مختلف ، بارعب ، ہر لحاظ سے خود مختار اور مکمل ثابت کرنے کے لیے ایسے کام کیے جاتے تھے کہ یہ تصورات لوگوں کے دِلوں میں یقین کی حد تک بیٹھ جائیں ۔ مثال کے طور پر دربار میں نہایت شاندار اور عام زندگی سے مختلف ماحول بنانا، بادشاہ کے سامنے خاص رسوم بجا لانا اور معمولی سی بات پر قتل کا حکم دینا یا انعام اکرام سے نواز دینا وغیرہ وغیرہ ۔ ان تمام رسوم اور احکامات کا مقصد بنیادی طور پر عام لوگوں کے دِل میں بادشاہ کی ذات کے بارے میں اسقدر خوف پیدا کر

(بقیہ اگلے صفحے پر)

ایبک کے اقدامات

قطب الدین ایبک سے پہلے ، محمود غزنوی اور محمد غوری نے ہندوستان کی فتوحات کو سلطنت غزنی کا حصّہ قرار دے دیا تھا ۔ ہندوستان پر حکومت بھی غزنی سے ہی کی جاتی تھی ۔ قطب الدین ایبک نے اس اندازِ حکومت کو عملی طور پر غیر مؤثر سمجھا ، کیونکہ اُس کے خیال میں ایک طویل فاصلے سے ہندوستان پر حکومت کرنا نہ صرف انتظامی طور پر غیر مناسب تھا بلکہ مشکل بھی تھا ۔ کسی بھی ہنگامی صورت میں غزنی اور ہندوستان کے درمیان اطلاعات و فرامین کے تبادلے میں خاصا وقت لگ جاتا تھا اور اس دوران صورتحال کے دگرگوں ہونے کا خطرہ رہتا تھا ۔ اسی تناظر میں قطب الدین ایبک نے دہلی کو مسندِ حکومت قرار دیا، اور اِس طرح ہندوستان پر اس کے علاقے سے حکومت کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا ۔

قطب الدین ایبک کو اپنی سیاسی پوزیشن مضبوط بنانے میں درج ذیل مسائل کا سامنا کرنا پڑا :۔

دینا ہوتا تھا کہ لوگ اس ڈر کی کیفیت میں کسی قسم کی شکایت یا ردّ عمل نہ ظاہر کر سکیں ، اور بادشاہ جیسے چاہیں ، عوام سے اپنی مرضی کے کام کرواسکیں ۔

عام طور پر بادشاہ مندرجہ بالا طریقوں کے علاوہ درج ذیل امور پر خصوصی توجہ دیتے تھے ۔

(1) سیاسی اور معاشی طور پر مفید اور مدد گار امراء اور جاگیرداروں کو اپنے قریب رکھنا ۔ ان کو ان کے مفاد کے مطابق قانون بنا کر خوش رکھنا ۔ اس کے بدلے میں یہ امرأ بادشاہ کی فوجی یا مالیاتی اعانت کرتے تھے ۔

(2) ملک میں داخلی یا خارجی شورشوں یا بغاوتوں کو دبا کر رکھنا یا انھیں مختلف حربوں سے ختم کرنے کی کوشش کرنا ۔

(3) وُسعت پسندی سے کام لیتے ہوئے اعلیٰ فوج قائم کرنا ، اور نئے نئے علاقے فتح کر کے سلطنت کو وسعت دینا ۔ یہ کام اس زمانے میں باعث افتخار سمجھا جاتا تھا ۔

(4) فوج کی ضروریات اور ذاتی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ایسا مالیاتی نظام نافذ کرنا ، جس سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل ہو ۔ بادشاہت کے دَور میں ، عام لوگوں کی بہبود پر کم ہی توجہ دی جاتی تھی ۔ بلکہ بادشاہوں کے تمام تر اسراف کا بوجھ لوگوں کو ہی اٹھانا پڑتا تھا، جس کے باعث ان کی زندگی حد درجہ پس ماندہ رہتی تھی ۔

(1) قطب الدین ایبک ایک آزاد کردہ غلام تھا ۔ اُس لے ہم عصر معاشرتی ڈھانچے میں آزاد کردہ غلام کو عزت کا درجہ حاصل نہ تھا ۔ ترک افسران اور امرأ اسی تناظر میں ایبک کی حکومت کو نا پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور نسلی تفاخر کی بنیاد پر حکومت پر اپنا حق فائق سمجھتے تھے ۔

ان لوگوں کے علاوہ سلطان محمد غوری کے آزاد کردہ غلاموں میں تاج الدین یلدوز اور ناصرالدین قباچہ بھی حکومت پر قبضے کے خواہشمند تھے ۔ ان دونوں نے ہندوستان کی فتوحات میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اور محمد غوری نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں اہم صوبوں کا گورنر مقرر کر رکھا تھا ۔

قطب الدین ایبک کے بادشاہت کے اعلان کے ساتھ ہی یلدوز نے غزنی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور یہ دعوٰی کیا کہ وہ سلطان محمد غوری کی سلطنت، بشمول مفتوحہ علاقہ جاتِ ہندوستان کا واحد حکمران ہے ۔ قباچہ نے اُچ اور ملتان میں بادشاہت کا اعلان کرکے ایبک کی حیثیت کو چیلنج کر دیا۔

قطب الدین ایبک نے اس ساری صورتحال کو نہایت سکون اور سمجھ داری سے اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی ۔ ایبک کی یہ خصوصیت بہت اہم تھی کہ وہ سیاسی معاملات میں کسی قسم کی غلط فہمی یا غیر ضروری رائے قائم کرنے کی بجائے ایک با عمل رویّہ رکھتا تھا۔

سلطان قطب الدین ایبک اپنی مجموعی طاقت کے اعتبار سے اس پوزیشن میں نہ تھا کہ وہ یلدوز اور قباچہ سے براہ راست ٹکر لیتا ۔ اُس نے سب سے پہلے ناراض اور اسکی حکومت کو ناپسندیدہ قرار دینے والے امراء کے دِل جیتے اور ان کے مفادات کو فوقیت دینے کا وعدہ کیا ۔ اس اقدام سے ایک اہم سیاسی گروہ اس کے خلاف غیر مؤثر ہوگیا ۔ قباچہ کے ساتھ سیاسی تناؤ کم کرنے کے لیے اس کے ساتھ رشتہ داری قائم کی اور اپنی بہن کی شادی اس سے کر دی ۔

یلدوز غزنی کا حاکم تھا ۔ اُس وقت ایران کا حاکم ، خوارزم شاہ غزنی کو فتح کرنے کے درپے تھا ۔ اس کی وُسعت پسندی کے عزائم میں ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرنا سر فہرست تھا ۔ غزنی کی فتح سے یہ کام آسان ہو سکتا

تھا۔

خوارزم شاہ نے یلدوز کو غزنی سے دھکیل کر ہندوستان کی طرف بھگا دیا۔ یہاں پہنچ کر یلدوز نے پنجاب پر حملہ کر دیا۔ ایبک نے اسے پسپا کرکے واپس جانے پر مجبور کر دیا، بلکہ ایبک نے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا۔ تاہم یلدوز نے چالیس دِن کے بعد غزنی کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس طرح یلدوز اور ایبک کے درمیان سیاسی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے علاقوں پر قبضہ جمانے میں کوشاں رہے، مگر عملی طور پر قطب الدین ایبک کو اس صورتحال سے خاصا فائدہ پہنچا۔ ایبک اگرچہ غزنی پر قبضہ برقرار نہ رکھ سکا مگر اُس نے یلدوز کو بھی ہندوستان کے علاقوں کے قریب تک پھٹکنے نہ دیا۔ اس صورتحال کو ایک خوشگوار تعلق میں تبدیل کرنے کے لیے ایبک نے یلدوز کی بیٹی سے شادی کرنا قبول کر لیا اس طرح اس نے وقتی طور پر متوقع خطرات اور جاری سیاسی چپقلش سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔

(2) سلطان محمد غوری کی فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان میں سب سے اہم قوت غیر مؤثر ہو چکی تھی۔ یہ قوت راجپوت راجاؤں کا باہمی اتفاق تھا جو انھوں نے محمد غوری کے مقابلے کے لیے قائم کیا تھا۔ ایبک کے دور میں ان کی باہمی بداعتمادی کے باعث مشترکہ نقطۂ نظر اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والا اتحاد ختم ہو چکا تھا۔ تاہم انفرادی طور پر جہاں پر موقع ملتا، مختلف ہندوستانی راجا ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ یہ حالات مرکز سے دُور بنگال میں خصوصی طور پر توجہ طلب تھے۔ ایبک کی بڑھتی ہوئی سیاسی ساکھ کے نتیجے میں ان راجاؤں پر خاطر خواہ اثر پڑا اور انھوں نے براہِ راست ٹکراؤ کی پالیسی سے اجتناب کیا۔ انھوں نے ایبک کی اطاعت قبول کرلی اور سالانہ خراج دینا منظور کر لیا۔

قطب الدین ایبک کو چوگان (پولو) کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ یہ وسط ایشیا کے لوگوں کا مقبول کھیل تھا۔ ایک دفعہ لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے، ایبک گھوڑے سے گر پڑا اور زین اسکے سینے میں لگی۔ اس سے اسکی فوری موت واقع ہو گئی۔ یہ واقعہ 1210ء میں ہوا۔

قطب الدین ایبک کا مزار لاہور کے انار کلی بازار کے ساتھ ملحقہ ایک سڑک پر واقع ہے۔

سلطنت دہلی (التمش کے عہد میں)
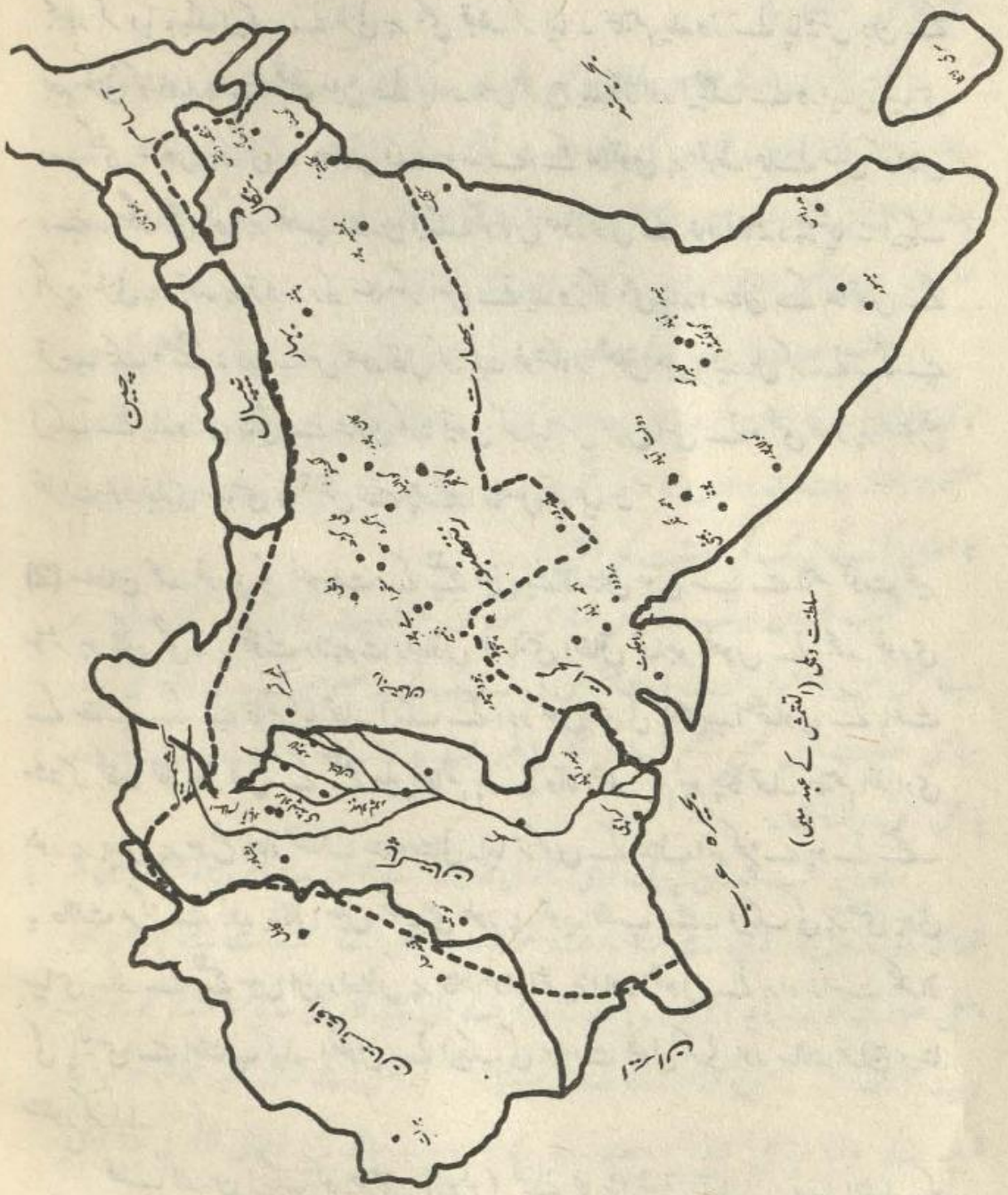
تجزیہ :۔

قطب الدین ایبک نے ایک غلام کی حیثیت سے اپنی زندگی کی ابتدا کی ۔ اپنی صلاحیتوں اور ذاتی قابلیت کی بنیاد پر اُس نے اپنا مقام بنایا اور آخر ہندوستان میں اُس نے مسلم حکومت کے قیام میں بنیادی کام سر انجام دیے ۔

ایبک کی شخصیت میں سب سے اہم اور بنیادی خصوصیت اس کا زندگی کے بارے میں ایک باعمل نظریہ تھا ۔ وہ کسی قسم کے بھی حالات میں حقیقت پسندی کا دامن نہ چھوڑتا تھا۔ اسکی زندگی اور سیاسی کردار میں حقیقت پسندی کی بے شمار امثال ملتی ہیں۔ ایبک نے وسعت پسندی کی بجائے، حکومت کے قیام میں متوقع خطرات کو دور کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب رہا ۔ اس سطح پر وُسعت پسندی سے وقتی کامیابی اور احساسِ تفاخر تو مل سکتا تھا مگر اس طرح حکومت کو مستقل بنیادوں پر قائم کرنا مشکل ہو سکتا تھا ۔ یہی بات اس کی حقیقت پسندی کی سب سے اہم مثال ہے ۔

سابقہ حکمرانوں کے مقابلے میں دہلی کو مسندِ حکومت قرار دینے کا فیصلہ بھی عملی طور پر موزوں اور مفید تھا ۔ اس سے وہ وسط ایشیا کی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر ہندوستان کے معاملات پر زیادہ توجہ دے سکتا تھا ۔ اگرچہ یلدوز کی وجہ سے اسے غزنی کی سلطنت میں اپنا عمل دخل برقرار رکھنا پڑا مگر آنے والے حکمرانوں کے لیے اُس نے ایک اہم پالیسی کی بنیاد رکھ دی ۔

اپنی حکومت کو در پیش خطرات کو اس نے نہایت اطمینان سے اور باعمل طریقے اپنا کر حل کیا ، محض لڑائی لڑنے یا ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرنے کی بجائے اُس نے سیاسی حل پر زور دیا ۔ اس نے اپنے خلاف سرگرم امرأ کو ان کے مفادات کے تحفظ کا یقین دلا کر غیر مؤثر کیا ۔ یلدوز کو ایسے حالات میں پھنسا دیا کہ وہ اُس کے علاقے میں حملہ کرنے سے باز رہا ۔ اسی طرح جہاں ضرورت محسوس کی ، ذاتی رشتے داری سے سیاسی معاملات حل کر لیے؛ مثال کے طور پر قباچہ سے اپنی بہن کی شادی کر دی اور یلدوز کی بیٹی سے خود شادی کر لی۔

یاد دہانی کے لیے اہم نکات

1- ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد کی سب سے زیادہ مخالفت مقامی حکمرانوں اور سیاسی گروہوں نے کی۔

2- بادشاہت کے ادارے میں ، بادشاہ کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات قانون کا درجہ رکھتی تھی ، اس ادارے میں بادشاہ کی ذات اور اسکی ہر خواہش کو ہی فوقیت حاصل ہوتی تھی۔ انھی کی بنیاد پر پورا نظامِ حکومت تعمیر کیا جاتا تھا ۔

3- قطب الدین ایبک پہلا حکمران تھا جس نے وسطِ ایشیا سے سیاسی رابطہ توڑ کر ہندوستان کے ہی شہر دہلی کو مسندِ حکومت قرار دیا تاکہ انتظامی اور سیاسی ضروریات کو جلد از جلد مقامی طور پر پورا کیا جا سکے ۔

4- قطب الدین ایبک نے ایک با عمل اور فعّال سیاسی حکمتِ عملی کے تحت اپنے مخالفین پر قابو پایا ۔

غور و فکر کے لیے چند باتیں

الف 1- "قطب الدین ایبک نے اپنے پیشِ نظر مسائل کو بڑی فعال حکمتِ عملی سے حل کیا"، بحث کریں ۔

2- قطب الدین ایبک کے کونسے اقدام کو مسلم حکومت کے قیام کے سلسلے میں اہم قرار دیا جا سکتا ہے ۔ تجزیہ کریں ۔

ب ۔ مختصر جواب دیں ۔

(1) قطب الدین ایبک کی ابتدائی تربیت کس نے کی ؟

(2) وسطِ ایشیا میں از منہ وسطیٰ میں غلامی کی نوعیت کیا تھی ۔ ؟

(3) قطب الدین ، 'ایبک' کے نام سے کیوں مشہور ہوا ؟

(4) قطب الدین ایبک کب اور کیسے ہندوستان کا بادشاہ بنا ۔ ؟

(5) قطب الدین ایبک ، ہندوستانی سلطنت پر حکومت کی مسند کو وسط ایشیا کی بجائے دہلی میں کیوں رکھنا چاہتا تھا ؟

(6) قطب الدین ایبک کو در پیش اہم مسائل کی نشاندہی کریں ؟

(7) قطب الدین ایبک کی سیاسی حکمت عملی میں کون سی ایک بات یا رویہ سب سے اہم تھا ؟

(ج) نیچے ایک بیان کے ساتھ چند وجوہات دی گئی ہیں ۔ یہ سب وجوہات اپنی جگہ پر درست ہیں ، تاہم ان میں سے کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے ۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں بحث کریں اور جو بھی مشترکہ فیصلہ ہو اس پر ✓ کا نشان لگائیں ۔

الف — بادشاہ اپنے آپ کو بارعب ، ہر لحاظ سے خودمختار اور مطلق العنان ثابت کرنے کے لیے :

(i) اپنا دربار نہایت پُر تکلف اور عام زندگی سے مختلف رکھتا تھا ۔

(ii) معمولی سی بات پر قتل یا انعام و اکرام کا حکم دے دیتا تھا ۔

(iii) مجموعی طور پر ایسا ماحول استوار کرتا تھا کہ اس کی ذات کا خوف عوام کے دِلوں میں بیٹھ جائے ۔

ب — بادشاہ اپنی حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے :

(i) سیاسی اور معاشی طور پر مدد گار امرأ اور جاگیرداروں کو اپنے قریب رکھتا تھا ۔

(ii) ہر قسم کی خارجی اور داخلی بغاوتوں کو دبانے یا ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا ۔

(iii) ایسا مالی نظام استوار کرتا تھا جس سے اسے زیادہ سے زیادہ دولت مل سکے ۔

(iv) اعلٰی قسم کی مستعد اور کار آمد فوج تیار کرتا تھا ۔
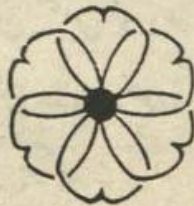
شمس الدین التتمش

(1211ء —— 1236ء)

"ایک موقع پر (جب میں غلام تھا) مجھے ایک چھوٹا سا سکّہ دیا گیا کہ بازار جاکر تھوڑے سے انگور لے آؤں ۔ میں بازار گیا مگر راستے میں سکّہ کہیں گم ہوگیا ۔ میں کم سن تو تھا ہی ، اس افتاد پر اتنا ڈر گیا کہ بے اختیار رونے لگا ۔ اس حالت میں ایک درویش میرے پاس آیا ، میرا ہاتھ تھاما ، مجھے انگور خرید کر دیے اور مجھ سے یہ عہد لیا کہ "مستقبل میں اگر تم صاحب اختیار ہو گئے تو تم اپنے سے کم درجہ لوگوں کی عزت کرو گے ۔" میں نے یہ عہد قبول کر لیا ۔" (طبقاتِ ناصری)

یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جب التتمش کو اس کے حقیقی بھائیوں نے بوجہ حسد غلام بناکر فروخت کر دیا تھا ۔ بعد میں قطب الدین ایبک نے اسے خرید لیا ۔

التتمش باصلاحیت اور خوبصورت جوان تھا ۔ انھی خصوصیات کے باعث وہ قطب الدین ایبک کے قریب تر ہوتا گیا ۔ محمد غوری کی ہندوستانی مہمات میں بھی التتمش نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں تھیں ۔ انھی خدمات کی بنیاد پر محمد غوری نے ایبک سے التتمش کو آزاد کرنے کا کہا تاہم اس حکم پر بعد ازاں عمل کیا گیا ۔

سلطان قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد اُس کا ایک بیٹا آرام شاہ حکومت پر متمکن ہوا ۔ چونکہ آرام شاہ مزاجاً سُست رَو تھا ، امرأ نے مناسب خیال کیا کہ اس کی بجائے التتمش جیسے صاحب ہوش اور ذہین شخص کو دعوتِ حکومت دی جائے ۔ التتمش اس وقت بدایوں کا گورنر تھا ۔ التتمش نے یہ دعوت قبول کی ۔ اُس نے آرام شاہ کو شکست دی اور 1210ء میں تخت نشین ہوگیا ۔

سیاسی منظر

(1) داخلی رجحانات

التتمش کو داخلی طور پر دو طرح کی مشکلات کا سامنا تھا ۔ ایک تو یہ کہ ترک امر کا ایک گروہ اسے اقتدار کا حق دار نہیں سمجھتا تھا ۔ التتمش کے مخالفین کی سرگرمیوں کا مرکز لاہور تھا ۔ التتمش نے ان لوگوں سے بڑی سختی کا برتاؤ کیا اور باری باری سب کو تہ تیغ کروا دیا ۔ اس طرح اُس نے متوقع خطرے سے آزادی حاصل کر لی ۔

دوسری طرف ہندوستان کی کئی ریاستوں میں آزاد حکومتوں کے قیام کا اعلان کر دیا گیا تھا ۔ ان حکمرانوں نے اپنے علاقوں کو مزید مقبوضات کے ذریعے وسعت دینا شروع کر دی ۔ ان میں اُچ کے حاکم ناصرالدین قباچہ نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور اپنا سیاسی اثر لاہور ، بٹھنڈہ اور سرسوتی تک بڑھا لیا ۔

لکھنوتی کا علاقہ دہلی اور بنگال و بہار کے درمیان رابطے کی حیثیت رکھتا تھا ۔ یہاں پر بھی آزاد حکومت قائم ہو گئی تھی ۔

راجپوت راجاؤں نے جالور ، رنتھنبور ، گوالیار اور اجمیر میں آزاد حکومتیں قائم کر لیں ۔ اس طرح اس پورے علاقے (دو آب) میں ترکوں کا اثرو رسوخ یکسر ختم ہو گیا ۔

(2) خارجی خطرات

خارجی طور پر التتمش کو تاج الدین یلدوز ، حاکم غزنی کے اس اعلان استحقاق کا سامنا تھا ، جسمیں یلدوز اپنے آپ کو پورے ہندوستانی مقبوضات کا حاکم سمجھتا تھا ۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کے پاس سلطنت غزنی کی جو حکومت تھی وہ محمد غوری نے قائم کی اور اُس سلطنت میں ہندوستان کے مقبوضہ علاقے بھی شامل تھے۔ اس نقطۂ نظر سے اس کی سلطنت میں وسط ایشیا کے علاقوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی علاقے بھی شامل ہونے چاہئیں۔

اُس زمانے میں ایشیا کے وسطی علاقوں میں منگول قوم کی سرگرمیاں بہت تیز

ہو رہی تھیں ۔ ان کا فوجی اور سیاسی اثر و رسوخ بڑی تیزی سے اس علاقے میں پھیل رہا تھا ۔ یہ لوگ فوجی تکنیک اور طاقت کے اعتبار سے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل تھے ، اور اُس عہد میں کسی علاقے کا کوئی بادشاہ ان کے مقابل نہ ٹھہر سکتا تھا ۔ ان لوگوں کے بڑھتے ہوئے اثر کے پیش نظر ممکن تھا کہ وہ ہندوستان پر بھی حملہ کر دیں، جو بعد میں درست ثابت ہوا ۔

التتمش کی حکمتِ عملی

التتمش نے تمام حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ایک حقیقت پسندانہ پالیسی پر عمل کیا ۔ اُس کے اہم اقدامات کا جائزہ درج ذیل ہے۔

جب التتمش نے حکومت سنبھال لی تو اسے فوری طور پر یلدوز کے اعلان استحقاق کا سامنا ہوا ۔ التتمش نے فوری طور پر اس کو تسلیم کر لیا تاکہ مزید وقت حاصل کر کے جوابی کارروائی کی جا سکے ۔

التتمش نے فوری طور پر آزاد حکومتوں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا ۔ اس سلسلے میں بنارس کے علاقے میں اپنی پوزیشن بہتر کی اور سرسوتی اور بٹھنڈہ کے علاقوں کو اپنے قبضے میں لے کر ، یہاں آزاد حکومتوں کا خاتمہ کیا ۔

اسی دوران وسط ایشیا میں سیاسی طور پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ 1215ء میں وسطِ ایشیا کے ایک طاقتور حکمران خوارزم شاہ نے یلدوز کی مسندِ حکومت غزنی پر قبضہ کر لیا ۔ اُس نے یلدوز کا پیچھا ہندوستان کے علاقوں تک کیا ۔ یلدوز بھاگ کر لاہور آیا اور شہر پر قابض ہو گیا ۔

یلدوز چونکہ اپنے آپ کو التتمش کا حاکم سمجھتا تھا ، اُس نے التتمش کو مدد دینے کا حکم دیا ۔ التتمش نے اس موقع کو نہایت مناسب سمجھتے ہوئے یلدوز پر حملہ کر دیا ۔ ترائن میں لڑائی ہوئی ، یلدوز کو قید کر لیا گیا ۔

اس جنگ سے التتمش کو ایک پریشان کن حریف سے چھٹکارا حاصل کرنے میں مدد ملی ۔ التتمش نے دوسری جانب خوارزم شاہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اس کے غزنی پر قبضے کو تسلیم کر لیا ۔ اس طرح التتمش کو وسط ایشیا کی سیاست سے لاتعلق رہ کر

ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کا موقع مل گیا۔

منگولوں کا ممکنہ حملہ

التتمش ابھی اپنے مسائل پر قابو پانے میں مصروف تھا کہ اسے منگولوں کے ممکنہ حملے کا خطرہ در پیش ہوا۔ ہوا یوں کہ اسی زمانے میں وسط ایشیا میں خوارزم شاہ اور منگولوں کے درمیان ٹھن گئی۔ منگولوں (۱) کے سردار چنگیز خان نے خوارزم شاہ پر حملہ کر دیا۔ خوارزم شاہ اپنے تمام علاقے چھوڑ کر پنجاب کی طرف بھاگ گیا۔ منگولوں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر خوارزم شاہ کا چنگیزخاں سے آخری معرکہ ہوا مگر اسے شکست ہوئی۔ قریب تھا کہ منگول خوارزم شاہ کو گرفتار کر لیتے، مگر خوارزم شاہ نے کمال جرأت سے دس میٹر بلندی سے گھوڑے سمیت دریا میں چھلانگ لگا دی اور دریا پار کر گیا۔ یہ سب دیکھ کر چنگیزخان بہت متأثر ہوا اور اس کا پیچھا کرنے سے سپاہیوں کو روک دیا۔

1- منگول :- منگول، ہنوں کی نسل میں سے تھے۔ ان کو 'تاتار' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ قبائل کی صورت میں وسطِ ایشیا کے صحرائے گوبی کے شمال سے بحیرہ بیکال تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا پیشہ ریوڑ چرانا اور گھوڑوں کی پرورش کرنا تھا۔ لوٹ مار کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ یہ لوگ شمالی چین کے حکمرانوں کے اطاعت گزار تھے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں ایک منگول سے اتفاقاً شاہی خاندان کے کسی فرد کا قتل ہو گیا۔ اس کے جسم میں کیلیں ٹھونک کر اسے مار دیا گیا۔ اس قبیلے کے سردار نے شاہی خاندان سے بدلے کی ٹھانی اور شاہی خاندان کے بے شمار لوگوں کو قتل کر دیا۔ ان حالات میں منگولوں کے مختلف قبائل نے متحد ہو کر شاہی خاندان سے لڑائیاں شروع کر دیں۔ ان لڑائیوں میں انھیں فتح ہوئی۔

منگول قبائل میں اتحاد کے جذبے کو چنگیز خاں نے آگے بڑھایا۔ چنگیز خان کا اصل نام تموچین تھا۔ چنگیز خاں تیرہ سال کی عمر میں اپنے قبیلے کا سردار بنا۔ ابتدا میں کم عمری کے باعث دوسرے قبائل نے اسے اپنا سردار ماننے سے انکار کر دیا۔ اُس نے ہمت نہ ہاری اور محنت اور کوشش سے تمام قبائل کو متحد کر کے ان کا سردار بن گیا۔

چنگیز خان نے چین کے بہت سے علاقے فتح کیے اور اس کے بعد اُس نے یہ کوشش شروع کر دی کہ اس علاقے میں تمام تجارتی شاہراہوں کو ہر قسم کے خطرات سے آزاد کر کے تجارت

(بقیہ اگلے صفحے پر)

پنجاب میں آکر خوارزم شاہ نے التتمش سے مدد کی درخواست کی ۔ التتمش کے لیے یہ بڑا نازک موقع تھا ۔ خوارزم شاہ کی مدد کرنے کا مطلب منگولوں کی دشمنی مول لینا تھا ، جسکا مطلب تباہی اور سب کچھ گنوانا تھا ۔ دوسری طرف خوارزم شاہ کی مدد سے التتمش دوبارہ وسط ایشیا کی سیاست میں ملوث ہو سکتا تھا جبکہ وہ پہلے ہی اپنی حکومت کو وسط ایشیا کی سیاست سے دور رکھنے کی سعی کر رہا تھا اور اس ضمن میں معاملات مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں بھی نہ تھے ۔

آخر کار التتمش نے یہی فیصلہ کیا کہ خوارزم شاہ کی مدد نہ کی جائے ۔ اسطرح وہ منگولوں کی دشمنی سے بچ جائے گا اور خوارزم شاہ جو اسکے لیے آئندہ بھی کوئی مسئلہ پیدا کر سکتا تھا ، سے جان چھڑا لے گا ۔ التتمش نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے

کو فروغ دیا جائے ۔ اُس زمانے میں چین سے تجارت کا راستہ ایران سے گزرتا تھا ۔ چین کی مصنوعات چونکہ دنیا میں بہت مقبول تھیں اس لیے یہ راستہ بھی خاصی اہمیت حاصل کر گیا تھا ۔

چنگیز خان کی بڑھتی ہوئی سیاسی ، فوجی اور تجارتی طاقت کو خوارزم شاہ اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا تھا ۔ اُس نے بظاہر دوستی کے روابط بڑھانے کے لیے چنگیز خان کے پاس تحائف کے ساتھ ایک وفد روانہ کیا ۔ اس وفد کا مقصد حقیقت میں چنگیز خان کی طاقت کا اندازہ کرنا تھا ۔ چنگیز خان نے اس وفد کا پرتپاک استقبال کیا اور یہ پیغام کہلا بھیجا کہ وہ خوارزم شاہ کو مغرب کا بادشاہ تسلیم کرتا ہے ۔ اس کے ساتھ کئی تحائف بھی روانہ کیے ۔

ایک مرتبہ خوارزم شاہ کے علاقے میں چند منگول تاجروں کو جاسوس سمجھ کر قتل کر دیا گیا ۔ چنگیز خان نے مجرموں کو اس کے حوالے کرنے کا کہا ، مگر جو سفیر یہ پیغام لے کر آیا اسے بھی قتل کر دیا گیا ۔ اس پر چنگیز خان نے حملے کا ارادہ کیا ۔ اس کے بعد خوارزم شاہ کی ایک غلطی سے پورے علاقے کو ہولناک حالات کا سامنا کرنا پڑا ۔

منگول کسی مذہب کے پیرو نہ تھے ۔ البتہ دوسرے مذاہب کا عام طور پر احترام کرتے تھے ۔ ان کا ایک آئین تھا جس کے مطابق ان کی زندگی کے مختلف امور کے فیصلے کیے جاتے تھے ۔ اسے 'یاسا' یا 'تورۂ چنگیزی' کہا جاتا ہے ۔ یہ لوگ اپنے معاشرتی طور طریقوں پر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے ۔ منگولوں کا معاشرتی انداز اس طرح کا تھا کہ کوئی شخص فرض سے لاپرواہی ، جھوٹ ، چوری ، زنا یا کسی اور معاشرتی جرم کا تصور تک نہ کر سکتا تھا ۔

(تاریخ ایران ۔ براؤن)

خوارزم شاہ کو خط لکھا کہ 'ہندوستان ایک گرم ملک ہے ، یہاں کا ماحول آپ جیسے ذی شان بادشاہ کے لیے مناسب نہیں ۔ اس لیے مناسب ہو گا کہ آپ دہلی کا رُخ نہ کریں ۔' اس خط کے ساتھ ہی التتمش نے ایک لشکر اسکے تعاقب کے لیے روانہ کر دیا تاکہ اسے اپنی مقبوضات سے دور رکھا جا سکے ۔

چنگیز خان ان حالات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کر رہا تھا ۔ اُس نے التتمش کی غیر جانبداری کو سراہا اور واپس چلا گیا ۔ اس طرح ہندوستان میں سلطنت دہلی جسکی عمر ابھی چند سال تھی ، ختم ہونے سے بچ گئی اور اسے ایک نئی زندگی مل گئی ۔ خوارزم شاہ نے مایوسی کے عالم میں اُچ کے قریب قباچہ سے لڑائی کی ۔ اس سے قباچہ کی طاقت میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گئی ۔

قباچہ کا خاتمہ

التتمش نے قباچہ کی کمزور حالت سے فوری فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا ۔ اُس نے بیک وقت سندھ اور ملتان پر فوج کشی کر دی ۔ قباچہ نے بات چیت کرنے کی پیش کش کی ۔ التتمش نے اسے ہتھیار ڈالنے کا کہا ۔ انکار پر التتمش نے حملہ کر دیا ۔ قباچہ اب بے بس تھا ، اُس نے مایوسی میں دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈوب مرا۔

مقامی راجاؤں سے معاملہ

بنگال ، مرکز سے دُور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ حکمرانوں کے لیے مصیبت کا باعث رہا ۔ قطب الدین ایبک کے بعد یہاں پر کئی حکمرانوں نے مرکز سے بغاوت کی۔

التتمش نے شمال مغربی علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد بنگال کی طرف توجہ دی ۔ یہاں کے حکمران کو زیر اطاعت لانے کے بعد خراج دینے پر مجبور کیا مگر یہاں مرکزی حکومت کی ذرا سی عدم توجہی سے پھر بغاوت ہو جاتی ۔ آخر کار 1230ء میں التتمش خود ایک بھاری فوج لے کر بنگال آیا اور اسے باقاعدہ طور پر فتح کیا ۔ التتمش نے انتظام بہتر بنانے کے لیے بنگال اور بہار کو دو علٰحدہ علٰحدہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا ۔

راجپوت

ہندوستان کی عمومی تاریخ میں اور خاص طور پر مسلم دور میں بڑی اہمیت کے

حامل تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہندوستان کی حفاظت کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ اس جذبے کے تحت انھوں نے ہر دور میں عملی جدوجہد جاری رکھی۔ راجپوتوں کا خیال تھا کہ باہر سے آئے ہوئے حکمرانوں کو ہندوستان پر حکومت کا کوئی حق نہیں — ان کو ہندوستان سے نکالنے کو وہ اپنا فرض اوّلین سمجھتے تھے۔

التتمش کے دَور میں راجپوتوں نے ہندوستان کے شمال وسطی علاقوں میں اپنی قوت مجتمع کرلی تھی ۔ التتمش نے تمام مسائل سے فارغ ہوکر اس طرف توجہ دی اور راجپوتوں کے زیر تسلط کئی علاقوں کالنجر ، گوالیار ، جودھپور اور مالوہ وغیرہ پر کنٹرول حاصل کرلیا۔ یہ تمام کوششیں راجپوتوں کی قوت ختم کرنے کے لیے کافی نہ تھیں۔ تاہم التتمش کے حملوں کی وجہ سے ان کے جارحانہ عزائم اور سرگرمیوں میں کمی واقع ہو گئی۔

التتمش 25 سال حکومت کرنے کے بعد 1236ء میں انتقال کرگیا۔

تجزیہ

سلطان محمد غوری نے شمالی ہندوستان کو فتح کیا ، قطب الدین ایبک نے یہاں حکومت کی بنیاد ڈالی مگر اپنا کام ناتمام ہی چھوڑ کر انتقال کرگیا۔ التتمش نے ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کی بنیاد کو مضبوط بنایا اور اس حکومت کے خلاف سرگرم گروہوں کو تابع کیا۔

التتمش کے دورِ حکومت میں اہم سیاسی رجحانات کا تجزیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

1- وسطِ ایشیا کی سیاست سے قطع نظر ہندوستان پر حکومت کرنے کا اقدام قطب الدین ایبک نے کیا تھا۔ مگر اس کے دَور پر سیاسی رجحانات اور خاص طور پر یلدوز کی وجہ سے وہ وسطِ ایشیا کی ریاست میں اُلجھا رہا۔

التتمش نے وسط ایشیا سے علیحدگی کے نظریے کو اپنی پالیسیوں کا مرکز قرار دیا۔ خوارزم شاہ اور منگولوں کے معاملے میں اُس نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کرکے اگرچہ اپنے آپ کو غیر ضروری جنگ جوئی سے بچا لیا مگر اس کے ساتھ ہی اُس نے یہ بات بھی واضح

کر دی کہ اُسے وسط ایشیا کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ التتمش کے دَور میں ہندوستان کی حکومت وسط ایشیا سے الگ تھلگ ایک مقامی شناخت کے ساتھ ابھرتی نظر آتی ہے ۔

2- قطب الدین ایبک تک فتوحات کی نوعیت محض فوجی مقبوضات سے زیادہ نہ تھی ۔ ایسے علاقے سیاسی طور پر ایک مستحکم حکومت کی تعمیر میں معاون ثابت نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں حملہ آور کے خلاف مدافعت کا رجحان کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہتا ہے ۔ فوجی مقبوضات میں انتظامی طور پر ٹھہراؤ پیدا کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے ۔ سیاسی استحکام کے لیے ایبک کو ضروری وقت میسّر نہ آسکا تاہم التتمش نے مقبوضات میں انتظامی صورتحال کو بہتر بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہا ۔

3- التتمش نے جہاں سیاسی طور پر مختلف دھڑوں کو اپنے زیرِ اثر لانے میں کامیابی حاصل کی اسی طرح اُس نے انتظامی طور پر ایک نیا ڈھانچہ بنانے کی بھی کوشش کی ۔

عام طور پر اُس زمانے میں انتظامی ڈھانچہ جاگیرداروں کی معرفت استوار کیا جاتا تھا ۔ بادشاہ ہر علاقے میں جاگیرداروں کو انتظامی اختیارات دے دیتا تھا ۔ ایسی صورت میں طاقت زیادہ تر جاگیرداروں کے پاس مرتکز ہو جاتی تھی اور وہ اس سے سیاسی فائدے اٹھانے کی کوشش کرتے تھے ۔ التتمش نے جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ افسرانِ حکومت کا ایک ڈھانچہ بنایا ۔ ان افسران اور اہلکاروں کو ضروری اختیارات دے کر جاگیرداروں کی طاقت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ۔ انتظامی لحاظ سے یہ ایک نیا تجربہ تھا جس سے بعد میں آنے والوں نے خاصا فائدہ اٹھایا ۔

4- التتمش ذاتی طور پر اعلٰی درجے کا منتظم اور سیاست دان تھا ۔ اُس نے انھی خصوصیات کی بنیاد پر ہندوستان میں مسلم حکومت کے استحکام کے لیے حوصلہ افزا ماحول فراہم کیا ۔ اُس نے اپنی کوششوں میں تمام سیاسی گروہوں کی مدد حاصل کی اور سب نے مل جُل کر حکومت کو مضبوط بنایا ۔ اس دَور میں امراء جاگیرداروں اور بادشاہ کے درمیان اچھا ماحول رہا اور ان کے درمیان روایتی

چپقلش کم رہی ۔

یاد دہانی کے لیے اہم نکات

1- جب التتمش نے حکومت سنبھالی تو اُس کو داخلی اور خارجی ، دونوں اطراف سے مسائل کا سامنا تھا ۔ داخلی طور پر مقامی راجاؤں نے آزاد حکومتیں قائم کر لی تھیں اور خارجی طور پر غزنی کے حاکم یلدوز نے اسے پریشان کر رکھا تھا ۔ منگولوں کے حملے کا خطرہ اس کے علاوہ تھا ۔

2- التتمش نے خوارزم شاہ اور منگولوں کی باہمی لڑائی میں غیر جانبداری کا مظاہرہ کر کے ایک طرف اپنی حکومت کو بچا لیا اور دوسری طرف وسطِ ایشیا کی سیاست میں عدم دلچسپی کی پالیسی کا مظاہرہ کیا ۔ اس طرح اس نے کسی خارجی علاقے سے لاتعلق رہ کر مقامی طور پر ایک آزاد حکومت کے قیام کی کوششیں کی ۔

3- التتمش نے سیاسی اور انتظامی طور پر ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام کی بنیاد کو مضبوط کیا ۔

غوروفکر کے لیے نکات

الف 1- التتمش کی کن پالیسیوں کی بنا پر مسلم حکومت کو مضبوطی حاصل ہوئی ۔ تجزیہ کریں ۔

2- اگر آپ التتمش کی جگہ ہوتے اور آپ کو منگولوں کے ممکنہ حملے کا خدشہ ہوتا تو آپ کیسی پالیسی اپنانے کو ترجیح دیتے ۔ اپنی پالیسی کے حق میں ضروری حقائق بھی درج کریں ۔

ب ۔ مختصر جواب تحریر کریں ۔

(i) شمس الدین التتمش کی بادشاہ بننے سے پہلے زندگی کے بارے میں صرف تین اہم باتیں تحریر کریں ۔ ؟

(ii) التتمش کو بادشاہ بننے کے بعد داخلی طور پر کن مسائل کا سامنا تھا ۔ ؟

(iii) التتمش کو بادشاہ بننے کے بعد خارجی طور پر کن خطرات کا سامنا در پیش تھا ؟

(iv) منگول کون تھے ؟ انھیں اپنے داخلی اتحاد کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی ؟

(v) چنگیز خاں اور خوارزم شاہ کے مابین اختلافات کیونکر پیدا ہوئے ؟

(vi) التتمش کس حد تک اپنی وسطِ ایشیا سے غیر وابستگی کی پالیسی میں کامیاب رہا ؟

(vii) التتمش نے جاگیر داروں کے سیاسی اثر کو کم کرنے کے لیے کیا قدم اٹھایا ؟

دورِ انتشار

سلطان التتمش کے انتقال کے بعد ، دس سالوں میں ، اس کے خاندان کے چار سلاطین کو یکے بعد دیگرے قتل کر دیا گیا ۔ پانچواں حکمران امرأ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کھیلتا رہا ۔ بلبن نے ایک طاقت ور بادشاہ کے انداز میں اسے ہٹا کر حکومت سنبھالی اور ایک نئے خاندان کی حکومت شروع ہو گئی ۔ التتمش کے انتقال سے لے کر بلبن کے اقتدار سنبھالنے تک (1236-1266) کا دور سیاسی طور پر سخت انتشار کا دور تھا ۔ اس کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ تاریخی تسلسل کو سمجھنے میں دقت نہ ہو اور مختلف سیاسی رجحانات کا اندازہ ہو سکے ۔

التتمش نے دہلی کی حکومت کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کے لیے اپنے تربیت یافتہ غلاموں کا ایک گروہ تیار کیا تھا ۔ یہ لوگ اس کی زندگی میں بڑی محنت اور وفاداری کے احساس کے ساتھ خدمت کرتے رہے ۔ التتمش کے مرنے کے بعد اس کے پروردہ غلاموں میں سے چالیس نے ایک مؤثر سیاسی گروہ (1) کی صورت اختیار کر لی ۔ انھیں "امرائے چہلگان" کہا جاتا ہے ۔ یہ لوگ ترک نژاد تھے اور اپنے آپ کو نسلی طور پر اعلیٰ اور برتر خیال کرتے تھے ۔

امرائے چہلگان کے برعکس دوسرا گروہ غیر ترک امرأ کا تھا — یہ لوگ بھی مسلمان تھے اور اپنی قابلیت کی بنا پر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر پہنچ گئے تھے۔

1- تاریخ میں سیاسی اتار چڑھاؤ اور تبدیلی میں مختلف طبقوں کے گروہ اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں ۔ ان گروہوں میں کچھ گروہ خصوصی طور پر اپنی حیثیت یا مقام کی وجہ سے دوسروں کی نسبت زیادہ مؤثر اور فعال ہو جاتے ہیں ۔ ان کو سیاسی اصطلاح میں 'فشاری گروہ' (PRESSURE GROUPS) کہا جاتا ہے ۔ ان گروہوں کا تعلق سیاسی ، معاشرتی ، مذہبی یا معاشی شعبہ جات میں سے کسی ایک سے یا ایک سے زیادہ شعبہ جات سے ہو سکتا ہے ۔ انھی کی معرفت وہ عام لوگوں یا حکومتی طبقے پر اثر انداز ہو کر اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں ۔ قدیم زمانے کے گروہی اثر کی حیثیت اور کردار میں بدستور کوئی فرق نہیں آیا ، صرف ظاہری شکل بدل گئی ہے ۔

التتمش کے زمانے میں یہ دونوں گروہ متحدہ صورت میں حکومت کی خدمت کرتے رہے مگر اس کے انتقال کے ساتھ ہی دونوں میں اقتدار حاصل کرنے کی ہوس پیدا ہو گئی ۔ اس طرح ذاتی غرض مندی کی بنیاد پر یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے درپے ہو گئے ۔ ہوسِ اقتدار کی روش التتمش کے بعد آنے والے حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے اور بھی شدت اختیار کر گئی ۔ ہر دو گروہ کی خواہش تھی کہ ان کی پسند کا شخص حکمران بنے جو ان کے مفادات کا بہتر طور پر تحفظ کر سکے ۔

التتمش کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا فیروز شاہ تخت پر بیٹھا ۔ اس کو اقتدار میں لانے کے لیے صوبائی گورنروں نے بڑا کردار ادا کیا تھا ۔ دہلی اور اس کے گردونواح کے امرأ اس کی بہن رضیہ سلطانہ کو اقتدار میں لانے کے خواہش مند تھے ۔ فیروز شاہ ایک مہم کے سلسلے میں جب دہلی سے رخصت ہوا تو ان امرأ نے رضیہ سلطانہ کو دہلی کا حاکم بنا دیا ۔

رضیہ سلطانہ — ہندوستان کی پہلی خاتون حکمران

رضیہ سلطانہ کے اقتدار سنبھالتے ہی اسے اقتدار میں لانے والے امرأ اور رضیہ سلطانہ کے درمیان سیاسی رسہ کشی شروع ہو گئی ۔ ترک امرأ اور افسران رضیہ سلطانہ کو حکومتی معاملات میں اپنا پابند رکھنا چاہتے تھے مگر رضیہ سلطانہ اپنے باپ کے اندازِ بادشاہت (1) پر عمل کرتے ہوئے تمام تر معاملات پر اپنا کنٹرول برقرار رکھنا چاہتی تھی ۔

بعض مؤرخین کی رائے میں اس وقت رضیہ سلطانہ کا نقطۂ نظر درست تھا کیوں کہ ایک کم سن سلطنت کے انتظام کے لیے مرکزی طاقت کا مضبوط ہونا اشد ضروری تھا ۔ اس صورت میں کسی قسم کی بھی انتظامی اور سیاسی صورتحال سے بہتر طور پر نمٹنا آسان ہو سکتا تھا ۔

1- التتمش نے ہندوستان میں ایرانی اندازِ بادشاہت کی بنیاد رکھی ۔ اس میں زیادہ سے زیادہ اختیارات اور طاقت بادشاہ کے ہاتھ میں ہی مرتکز ہوتی تھی ۔

ترک امرا اپنی ذاتی غرض مندی اور مفادات کو ملکی مفادات پر فوقیت دے رہے تھے اور انھوں نے رضیہ سلطانہ کے خلاف سازشوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا ۔ ابتدائی سازشوں کو رضیہ سلطانہ نے امرا میں پھوٹ ڈلوا کر بے اثر کیا ۔

ان سازشوں کو ناکام کرنے کے بعد رضیہ سلطانہ نے مضبوط انتظام کو قائم کرنے کی کوشش کی ۔ اس انتظامی ڈھانچے میں ، اس نے اپنے معتمد لوگوں کو بنیادی اور اہم عہدے دیے ۔

اس دور میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں قابلیت اور اہلیت کے اعتبار سے کم درجہ سمجھا جاتا تھا اور اس کو ثابت کرنے کے لیے مخصوص قسم کی دلیلیں دی جاتی تھیں ۔ رضیہ سلطانہ نے اس تاثر کو ختم کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ عورت مرد کے مقابلے میں یکساں طور پر ہر کام کے لیے اہل ہے ، پردہ کرنا ترک کر دیا ۔ وہ مردانہ لباس میں دربار لگاتی ، شکار کھیلتی اور فوجی مہمات میں گھوڑے پر سوار ہو کر کمان سنبھالتی ۔

رضیہ سلطانہ سیاسی سوجھ بوجھ کی مالک تھی اور اس لحاظ سے وہ اپنے حریفوں پر حاوی تھی ۔ اس نے اپنے حریفوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے کھلم کھلا کارروائی کرنے کی بجائے مخفی طریقوں سے کام لیا ۔ دہلی اور اس کے اردگرد رضیہ سلطانہ کے وفادار امرا کی اکثریت تھی ، اس لحاظ سے یہاں اسے مات دینا ممکن نہ تھا ۔ ریاست بٹھنڈہ پر ایک ترک سردار ، ملک التونیہ کی حکومت تھی ۔ اس نے مرکز کے خلاف بغاوت کر دی ۔ رضیہ سلطانہ نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے مسندِ حکومت سے کوچ کیا ۔ اس کی مسند حکومت سے غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر ترک سرداروں نے بغاوت کر کے اس کے معتمد ساتھیوں کو قتل کر دیا ۔ رضیہ سلطانہ کو قید کر لیا گیا ۔

اب دہلی کی حکومت پر التتمش کے ایک بیٹے بہرام کو تخت نشین کروا دیا گیا ۔ بعد میں ترک سرداروں نے نئے بادشاہ کو اپنے مفادات کے تناظر میں بہتر نہ پاتے ہوئے قتل کروا دیا ۔

ملک التونیہ ، اپنے ساتھیوں کے رویے سے غیر مطمئن تھا ۔ وہ اپنے سیاسی عزائم کے حصول کا خواہاں تھا ۔ اس سلسلے میں اس نے رضیہ سلطانہ سے شادی کر لی ۔ رضیہ

سلطانہ پہلے ہی سیاسی طور پر بدحال تھی ۔ اس نے بھی سیاسی ضرورت کے تحت شادی کرنا قبول کر لیا ۔ ملک انطونیہ نے مقامی لوگوں پر مشتمل ایک لشکر سے دہلی پر قبضے کے لیے پیشقدمی شروع کر دی ۔ لشکر کے سپاہیوں نے جنگ کے وقت اس سے غداری کی ۔ دہلی کی افواج نے ملک انطونیہ کو شکست دی ۔ اس جنگ میں ملک انطونیہ ور رضیہ سلطانہ ، دونوں ہی قتل کر دیے گئے ۔

ناصرالدین محمود — ایک کٹھ پتلی حکمران

رضیہ سلطانہ کے قتل کے بعد امرأ نے اس کے بھائی بہرام شاہ کو تخت نشین کیا ۔ اس تخت نشینی کے لیے پیشگی شرط یہ تھی کہ نیا بادشاہ تمام تر انتظامی طاقت اور اختیارات ایک نائب مملکت کے سپرد کرے گا اور نائب مملکت ترک امرأ اپنی مرضی سے منتخب کریں گے ۔

تخت نشینی سے پہلے بہرام شاہ نے ترک امرأ کی یہ شرط منظور کرلی مگر بادشاہ بننے کے بعد اس نے اس شرط پر عمل کرنے سے انکار کر دیا ۔ اس پر بہرام شاہ کو برطرف کر دیا گیا ۔

بہرام شاہ کے بعد اس کے کم سن بیٹے مسعود شاہ کو تخت نشین کیا گیا۔ مسعود شاہ جیسے کم سن اور بے اثر بادشاہ کی تخت نشینی محض علامتی تھی۔ اس کا مطلب محض یہ تھا کہ شہنشاہیت التتمش کے خاندان میں ہی رہے۔

یہاں یہ بات بہت اہم ہے کہ اس دور میں ترک امرأ سیاسی طور پر بے حد مضبوط اور مؤثر ہو چکے تھے ۔ بادشاہ گری ان کے لیے ایک مشغلہ بن چکی تھی اور کسی بھی بادشاہ کو ان کے مفادات کے خلاف چلنے کی اجازت نہ تھی ۔ ایسی صورتحال میں امرأ کے مفادات بہت بلند ہو رہے تھے اور ان کے انہی مفادات کی بنا پر ذاتی چپقلش کی فضا بڑھ رہی تھی ۔ یہ لوگ التتمش کے وارثوں میں سے کسی کم سن یا نااہل فرد کو بادشاہ تو تسلیم کر سکتے تھے مگر اپنے گروہ میں سے کسی کو بادشاہ برداشت نہ کر سکتے تھے ۔

مسعود شاہ کے اقتدار میں آنے کے لیے امرأ کی یہ شرط تھی کہ تمام تر طاقت امرأ چہلگاں کے ہاتھ میں رہے۔ اس سے ان امرأ کے درمیان باہمی تضادات اور اختلافات اس قدر زیادہ اور گہرے ہو چکے تھے کہ ان کی اجتماعی کوششیں بے اثر ہونے لگیں۔ اس طرح ان کی مجموعی سیاسی ساکھ اور قوت میں دراڑیں پڑنے لگیں۔

ان سیاسی حالات سے ایک ترک امیر بلبن نے فائدہ اٹھایا ۔ یہ امرأ چہلگان سے ایک تھا ۔ بلبن نے اپنی سیاسی پوزیشن بہتر بنا لی اور اسے عملی شکل دینے کے لیے

1246ء میں مسعود شاہ کو برطرف کر کے اس کی جگہ التتمش کے سب سے چھوٹے بیٹے ناصرالدین محمود کو تخت نشین کروا دیا۔

ناصرالدین محمود کا دورِ حکومت 1246ء سے 1266ء تک رہا۔ ناصرالدین محمود حکومتی معاملات کی بجائے ذاتی معاملات اور اشغال میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ حکومتی معاملات کی ذمے داری زیادہ تر امرأ کے ہی سپرد تھی۔

اس دور میں ترک اور مقامی امرأ کے درمیان چپقلش بہت واضح نظر آتی ہے۔ بلبن ترک امرأ میں سے تھا۔ ناصرالدین محمود کے ابتدائی دور حکومت میں بلبن تمام امورِ سلطنت کا منتظم اعلیٰ تھا۔ ناصرالدین محمود اور بلبن کے درمیان باہمی اعتماد کافی مضبوط تھا۔ بلبن نے اپنی بیٹی کی ناصرالدین محمود سے شادی کر کے اس تعلق کو اور مضبوط بنا لیا تھا۔ بلبن نے ملک میں موجود شورش اور بدانتظامی کو ختم کیا اور اس سے ناصرالدین محمود کے سامنے اس کی عزت اور وقار اور بھی بڑھ گیا۔

بلبن کی اس طاقتور حیثیت سے ناصرالدین محمود کے بھائی اور ماں سخت نالاں تھے۔ مقامی امرأ نے ان کے سامنے اس معاملے کو اور بھی اچھالا۔ ان لوگوں میں ایک خواجہ سرا ابوریحان خاص طور پر سرگرم تھا۔ ناصرالدین محمود پر اس قسم کے خیالات کا خاطرخواہ اثر ہوا اور اس نے بلبن کو معزول کر دیا۔ بلبن کو مرکز سے دور ایک جاگیر عطا کر دی گئی۔

غیر ترک امرأ کے اقتدار سے ترک امرأ کے مفادات کو سخت زک پہنچی۔ ان امرأ نے بادشاہ پر پھر سے دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں کئی سازشوں کا انتظام بھی کیا گیا۔ ناصرالدین محمود بنیادی طور پر کمزور شخصیت کا مالک تھا۔ ترک امرأ کے دباؤ سے خائف ہو گیا اور اس نے بلبن کو دوبارہ وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ دے دیا۔

اَب بلبن پہلے کے مقابلے میں اور بھی مضبوط وزیر کے طور پر سامنے آیا۔ اس نے اپنی سیاسی ساکھ اور اثر کو بڑھانے کے لیے اہم عہدوں پر اپنے قریبی عزیزوں اور معتمد ساتھیوں کو فائز کرنا شروع کر دیا۔ جو لوگ کسی طور بھی اس کی مخالفت کرتے تھے ان کو قتل کروا دیا گیا۔

1266ء کو ناصر الدین محمود کا اچانک انتقال ہو گیا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اسے بلبن نے زہر دے کر مروا دیا تھا۔ چونکہ ناصر الدین محمود کا کوئی بیٹا نہ تھا، اس لیے اقتدار کی باگ ڈور باقاعدہ طور پر بلبن کے سپرد ہوئی۔

یاد دہانی کے لیے اہم نکات

1- التتمش کے انتقال کے بعد ہندوستان میں مسلم حکومت میں شدید انتشار کا دور شروع ہوا، اور بلبن کے اقتدار سنبھالنے تک جاری رہا۔

2- دور انتشار میں (1236 — 1266ء) ترک اور مقامی امرأ نے اپنے مفادات کی خاطر آپس میں سیاسی جنگ لڑی اور وہ یکے بعد دیگرے کئی ایک حکمران بدلتے رہے۔

3- رضیہ سلطانہ ہندوستان کی پہلی خاتون حکمران تھی، جو اعلیٰ سیاسی بصیرت کی حامل تھی، مگر امرأ کی سازشوں کا شکار ہو گئی۔

4- اس دورِ انتشار کے اختتام تک بلبن ایک طاقتور بادشاہ کے طور پر ابھرا۔

غور و فکر کے لیے چند سوالات

الف ۔1- التتمش کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی حالات میں امرأ کا کردار ذاتی مفادات کے حصول پر مبنی تھا۔ آپ کے خیال میں یہ کردار کیا درست تھا؟ واقعاتی طور پر تجزیہ کریں۔

2- رضیہ سلطانہ ایک قابل حکمران تھی مگر ناکام رہی، محرکات کا جائزہ لیں۔

3- اگر آپ اس دورِ انتشار میں ایک ترک امیر ہوتے تو آپ کیا اقدام کرنا پسند کرتے؟ اپنے اقدام کے حق میں دلائل دیں۔

ب ۔ مختصر جواب دیں۔

(i) التتمش کے انتقال کے بعد پیدا ہونے والا دورِ انتشار کب تک جاری رہا؟

(ii) امرائے چہلگاں کون تھے؟

(iii) فشاری گروہ (Pressure group) سے کیا مراد ہے ۔ تاریخ میں ان کا کیا کردار ہوتا ہے ؟

(iv) ترک اور غیر ترک امرأ کے مابین تصادم کے محرکات کیا تھے ؟

(v) التتمش کے بعد بلبن تک سلطنتِ دہلی پر کون کون سے بادشاہ متمکن رہے؟ نام اور دورِ حکومت کی نشاندہی کریں؟

واقعاتی تسلسل

1- قطب الدین ایبک کا دور حکومت ——— 1210-1206ء

2- التتمش کی تخت نشینی ——— 1211ء

3- یلدوز کی شکست ——— 1216ء

4- چنگیز خان کی ہندوستان آمد ——— 1221ء

5- قباچہ کی شکست ——— 1228ء

6- التتمش کی وفات ——— 1236ء

7- رضیہ سلطانہ ——— 1240-1236ء

8- ناصر الدین محمود کی تخت نشینی ——— 1246ء

9- ناصر الدین محمود کا انتقال ——— 1266ء

کتابیات

1- آبِ کوثر مصنفہ ایس ۔ ایم ۔ اکرام

2- The foundation of Muslim Rule in India

by A.B.M. Habibullah

Central Book Depot,

Allahabad, 1962

3- طبقاتِ ناصری مصنفہ — منہاج سراج

مترجم — غلام رسول مہر

مطبوعہ اردو سائنس بورڈ، لاہور 1985ء

6

ہندوستان میں مسلم حکومت کا استحکام

پس منظر

ایک طویل عرصے کے بعد محمود غزنوی کے حملوں سے دنیا میں ہندوستان کے بارے میں ناقابل تسخیر ہونے کا تأثر ختم ہوگیا۔ اس کے قریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد سلطان محمد غوری نے ہندوستان پر حملے کر کے بہت سے علاقے فتح کیے۔ ان مفتوحہ علاقوں میں اس کے ایک نائب قطب الدین ایبک نے مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی۔ قطب الدین ایبک اس کام کو مکمل کیے بغیر چل بسا اور سلطان التتمش نے اس کام کو حقیقی معنوں میں پورا کیا۔ اس نے سلطنت دہلی کی حکومت کی بنیاد کو مضبوط بنایا۔ اس کام میں اسے امرأ کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔

التتمش کے بعد ایک طویل عرصے تک ترک اور مقامی امرأ کے درمیان اپنے مفادات کے لیے سیاسی چپقلش جاری رہی۔ اس دور کو مفاد پرست امرأ کے اقتدار کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ چپقلش بنیادی طور پر ان دونوں گروہوں کے درمیان نسلی برتری کو ثابت کرنے کی بھی ایک کوشش تھی۔ اس دور میں کئی حکمران آئے اور انھیں برطرف یا قتل کر دیا گیا۔ اس دور کا خاتمہ ایک طاقتور بادشاہ کے نمودار ہونے پر منتج ہوا۔

بلبن انھی ترک امرأ میں سے ایک تھا جو اپنے سیاسی مفادات کے لیے سرگرم تھے۔ اس نے تمام سیاسی احوال کو پوری گہرائی کے ساتھ سمجھا اور نہایت احتیاط سے ایک حکمتِ عملی بنا کر، اس پر عمل کیا۔ وہ امرأ کے داخلی حالات اور داؤ پیچ کو بہتر طور

پر سمجھتا تھا اور اسی کی بنیاد پر اس نے تمام ممکنہ خطرات کو ختم کیا ۔ اس نے نہ صرف اپنے مخالفین کو اپنے راستے سے ہٹایا بلکہ ایک نظامِ حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ۔ جو اس کی سیاسی بصیرت اور خواہشات کا آئینہ دار تھی ۔

بلبن کے دورِ حکومت سے سلطنتِ دہلی میں استحکام کے رجحانات ابھرنا شروع ہوئے ۔ یہاں یہ بات نہایت اہم ہے کہ التتمش سے ناصرالدین محمود تک کے درمیانی عرصے میں مسلم حکومت میں داخلی طور پر انتشار ضرور تھا اور کوئی بھی خارجی یا مقامی دباؤ یا خطرہ اس حکومت کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا ۔ یہ عرصہ خاص طور پر مقامی راجاؤں کے لیے بہتر نتائج کا حامل ہو سکتا تھا ، مگر مقامی راجاؤں کے باہمی نفاق کے باعث ایسا ممکن نہ ہو سکا ۔

اس دورِ انتشار میں مسلم حکومت میں حکومتی عدم استحکام کے باعث انتظامی ڈھانچہ غیر مؤثر ہو چکا تھا اور اس کا اثر پیداواری ذرائع پر بھی پڑ رہا تھا ۔

بلبن نے ایسے اقدامات پر عمل کرنا شروع کیا ، جن سے مجموعی پیداواری صورتحال ، امن و امان اور سیاسی حالات میں بہتری پیدا ہوئی ۔ انہی کی بنیاد پر آئندہ آنے والی حکومتوں نے مزید فائدہ اٹھایا اور مسلم حکومت کو ٹھوس بنیادوں پر استحکام نصیب ہوا ۔

کسی بھی حکومت کے استحکام کے لیے درج ذیل عناصر ایک بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں :-

1- ملک میں سیاسی استحکام ہو تو انتظامی معاملات میں بہتری کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں ۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے مختلف گوشوں میں سرگرم سیاسی گروہوں کا اعتماد حاصل کیا جائے یا ان کی سرگرمیوں کو دبا دیا جائے ۔

2- داخلی یا خارجی انتشار یا خطرے سے بچنے کے لیے مضبوط دفاعی نظام کا قیام عمل میں لایا جائے ۔

3- کوئی بھی حکومت مندرجہ بالا دونوں امور یعنی سیاسی استحکام اور مضبوط فوج کے قیام میں اگر کامیاب ہو جائے تو پھر معاشرتی اور حکومتی نقطۂ نظر سے تمام شعبہ

جات زندگی میں انتظامی طور پر بہتری لانا ضروری ہوتی ہے تاکہ پیداواری وسائل میں اضافہ ہو ۔ اس سطح پر تمام شعبہ جات کے معاملات کو بدلتی ضرورتوں کے مطابق ہم آہنگ کرنے کے لیے اصلاحات کی جاتی ہیں ۔

بادشاہوں کے دور میں حکومتی استحکام کے زمرے میں عوامی بہبود کو خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی ۔ بادشاہوں کے نزدیک ان کی بادشاہت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری سیاسی و انتظامی اقدامات کرنے اور ان میں کامیاب ہو جانے کا نام ہی استحکام تھا ۔ ایسے بادشاہوں کی مثال بہت کم ملتی ہے جو عوامی رفاہ اور بہبود کو بھی حکومتی استحکام کے بنیادی تقاضوں میں شامل کرتے ہوں ۔

غیاث الدین بلبن

(1266ء - 1287ء)

"سلطان (بلبن) نے حکم دیا کہ ایک لائق حساب رکھنے والے کو دربار میں پیش کیا جائے، --- کمال مہیار کو منتخب کیا گیا اور اسے تخت کے سامنے پیش کیا گیا۔ کمال مہیار جس وقت زمین بوسی (1) کر رہا تھا، سلطان بلبن نے کارکنانِ دربار سے کہا کہ اس سے دریافت کرو کہ یہ مہیار غظ کیا ہے اور کس سے نسبت رکھتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرے باپ کا نام مہیار ہے اور وہ ہندو غلام تھا۔ جوں ہی یہ بات بادشاہ کے کان تک پہنچی، وہ فوراً دربار سے اٹھ کھڑا ہوا اور خلوت میں چلا گیا۔ ہیبتِ سلطانی سے کارکنانِ دربار نے اندازہ لگا لیا کہ سلطان کو غصہ آگیا ہے۔ اب نامعلوم وہ کیا کرے گا! --- ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ افسرانِ سلطنت کو خلوت خانے میں طلب کیا گیا۔ ان سے کہا کہ میں نے آج دربار کے انچارج کے ساتھ اسقدر تحمل کا برتاؤ کیا ہے کہ اپنے باپ کے ساتھ بھی نہ کرتا۔ ان لوگوں نے ایک کم اصل اور نااہل غلام زادے کو منتخب کر کے میرے سامنے پیش کیا۔ میں افراسیاب (ایران کا ایک بادشاہ) کی اولاد سے ہوں — میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ایک خصوصیت بخشی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں کسی کم اصل، کمینے، رذیل اور ذلیل کو کسی شغل، مرتبے یا عزت کی جگہ پر نہیں دیکھ سکتا، اور جوں ہی اس قسم کے لوگ میرے سامنے آتے ہیں، میرے جسم کی تمام رگوں میں خون حرکت میں آجاتا ہے۔"

(تاریخ فیروز شاہی)

1- بادشاہ کے سامنے آداب بجا لاتے وقت لوگ اس قدر جھک جاتے تھے کہ اس کو زمین بوسی یا خاک بوسی کہا جانے لگا

ویسے تو تمام بادشاہ اپنے طرز حکومت اور مزاج کے اعتبار سے حاکمیت پسند(1) ہوتے ہیں ، بلبن کا اندازِ حکومت اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی قوی اور منفی نظر آتا ہے ۔ تاہم ، بلبن کے اس اندازِ حاکمیت میں اس کے ماحول اور حکومتی ضروریات کو بڑا عمل دخل حاصل تھا ۔ انہی کے تناظر میں درست صورتحال واضح ہو سکتی ہے ۔

1- حاکمیت پسندی، (AUTHORITARIANISM) :- کسی بھی کام یا مقصد کی انجام دہی میں ایک فرد یا گروہ سے غیر ضروری طور پر جبر یا سختی سے کام لینا ، اور اس میں ان کی انسانی حیثیت تک کو بھلا دینا ، حاکمیت پسندی کہلاتا ہے ۔

کسی بھی انتظام کو بہتر طور پر چلانے کے لیے کسی حد تک کنٹرول کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جیسا کہ ایک باپ یا استاد بچے کی تربیت میں کسی حد تک کنٹرول یا رعب سے کام لیتا ہے ۔ اس میں مقصد بچے کو غیر ضروری مصروفیات اور منفی رجحانات سے بچانا ہوتا ہے ۔ اگر یہ رعب صرف دبانے اور ڈرانے تک محدود ہو جائے تو بچے کی شخصیت پر مُضر اثرات مرتب ہو گے ۔

اسی قسم کی مثال کو اگر وسیع پیمانے پر دیکھا جائے تو بادشاہت ، آمریت یا اس قسم کے اندازِ حکومت سامنے آتے ہیں ۔ ایسے نظامات میں انتظام کے لیے لوگوں کی خواہش اور ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ملکی انتظامات میں شامل نہیں کیا جاتا ۔ بادشاہ یا آمر اپنی مرضی ، ضرورت اور مفاد کے تحت انتظام چلاتا ہے ۔ چونکہ اس میں عام لوگوں کی خواہشات کا احترام نہیں ہوتا ، اس لیے عوام کے ردّعمل کو دبانے کے لیے ان پر جبر یا سختی کے اقدامات کر کے حکومت کی جاتی ہے ۔ ایسے اقدامِ جبر اور خوف سے لوگوں میں بادشاہ یا آمر کے خلاف اٹھنے کی ہمت میں وقتی طور پر کمی آ جاتی ہے ۔

ایسے نظام میں ، جس کی بنیاد ظلم اور جبر پر ہو ، لوگوں کی کام کرنے کی قابلیت اور ان کی خوشیاں متاثر ہوتی ہیں۔ عام انسانوں کی حیثیت انسانی سطح سے گر کر محض ایک 'آلۂ کار' کی رہ جاتی ہے جس میں وہ ایک فرد (حکمران) کے لیے کام کرتے ہیں اور ان کی مرضی یا خواہش کا احترام نہیں ہوتا ۔

جب بنیادی ڈھانچہ حاکمیت پسندانہ ہو جائے تو زندگی کے تمام شعبہ جات میں اس کا اثر پڑتا ہے ۔ ہر شخص جہاں ممکن ہو اور جہاں اس کا اختیار چل سکے اپنے ماتحتوں پر جبر کرے گا ۔ اس طرح یہ منفی رجحان پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے ۔

بلبن ، ـــ غلام سے بادشاہ تک

بلبن نسلاً ترک تھا ۔ اس کا باپ ایک قبیلے کا سردار تھا ۔ بلبن ابھی جوانی میں قدم رکھ ہی رہا تھا کہ منگولوں کے ایک حملے کے دوران گرفتار ہوگیا ۔ منگولوں نے اسے غلام بنا کر بیچ ڈالا ۔ بعد ازاں سلطان التتمش نے اسے خرید لیا ۔ سلطان التتمش نے بلبن کو اس کی قابلیت کی بنیاد پر اپنے خاص غلاموں (امرائے چہلگان) میں شامل کر لیا ۔ بلبن کو ایک اہم عہدہ بھی دیا گیا ۔

التتمش کے انتقال کے بعد دورِ انتشار میں بلبن نے رضیہ سلطانہ کی مخالفت کی ۔ بہرام شاہ اور مسعود شاہ نے اس کو جاگیریں اور اہم عہدوں پر فائز کیا ۔ اسی مقام سے بلبن نے سیاسی طور پر اہم حیثیت حاصل کرنا شروع کر دی ۔ اس نے مسعود شاہ کے خلاف سازش کر کے ناصرالدین محمود کو تخت نشین کروانے میں اہم کردار ادا کیا ۔

ناصرالدین محمود کے عہدِ حکومت میں بلبن ایک طاقت ور نائبِ سلطنت کے طور پر کام کرتا رہا ۔ اس نے قریباً ایک سال کے وقفے کے علاوہ قریباً بیس سال نہایت طاقتور وزیر کے طور پر حکومت کی ۔ اس دور میں ناصرالدین محمود محض ایک کٹھ پتلی حکمران تھا ۔

ناصرالدین محمود کے انتقال کے بعد ، بلبن باقاعدہ طور پر تخت نشین ہوا ۔

اہم مسائل :

سلطان بننے سے پہلے ، اگرچہ بلبن نے عملی طور پر ایک طویل عرصے کے لیے حکومت کی مگر اس کی نوعیت ، سلطان بااختیار بننے سے مختلف تھی ۔ اب وہ خودمختار بادشاہ تھا اور اپنی سلطنت کے امور کو ایک مختلف تناظر میں دیکھتا تھا ۔

بلبن کے سامنے یہ مسائل خصوصی اہمیت کے حامل تھے ۔

1- بادشاہ ، اُس زمانے میں پوری سلطنت کی سرگرمیوں اور طاقت کا مرکز سمجھا جاتا تھا ۔ بادشاہ یا بادشاہت کا ادارہ اگر مضبوط ہوتا تھا تو انتظامی سطح پر ایک مؤثر نظام چلتا رہتا تھا ۔ اس سے سیاسی طور پر بھی معاملات قابو سے باہر نہ جاتے

تھے ۔ بادشاہت میں کمزوری کا مطلب خطرات کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا تھا ۔

سلطان التتمش کے انتقال کے بعد امرأ کے درمیان چپقلش سے بادشاہت کا ادارہ حد درجہ متأثر ہو رہا تھا ، امرأ اپنے مفادات کے تحت جسے چاہتے بادشاہ بنا دیتے تھے ۔ بادشاہ اگر ان کے مطابق نہ چلتا تو اس کو برطرف یا قتل کر دیا جاتا تھا ۔ ان منفی رجحانات کے باعث انتظامی ڈھانچہ تو متأثر ہو ہی رہا تھا ، مجموعی سیاسی اور معاشی صورتحال بھی بگڑ رہی تھی ۔

اگرچہ بادشاہت کے ادارے کو کمزور کرنے میں بلبن نے بھی بحیثیت ایک امیر کے اہم کردار ادا کیا تھا اور اس انحطاط میں دوسرے امرأ کے ساتھ وہ بھی برابر کا ذمے دار تھا تاہم بلبن نے سلطان بننے کے بعد بادشاہت کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری اقدام کیے :۔

اس ضمن میں امرأ کے کردار کو بہتر بنانا اشد ضروری تھا ۔ بلبن نے چونکہ ان کے کردار اور سرگرمیوں کو قریب سے دیکھا تھا ، اس لیے وہ ان کے منفی اثرات کو بخوبی سمجھتا تھا ۔

2- التتمش اور اس کے بعد دورِ انتشار میں منگولوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا ۔ التتمش کی بہتر حکمتِ عملی کے باعث منگولوں کا خطرہ ٹل تو گیا مگر 1241ء میں منگولوں نے پھر حملہ کیا اور لاہور کو تباہ و برباد کر دیا ۔

چنگیز خان کے بعد ہلاکو خان منگولوں کا سردار تھا اور اس نے 1258ء میں عباسی حکومت کا مرکز بغداد تاراج کر دیا تھا ۔ یہ قیاس عام تھا کہ ہلاکو خان کسی وقت بھی ہندوستان پر حملہ کر سکتا ہے ۔ اس ضمن میں ضروری حفاظتی اقدام ضروری تھے ۔

3- دورِ انتشار میں انتظامی کمزوریوں کے باعث بنگال کا صوبہ آزاد حیثیت اختیار کر چکا تھا ۔ التتمش نے اپنے دور حکومت کے آخری سالوں میں اسے فتح کیا تھا ۔ اب خدشہ بڑھ گیا تھا کہ مرکز کی کمزوری کو دیکھ کر کہیں دوسرے صوبے بھی بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائیں . ان میں راجپوتوں کے صوبے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

بلبن کی حکمتِ عملی اور کارروائیاں

بلبن کو اس کے کٹھن ، ذاتی تجربات نے ایک باعمل اور ہوشیار انسان بنا دیا تھا ۔ وہ کسی بھی معاملے کو نہایت گہرائی سے سمجھتا اور پھر ایک حقیقت پسندانہ پالیسی بناتا ۔ یہ پالیسی اس کے ذاتی مفادات کے عین مطابق ہوتی تھی ۔ وہ اپنی پالیسیوں پر نہایت سختی سے عمل کرواتا تاکہ زیادہ سے زیادہ مقاصد حاصل ہو سکیں ۔

بلبن نے سلطان بنتے ہی یہ بات شدّت سے محسوس کر لی تھی کہ اسے سلطنت میں توسیع پسندی سے گریز کرنا چاہیے ۔ اس نے سلطنت کے موجودہ علاقہ جات کو مستحکم انتظامی کنٹرول میں لانے کی کوشش کو فوقیت دی ۔ اُس نے اس تناظر میں ایسے اداروں کے قیام اور ترقی پر زور دیا جو اس کی حکومت کے لیے مالی اور سیاسی طور پر کارآمد ہو سکتے تھے ۔

بلبن کے اہم اقدامات یہ ہیں :

1- بادشاہت کا ادارہ : بلبن نے سلطنت کے سب سے اہم اور مرکزی ادارے 'بادشاہت' کو ایک نیا انداز اور شکل دی ۔ بادشاہت کے بارے میں اس کا اپنا ایک مخصوص نظریہ تھا ۔ اس کے بارے میں تاریخ فیروز شاہی میں اس کا قول اس طرح درج ہے ۔

> "نبوّت کے بعد خلقِ خدا کی خدمت کا سب سے عمدہ ذریعہ بادشاہت ہے ۔ اس (بادشاہت) کے حقوق کا پاس ضروری ہے اور جو بادشاہ اپنا جاہ و حشم ، رعب و دبدبہ قائم نہیں رکھتا وہ اپنے فرائض پوری طرح نہیں بجا لا سکتا، تو رعایا بغاوت اور دوسری خرابیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔"

بادشاہت اور بادشاہ کے دبدبے اور رعب کو عملی شکل دینے کے لیے دربار میں مخصوص رسوم اور طریقے اختیار کیے گئے ۔ ان تمام رسومات کا مقصد ایسا ماحول استوار کرنا تھا جو عام لوگوں میں بادشاہ کے بارے میں نہایت گہرائی سے خوف اور رعب پیدا

کریں ۔ تاریخ فیروزشاہی میں بلبن کے دربار اور جلوس کی منظر کشی اس طرح کی گئی ہے

" اس نے بہت سے سیستانی پہلوان مقرر کیے ہوئے تھے ، جو ننگی تلواریں کاندھوں پر رکھے ہوئے اس کے ہم رکاب ہو کر چلتے ۔ چنانچہ جلوسِ سواری کے وقت اس کا چمکدار چہرہ بھی چمکتا اور ننگی تلواریں بھی چمکتیں اور آفتاب کی روشنی کے عکس میں یہ چمکتی ہوئی ننگی تلواریں اور سلطان کا چمکتا ہوا چہرہ ایک کی بجائے سو سو نظر آتے ۔ تماشائیوں کی آنکھوں میں پانی آ جاتا اور وہ تاریک ہو جاتیں اور وہ اس کے جلوس ، سواروں کی شان اور دبدبے کو دیکھ کر اس کی تعریف کرتے ---- (وہ اپنے افسران کے بیچ) اس طرح تخت پر بیٹھتا کہ اس کے رعب سے لوگوں کے دل کانپ جاتے ۔ اکثر دور دراز علاقوں کے سفیر اور راجہ جب دربار میں آتے تو انھیں زمین بوسی کروائی جاتی ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے — سو سو کوس سے (لوگ) دربار اور جلوس کی شان و شوکت دیکھنے کی غرض سے آتے اور اسے دیکھ کر متحیّر اور متعجب رہ جاتے ۔"

بلبن کا خیال تھا کہ ممکنہ طور پر رعایا اور معمولی نوعیت کے اہلکاروں سے دوری اختیار کی جائے تاکہ دوری سے ان کے دلوں میں بادشاہ کا خوف اور وقار برقرار رہے ۔ اس کے خیال میں انتظامی لحاظ سے یہ نہایت ضروری تھا ۔

بلبن اپنی گھریلو زندگی میں بھی اپنے رعب کا خیال رکھتا تھا ۔ تاریخ فیروزشاہی میں درج ہے کہ اُس نے اپنی تمام مدّتِ بادشاہی میں کسی مجلس میں قہقہہ نہیں لگایا ۔ اس کے سامنے کسی کی جرات نہ تھی کہ وہ کھل کر ہنسے ۔ وہ اپنے آپ پر اس قدر جبر کرتا تھا کہ جب اسے اس کے بڑے بیٹے کی وفات کی خبر سنائی گئی تو اُس وقت وہ دربار میں تھا ۔ اس نے اس خبر کے سننے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہ دیا اور حسبِ معمول دن بھر کام کرتا رہا ۔ تاہم تخلیے میں جا کر اس نے اپنے بال نوچے اور جی بھر کے رُویا ۔

بلبن اپنے نظریۂ بادشاہت کو عملی طور پر قائم کرنے میں کامیاب رہا ۔ اس کے رعب کا یہ عالم تھا کہ اس کی سلطنت میں کوئی شخص اس کی مرضی کے بغیر کام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا ۔

2- امرأ سے معاملہ : بلبن کو کسی قسم کا بھی ممکنہ خطرہ امرائے چہلگان سے ہو سکتا تھا ۔ چونکہ بلبن نے اپنی بادشاہت کو مضبوط کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا ، اس لیے وہ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو ہٹانا چاہتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اگر امرأ کو ذرا بھی ڈھیل دی گئی تو وہ اس کے خلاف سازش کرنے سے نہ چُوکیں گے ۔

بلبن کے بادشاہ بننے تک اس کے کئی ساتھی اور سیاسی طور پر مؤثر امرأ یا تو مر چکے تھے یا اقتدار سے الگ ہو چکے تھے ۔ بلبن نے زندہ امرأ میں سے کئی کو سرِعام کوڑے لگوائے اور انھیں لوگوں کے سامنے ذلیل کروایا ۔ کئی کو زہر دے کر یا پھانسیاں دے کر راستے سے ہٹایا ۔ قصہ مختصر یہ کہ بلبن نے اپنے سامنے کسی بھی قابل یا اہم امیر کو زندہ نہ رہنے دیا ۔

3- اندرونی و بیرونی خطرات سے دفاع :

قطب الدین ایبک اور التتمش کے زمانے میں فوج کا انتظام باقاعدہ طور پر مرکزی حکومت کے پاس نہ ہوتا تھا ۔ فوجی ضروریات کا انتظام جاگیرداروں کے سپرد تھا اور اس کے عوض ان کو مراعات اور جاگیریں دی جاتی تھیں ۔ اکثر اوقات جاگیردار بوقتِ ضرورت بادشاہ کو مناسب طور پر تربیت یافتہ فوج نہ بھیجتے ۔ بلکہ سیاسی ضرورت کے تحت اپنی وفاداریاں بدل کر بادشاہ کی حیثیت کو خطرہ لاحق کر دیتے تھے — ایسی صورت میں جاگیردار غیر ضروری طور پر اہمیت کے حامل ہو جاتے تھے ۔

بلبن نے ان حالات کے پیشِ نظر مرکز کے زیرِ اہتمام باقاعدہ فوج تیار کرنے کا منصوبہ بنایا ۔ یہ فوج براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتی تھی اور ان کی پہلی اور آخری وفاداری بھی بادشاہ سے ہی وابستہ رہتی تھی ۔ اس فوج کے انتظام سے جاگیرداروں کی سیاسی اور فوجی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی ۔ اس کا بلاواسطہ فائدہ بادشاہ کو حاصل ہوا اور اب طاقت کا ارتکاز اس کے ہاتھوں میں ہو گیا۔

فوج کے سواروں اور پیادوں کے دستوں کو وفادار سرداروں کے سپرد کیا گیا تھا ۔ ان کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا اور تنخواہوں کی ادائیگی باقاعدہ طور پر کرنے کا بندوبست کیا گیا ۔ بلبن ذاتی طور پر فوجیوں کی تربیت کی نگرانی کرتا اور فوج کے مختلف شعبہ جات کا اکثر معائنہ بھی کرتا رہتا تھا ۔ تمام فوجی مہمات کی نگرانی بلبن خود کرتا اور مہمات کو آخری وقت تک خفیہ رکھتا تھا ۔

فوجی انتظام کے سلسلے میں جن جاگیرداروں کو جاگیریں دی گئی تھیں ، ان کے بارے میں بلبن نے تفتیش کروائی تو اسے معلوم ہوا کہ مجموعی طور پر ان جاگیرداروں میں سے اکثر حکومت کی کسی قسم کی کوئی مدد نہیں کرتے ۔ بلبن نے ان تمام جاگیرداروں کی جاگیریں ضبط کر لیں اور ان کا انتظام سرکاری اہلکاروں کے سپرد کر دیا ۔

4- انتظامی اقدام : انتظامی طور پر بلبن نے ایسا ڈھانچہ استوار کیا جس میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرنا ناممکن تھا ۔ انتظامی طور پر تمام معاملات بلاواسطہ بلبن خود طے کرتا تھا ۔ ان میں پالیسی سازی سے تنفیذ کے تمام مراحل شامل تھے ۔ اہلکاروں کی بھرتی سے لے کر ان کے فرائض کی بجاآوری تک تمام امور اس کی نگرانی میں طے ہوتے تھے ۔

کسی سرکاری عہدے پر بھرتی کے لیے واحد معیار اعلیٰ نسل سے ہونا تھا ۔ اعلیٰ نسل کے زمرے میں صرف ترکوں اور ان میں بلبن کے قبیلے 'البری' کو فوقیت حاصل تھی ۔ اس معیار پر پورا نہ اترنے والوں کو حقارت اور نفرت سے دیکھا جاتا تھا ۔

انتظامی معاملات کو بہتر بنانے کے لیے جاسوسی کا نظام رائج تھا ۔ یہ محکمہ تمام اہلکاروں اور اعلیٰ عہدیداروں کے کام کی نگرانی کرتا تھا ۔ اس محکمے سے خود بلبن کے اپنے بیٹے بھی محفوظ نہ تھے ۔ محکمہ جاسوسی کے اہل کار براہ راست بلبن کو اپنی کارگزاری پیش کرتے تھے ۔ ان کے لیے تنخواہوں کا معیار عام معیار سے بہتر تھا ۔

5- فوجی مہمات : بلبن کے دورِ حکومت میں اکثر بغاوتیں تو اس کے رعب کے باعث ہی دب گئیں ۔ بنگال میں اٹھنے والی بغاوت کو کچل دیا گیا ۔

منگولوں نے شمال مغربی پنجاب پر قبضہ کیا ہوا تھا ۔ 1270ء میں بلبن لاہور گیا ۔ اس نے یہاں کئی قلعے اور چھاؤنیاں تعمیر کروائیں ۔ اس سے ایسا انتظام ممکن ہو گیا کہ منگول افواج دریائے بیاس سے آگے نہ بڑھ پائیں ۔

بلبن کی وفات : بلبن نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے شہزادہ محمد خان کو اپنا وارثِ سلطنت مقرر کر دیا تھا ۔ شہزادہ محمد منگولوں کے ساتھ ایک جنگ میں مارا گیا ۔ بلبن کی اس وقت عمر اسیؔ سال تھی ۔ اس واقعے نے بلبن کو ہلا کے رکھ دیا تھا ۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کا دوسرا بیٹا بغراخان نافرمان اور نااہل تھا ۔ وہ سخت عیش پسند تھا ۔ بلبن نے اسے بنگال سے دہلی منگوایا تاکہ وہ امورِ سلطنت میں دلچسپی لے ۔ بغراخان کے لیے یہاں عیاشی کرنا ممکن نہ تھا ، اس لیے خفیہ طور پر ایک دن واپس بنگال چلا گیا ۔ اس نے عیش پسندی کو سلطنت کے امور پر ترجیح دی ۔

آخرکار ، بلبن نے کیخسرو ، شہزادہ محمد کے بیٹے کو وارثِ سلطنت بنایا ۔ بلبن 1287ء میں چل بسا ۔

تجزیہ :

بلبن نے ایبک اور التتمش کی سیاسی کوششوں کو استحکام بخشا ۔ ہندوستان میں مسلم حکومت کو ایک مضبوط بنیاد پر کھڑا کیا ۔ اس کی وجہ سے التتمش کے بعد پیدا ہونے والی خلفشار ختم ہو گئی ۔ بلبن نے سیاسی اور فوجی طور پر ایک نظام قائم کرنے کی کوشش کی جو شہنشاہیت کے استحکام کے لیے مفید ہو سکتا تھا ۔

بلبن ، ایک سیاسی انتشار کے دور میں اپنی بصیرت اور سیاسی سوجھ بوجھ کے بل بوتے پر اُبھرا اور اس نے اپنا ایک مقام بنایا ۔ انہی تجربات کی بنا پر اس نے تمام انتظامی ، سیاسی یا معاشی اقدامات کو بڑی احتیاط سے استوار کیا ۔ تاہم ان سب میں بنیادی جذبہ جبر اور بادشاہ کا دبدبہ تھا ۔ بعد میں ان ہی کی وجہ سے اس نظام میں منفی اثرات پیدا ہوئے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مرنے کے تھوڑے عرصے بعد یہ سارا نظام اپنا اثر کھو بیٹھا اور نیا خاندان برسر اقتدار آگیا ، جس نے اس نظام کو اپنی بنیاد تو ضرور بنایا مگر اس کی ہیئت کو بدل دیا ۔

بلبن کے قائم کردہ نظام میں مرکزیت اس کے مخصوص اندازِ بادشاہت کو حاصل تھی ۔ اس کا مقصد بنیادی طور پر یہ تھا کہ عام لوگ تو درکنار بادشاہ کے قریبی ساتھی بھی اس کے خوف میں مبتلا رہیں ۔ اس خوف کی حالت میں حکومت کے امور کی انجام دہی تو ہو جاتی ہیں مگر انسانی قابلیت اور خوبیاں پنپ نہیں پاتیں ۔

بلبن کے دربار کا جو حال بیان کیا گیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں جبر اور خوف اپنے نقطۂ عروج تک پہنچا ہوا تھا ۔ اگرچہ لوگ اس کے خلاف کچھ کہہ سن نہ سکتے تھے مگر ان کے اندر عدم سلامتی کا جذبہ بدستور موجود تھا ۔ اس کی نشاندہی بلبن کے ساتھ ہی اس کے نظام کے خاتمے سے ہوتی ہے ۔

بلبن نے صرف البری ترکوں کو اعلیٰ کلیدی عہدوں کے لیے مناسب قرار دیا تھا ۔ ان کے علاوہ دوسرے ترک لوگوں کو کسی حد تک اعلیٰ عہدوں تک پہنچنے کا حق دیا جاتا تھا ۔ اس پالیسی کے تحت بے شمار ترک ہندوستان آنے لگے ۔ مگر منگولوں کے حملوں کے باعث ترکستان سے لوگوں کی ہجرت نہ ہونے کے باعث فوج اور دوسرے

اعلیٰ عہدے خالی رہنے لگے ۔ اس سے انتظامی مسائل پیدا ہونا شروع ہو گئے ۔

بلبن نسلی برتری کے بارے میں اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ کسی ادنیٰ ذات ، یعنی غیر ترک کو دیکھے تو اس کی رگوں میں حرکت آ جاتی ہے ۔ حالانکہ جس سلطنت کا وہ بادشاہ تھا اس میں ہندو ، مسلمان اور دوسری اقوام کے لوگ بھی شامل تھے ۔ اس طرح بلبن کے اپنے قول کہ نبوّت کے بعد بادشاہت ہی ایسا عہدہ ہے جس سے خلق خدا کی خدمت ہو سکتی ہے ، کی نفی ہوتی ہے ۔ وہ اپنی سیاسی اور ذاتی ضروریات کے مطابق صرف ترکوں کو ہی حکومت میں نمائندگی کا مستحق سمجھتا تھا اور بقایا قوموں کو ناپسند کرتا تھا ۔ بالفاظ دیگر وہ صرف ترکوں کو ہی اپنی بادشاہت سے فائدے حاصل کرنے کا اہل سمجھتا تھا ۔

کسی شخص کے کم رتبہ ہونے میں اس شخص کے اپنے ذاتی افعال کا عمل دخل بہت کم ہوتا ہے ۔ اس کی پست حالت بنانے میں اس کے گرد معاشرے اور اس زمانے کے حکمران یا بادشاہ کی پالیسیوں کا عمل دخل زیادہ اہم ہوتا ہے ۔ بادشاہ جب زیادہ سے زیادہ دولت کے حصول کے لیے جاگیر داروں کو وسیع اختیارات دے گا اور یہ جاگیر دار عام کسانوں سے ان کی ہمت سے کہیں زیادہ مالیہ لیں گے تو اس صورت میں کسان کی حیثیت یقیناً کم تر ہوتی چلی جائے گی ۔ اس صورتحال میں ذمہ داری بادشاہوں کے سر آتی ہے، اور اس پر، اگر کوئی بادشاہ اپنے ہی پیدا کردہ نظام کے تحت پسے ہوئے لوگوں سے ہمدردی کی بجائے انھیں برملا حقیر اور ان کی انسانی عظمت کو چیلنج کرے تو اس سے بڑھ کر جبر کیا ہو سکتا ہے ۔ کوئی بھی انسان اپنی معاشی حیثیت سے بڑھ کر بڑا اور اعلیٰ ہوتا ہے اور اس کی بڑائی کے لیے اس کا انسان ہونا ہی کافی ہے ۔

ترک اور غیر ترکوں میں تفریق اور اعلیٰ نسل کا مسئلہ بنیادی طور پر سیاسی تھا ۔ التتمش کے بعد اس کے اپنے تربیت یافتہ ترک غلاموں (امرأ) کے درمیان سیاسی اقتدار کی رسہ کشی شروع ہونے سے غیر ترک امرأ نے بھی اپنی حیثیت کو منوانے کی کوششیں شروع کر دیں ۔ چونکہ ترک امرأ بنیادی طور پر ہندوستان پر حکومت کرنے والے طبقے سے منسلک تھے ، اس لیے وہ اس تناظر میں اپنی حیثیت کو اعلیٰ سمجھتے

تھے ۔ غیر ترک امرأ کی حیثیت ابتدا میں حکومتی ملازمین کی سی تھی جو بعد ازاں ترقی کر کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے ۔ اعلیٰ عہدوں کے باوجود ان کی حیثیت ترک امرأ کے مقابلے میں کم تر ہی سمجھی جاتی تھی ۔

اس پس منظر میں غیر ترک امرأ اور ان کے حلیف طبقات اور گروہوں کو سیاسی طور پر دبانے کے لیے نسلی برتری کا سیاسی نظریہ پیش کیا گیا ۔ اس سے زیادہ سے زیادہ ترک امرأ اور افراد حکومتی مشینری میں شامل کیے گئے ۔ ان ترک اہلکاروں کی بادشاہ کے لیے وفاداریاں غیر ترکوں کے مقابلے میں ، زیادہ مضبوط اور بااعتماد ہو سکتی تھیں ۔ ترک نسل کی برتری کے سیاسی نظریے سے غیر ترکوں کو نہ صرف سیاسی و انتظامی عہدوں سے دور رکھنا بلکہ ان کی معاشرتی عزت اور حیثیت کو بھی متاثر کرنا مقصود تھا ۔ مختصر یہ کہ ترک اہلکاروں پر زیادہ سے زیادہ انحصار بلبن کی ایک سیاسی ضرورت تھی۔

بعض مؤرخین نے بلبن کے نسلی نظریے اور بادشاہت کے بارے میں نظریات کو اس کی ذاتی شخصیت میں احساس کمتری کا نتیجہ قرار دیا ہے ۔ اگرچہ وہ ایک کامیاب خاندان کا فرد تھا مگر غلامی اور اپنی ظاہری شکل و صورت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے ، اس کے اندر ایک مخفی سا احساس محرومی پیدا ہو چکا تھا ۔ (بلبن کے منہ پر چیچک کے داغ تھے) ۔ یہ بات فطری معلوم ہوتی ہے کہ ہر شخص معاشرے میں اپنی حیثیت کو منوانے کے لیے کوشش کرتا ہے ۔ اس میں ظاہری شکل و صورت اور لباس کا بھی ایک کردار ہوتا ہے ۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو بدصورت سمجھنے لگے تو اس احساس بدصورتی کو دور کرنے کے لیے وہ اچھے اچھے کپڑے پہنے گا اور اس قسم کے دوسرے کام کرے گا تاکہ لوگ ظاہری بدصورتی کی بجائے اس کے لباس کی خوبصورتی کو دیکھیں ۔

یہ دونوں باتیں بلبن کے انداز زندگی میں واضح نظر آتی ہیں ۔ وہ ذاتی بدصورتی کو کم کرنے کے لیے دربار اور جلوس کا پُر تکلف اور پُرہیبت اہتمام کرتا تھا۔ اس کارروائی میں اُس نے اپنی شناخت اپنی ذات سے الگ اپنی حیثیت اور رعب سے کروائی۔ اس سلسلے میں اس نے نسلی برتری کا نظریہ پیش کیا۔ یہ تمام اقدامات اس نے اپنے احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لیے کیے۔

مختصر یہ کہ بلبن جائز و ناجائز طریقے سے اقتدار تک پہنچا ۔ اس نے اپنے ہم عصر رجحانات کو نہایت عقلمندی اور ہوشیاری سے سمجھا اور ایسی حکمت عملی اختیار کی جس پر چل کر وہ ایک مضبوط بادشاہ بن گیا ۔

یاد دہانی کے لیے نکات

واقعاتی تسلسل

1- بلبن کی ناصر الدین محمود کے زمانے میں
بحیثیت نائب سلطنت تقرّری ——— 1246ء

2- ابوریحان کی بلبن کے خلاف
بغاوت اور بلبن کی وزارت سے برخاستگی ——— 1253-55ء

3- ہلاکو خان کا بغداد کو تباہ کرنا ——— 1258ء

4- بلبن کا بحیثیت بادشاہ اقتدار سنبھالنا ——— 1266ء

5- بنگال میں بغاوت کا فرو کرنا ——— 1280ء

6- شہزادہ محمد خان کی وفات ——— 1285ء

7- بلبن کا انتقال ——— 1287ء

اہم نکات

(i) التتمش کے بعد پیدا ہونے والے انتشار کے خاتمے کے ساتھ ہی بلبن ایک طاقتور سیاست دان کے طور پر ابھرا ۔

(ii) بلبن کے دور حکومت میں مسلم حکومت میں استحکام کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

(iii) بلبن نے سیاسی ضرورت کے تحت بادشاہت کے ادارے کو نہایت مضبوط ، بارعب اور پُر ہیبت بنانے کی کوشش کی۔

(iv) غیر ترکوں کو سیاست اور اعلیٰ عہدوں سے دور رکھنے کے لیے بلبن نے نہ صرف نسلی برتری کا نظریہ پیش کیا بلکہ اس پر سختی سے عمل بھی کروایا ۔

(v) حاکمیت پسندی (AUTHORITARIANISM) میں انسانوں پر غیر ضروری خوف اور جبر کی فضا مسلّط کر دی جاتی ہے۔ اس سے ان کی صلاحیتیں دب جاتی ہیں ۔ یہ ایک غیر انسانی انداز ہے ۔

(vi) بلبن نے اپنے تمام ممکنہ حریفوں اور امرأ کو یا تو قتل کروا دیا یا انھیں سزائیں دے کر معاشرے میں ذلیل کرایا ۔

(vii) بلبن نے مرکز کے زیر انتظام باقاعدہ فوج کی تنظیم کی ۔ یہ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے دور میں سب سے پہلا تجربہ تھا ۔

غور و فکر کے لیے چند باتیں

الف 1- بلبن نے اپنے دور حکومت میں جو اقدام کیے ان کی وجہ اس کی ذات تھی یا سیاسی ضرورت ۔ اپنے تجزیے کے حق میں دلائل دیں ۔

2- اگر آپ بلبن کے قریبی ساتھی ہوتے تو آپ بلبن کو اس کی مختلف پالیسیوں کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ۔ اپنے مشورے کو دلائل کے ساتھ پیش کریں ۔

3- اگر آپ بلبن کے دور میں زندہ ہوتے تو آپ کے بلبن کے انداز حکومت کے بارے میں عمومی احساسات کیا ہوتے ؟

ب مختصر جواب دیں ۔

(i) ترک اور غیر ترک امرأ کی باہمی چپقلش سے بلبن نے کیونکر فائدہ اٹھایا ؟

(ii) کسی بھی حکومت کے استحکام کے لیے کون سے عناصر بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ؟

(iii) بلبن کی ابتدائی زندگی سے لے کر اس کے سلطان بننے تک کا سوانحی خاکہ تحریر کریں ؟

(iv) حاکمیت پسندی (AUTHORITARIANISM) سے کیا مراد ہے ؟

(v) جس حکومت کا انداز حاکمیت پسندانہ ہو ، وہ کیونکر عام لوگوں پر منفی اثرات مسلط کرتی ہے ؟

(vi) بلبن کے سلطان بننے کے بعد ، اسے کن اہم مسائل کا سامنا تھا ۔

(vii) بلبن بادشاہت کو کس انداز میں استوار کرنا چاہتا تھا ؟

(viii) بلبن نے نسلی امتیاز کی پالیسی کیوں اپنائی ؟

(ix) بلبن نے فوجی نظام میں کس طرح بہتری لانے کی سعی کی ، اس سے اسے کیا فوائد حاصل ہوئے ؟

(x) بلبن کی جابرانہ پالیسیوں میں کس حد تک اس کی ذات کا عمل دخل شامل تھا ۔

ج ۔ نیچے ایک بیان کے ساتھ چند وجوہات دی گئی ہیں ۔ یہ سب وجوہات اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں ، تاہم ان میں سے کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے ۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں باہم گفتگو کریں اور جو بھی مشترکہ فیصلہ ہو اس پر ✓ کا نشان لگائیں:

(i) حاکمیت پسندانہ نظام حکومت میں :

(الف) عوام کو حکومتی معاملات میں شریک نہیں کیا جاتا ہے ۔

(ب) حاکم اپنی ضرورت اور ذاتی پسند ، ناپسند کے مطابق پالیسیاں تیار کرتا اور ان پر عمل کرواتا ہے ۔

(ج) عوام کی حیثیت محض ایک آلۂ کار سے زیادہ نہیں ہوتی ۔

(د) انسانوں کو انسانی معیار سے کم تر درجے پر جینے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اس سے ان کی تمام تر تخلیقی قویٰ سلب کر لی جاتی ہیں ۔

(ii) غیاث الدین بلبن کی جابرانہ پالیسیوں کا مقصد :

(الف) ایک مضبوط حکومت قائم کرنا تھا ۔

(ب) اپنے مخالفوں کو راستے سے ہٹانا تھا ۔

(ج) ترکوں کی برتری کو ثابت کرنا تھا ۔

(د) ذاتی خواہش کے مطابق حکومتی اداروں کو ڈھال کر اپنا ذاتی اقتدار قائم کرنا تھا ۔

مزید مطالعہ کے لیے کتب

1- تاریخ فیروز شاہی ، مصنفہ ضیاء الدین برنی

مترجم — ڈاکٹر سید معین الحق

مطبوعہ — مرکزی اردو بورڈ ، لاہور

یہ کتاب ایک بنیادی ہم عصر مأخذ ہے اور اس کے مصنف نے بلبن کا دور خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ اس میں بلبن کے بارے میں نہایت تفصیل سے حالات درج کیے گئے ہیں جو طلبہ و طالبات کے لیے نہایت دلچسپ ہونگے ۔ اس سے بلبن کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر مزید بہتر ہو گا ۔

بلبن کے بعد سیاسی انتشار

سلطان غیاث الدین بلبن ایک سخت گیر حکمران تھا۔ اُس نے اپنے مخصوص دبدبے اور ہیبت کے انداز میں بائیس سال حکومت کی۔ اُس کا دورِ حکومت حاکمیت پسندی کے تمام مضمرات سے پُر تھا بلکہ اس کے بعض اقدام تو منفی انداز کی حدود کو چھوتے تھے۔

بلبن کے دورِ حکومت میں تمام تر حالات اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہی طے پاتے رہے تاہم اس کے خاتمے کے ساتھ ہی ایک یکسر مختلف انداز میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رُونما ہوئیں اور تین سال کے ایک دورِ انتشار کے بعد ایک اور خاندان 'خلجی' برسراقتدار آگیا۔

بلبن کا دور حکومت اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ حالات کو طاقت اور جبر سے دبایا تو جا سکتا ہے مگر اس کے خاتمے کے فوراً بعد کا دَور اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ ایک مصنوعی عمل ہوتا ہے۔ آسودگی ملتے ہی ایک شدید ردعمل پیدا ہوتا ہے جو اس جبر و طاقت کے دَور کے تمام تانے بانے ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ اسی کو تاریخی عمل کہا جا سکتا ہے۔

تاریخی عمل میں صرف وہی پالیسیاں قابل قبول ہوتی ہیں جن سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدے پہنچ رہے ہوں۔ غیر صحت مند اور غیر مفید رجحانات لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوتے۔ ایسے اقدامات کی حیثیت محض مصنوعی اور وقتی ہوتی ہے۔ لوگ خوف کے تحت ایسے رُجحانات اور پالیسیوں کو قبول تو کر لیتے ہیں مگر دِل سے نہ صرف سخت نالاں، بلکہ اس کو بدلنے کے خواہاں بھی رہتے تھے۔

بلبن کے قائم کردہ نظام میں اعتدال نہ تھا، جس کے باعث عوام تو اپنی جگہ نالاں تھے ہی، اہم سیاسی گروہ، امرأ اور جاگیردار بھی اُس وقت کے انتظار میں تھے، جب ان کی باری آئے اور وہ اپنے مفادات کی پذیرائی کر سکیں۔

بلبن کے بعد پیدا ہونے والے حالات بلبن کے قائم کردہ نظام کے خلاف ایک اہم ردعمل تھا۔ اس کا اجمالی جائزہ ذیل میں لیا جاتا ہے۔

بلبن نے اپنے چہیتے بیٹے شہزادہ محمد کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے کیخسرو کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس کے اقتدار سنبھالتے ہی دہلی کے کوتوال فخرالدین نے بغاوت کردی۔ امرأ کی اعانت حاصل کرکے اُس نے بغرا خان کے بیٹے کیقباد کو بادشاہ بنا دیا۔

کیقباد (1287 – 1290) : سترہ سالہ ، ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ اس کی تربیت کے لیے سخت گیر اتالیق مقرر تھے جو اُسے کسی قسم کی لذّت سے لطف اندوز ہونے یا کسی قسم کی معمولی سی خواہش کے پورا ہونے کے خیال تک کو اُس کے قریب پھٹکنے نہ دیتے تھے۔

حکومت سنبھالنے کے بعد کیقباد کو اپنی خواہشات کے پورا کرنے میں پورا اختیار تھا۔ اُس نے اپنی تربیت کو ایک طرف رکھ کر جو دِل میں آیا ، وہ کیا۔ اپنی تمام محرومیوں اور جوانی کی خواہشات کو اس نے جی بھر کے پورا کیا۔

کیقباد کے عیّاشیانہ انداز سے حکومتی معاملات متاثر ہونے لگے۔ بلبن کے قہروجلال کے دَور کے بعد جب عام طور پر لوگوں کو ڈھیل ملی تو معاملات یکسر بگڑنے لگے۔ بلبن کی انتہا پسندانہ پالیسوں کا ردّعمل بھی انتہا پسندی کی صورت میں ہی اُبھرا۔ ان حالات کا نقشہ تاریخ فیروز شاہی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

> "بے کار لوگوں کی بن آئی، خوشیاں اُڑانے والے، مجلسوں میں رونق پیدا کرنے والے، عیش و عشرت کے دلدادہ ، لطیفہ گو اور ہنسی مذاق اڑانے والے جو خاموش تھے اور گوشۂ خواری میں بے کار اور بے خریدار پڑے تھے ، سب کام میں لگ گئے ، ہر دیوار کے سایے میں پری رو دکھائی دینے لگے ——— ہر کوچے میں گانے والیاں اور ہر محلے میں گانے بجانے کا شُغل شروع ہوگیا۔ عیّاش اور اوباشوں کے دِن پھر گئے۔"

بادشاہ ، امرأ اور جاگیرداروں کے بارے میں تاریخ فیروزشاہی میں درج ہے:-

"اکابر و مشاہیر کے لیے اب شراب پینے، مجلسیں منعقد کرنے، دوستوں کو جمع کرنے، گانے سننے، جوا کھیلنے ، بخششیں دینے ، مزے اڑانے، اور رات دِن عیش و آرام میں بسر کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ سلطان کی مجلسوں کو حسین اور اچھی باتیں کرنے والوں سے ایسا آراستہ کیا جاتا تھا کہ جو کوئی بھی اس کو دیکھ لیتا یا اس کے متعلق سن لیتا، تو ساری عمر اس کی لذّت اس کے سینے سے دُور نہ ہوتی۔"

ان حالات میں حقیقی طور پر تمام تر حکومتی انتظام نظام الدین ایک کوتوال کے پاس تھا۔ چونکہ نظام الدین نے کیقباد کو تخت دلانے کے لیے کئی ترک امرأ کو مروا دیا تھا، اس لیے طبقۂ امرأ میں اس کے خلاف سخت تشویش پائی جاتی تھی۔ لہذا ان حالات میں نظام الدین نے بھی امرأ کی مخالفت شروع کر دی۔

کیقباد کے والد والئی بنگال بغرا خان نے خطوط کے ذریعے اپنے بیٹے کو بڑا سمجھایا مگر اس کا خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ بغرا خان نے اپنے بیٹے سے ملنے کا پروگرام بنایا اور فوج کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ کیقباد کو اس پیشقدمی کے بارے میں غلط اطلاعات دی گئیں اور وہ بھی اپنی فوج لے کر دہلی سے باہر چلا آیا۔ دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ نظام الدین کی خواہش تھی کہ دونوں باپ بیٹا باہم الجھ پڑیں مگر چند امرأ نے معاملہ بگڑتے بگڑتے بچالیا۔ دونوں باپ، بیٹا کی ملاقات ہوئی، بغرا خان نے اپنے بیٹے کو اپنا رویہ بدلنے کی نصیحت کی۔ کیقباد اپنی عادتوں سے مجبور تھا۔ تاہم ان حالات میں وہ نظام الدین سے بدظن ہوگیا اور اُس نے اُسے زہر دے کر مروا دیا۔

کیقباد کی صحت دِن بدن گر رہی تھی اور امرأ کا معاملات سلطنت میں عمل دخل دِن بدن بڑھ رہا تھا۔ ان امرأ میں جلال الدین خلجی بھی تھا جو اُس وقت فوج کا سپہ سالار تھا۔ ترک امرأ جلال خلجی کو سپہ سالار بنانے پر ناخوش تھے۔ انھوں نے جلال خلجی کو مروانے کی ایک کوشش بھی کی۔

انہی دنوں کیقباد فالج کی وجہ سے بالکل ناکارہ اور غیر مؤثر ہوگیا تھا۔ جلال خلجی نے ترک امرأ کے خلاف جوابی کارروائی شروع کر دی اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوا۔ اب ہندوستان میں خلجی خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔

جلال الدین خلجی

1290ء — 1296ء

"امرأ نے بادہ نوشی کی ایک محفل منعقد کی اور خوب پی کر عالم مستی میں اَول جَلول بکنے لگے۔ ایک نے کہا، 'جلال الدین خلجی ہرگز اس قابل نہیں کہ وہ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے' دوسرے نے کہا 'میں اس کو موت کے گھاٹ اتار دُوں گا' تیسرا گویا ہوا 'میں اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر ڈالوں گا۔'"

غرض یہ کہ اس محفل میں ان امرأ نے خوب جی بھر کے بیہودہ گفتگو کی۔ انھیں امیروں میں سے ایک نے تمام باتیں جلال الدین خلجی کو جا کر بتا دیں۔ یہ باتیں سن کر جلال الدین اگرچہ سخت پریشان ہوا۔ البتہ ان کے ارادوں سے مغموم ہو کر اُس وقت ایک قاصد بھیج کر ان سب کو اپنے سامنے طلب کیا۔

جب یہ تمام امیر بادشاہ کے سامنے آگئے تو جلال الدین خلجی نے میانؔ سے تلوار نکال کر ان کے سامنے رکھ دی اور ان سے کہا "میں اس وقت نہتا ہوں، میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں۔ تم میں سے جس شخص کو بھی بہادری کا دعویٰ ہے وہ اٹھے اور میری ہی تلوار سے میری گردن اڑا دے۔"

(تاریخِ فرشتہ)

بلبن کے پُر ہیبت دَور کے بعد، شہنشاہیت کا یہ انداز بالکل عجیب اور انوکھا تھا۔ بلبن کے امیر اگر ایسی حرکت کرتے تو وہ ان کی زندہ کھال کھینچوا دیتا۔ جلال الدین خلجی کا یہ نرم رویہ، اس کے انتظام سلطنت کا بنیادی جذبہ اور محرک تھا۔ اسی وجہ سے اس کا پورا دور انتشار سے بھرپور رہا اور آخر وہ خود بھی اسی انتشار کا شکار ہو گیا۔

ابتدائی حالات :- جلال الدین خلجی (1) بنیادی طور پر ایک سپاہی تھا۔ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ترقی کرتے کرتے کیقباد کے زمانے میں فوج کا سپہ سالار بن گیا۔ ترک امرأ نے اُسے اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اس کو قتل کرنے کی سازش کی ۔ جلال الدین خلجی نے اپنی حفاظت کے لیے اقدام کیے اور اس کوشش میں حالات اس قدر سازگار ہو گئے کہ وہ سلطان بن گیا۔ دہلی کے مضافات میں 1290ء میں جلال الدین خلجی تخت نشین ہوا۔ اُس وقت اس کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔

پیرانہ سالی کے باعث ، جلال الدین خلجی کو جنگ و جدل سے یکسر دلچسپی نہ تھی اور وہ کسی قسم کے خون خرابے سے اجتناب کرتا تھا۔ وہ حد درجہ نرم خُو اور مذہبی طور پر وسیع القلب تھا۔ حکومتی پالیسیوں کے معاملے میں سکون پسند تھا۔

جلال الدین خلجی نے تمام ترک سرداروں کو ، ان کی دشمنی کے باوجود ان کے عہدوں پر فائز رکھا۔ وہ نہ صرف ڈاکوؤں اور شر پسندوں کو معاف کر دیتا بلکہ اپنے خلاف بغاوت کرنے والوں سے بھی باز پرس نہ کرتا ۔ انہی رویّوں کے باعث اس کے دور میں سازشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

1- جلال الدین خلجی کا خاندان بہت عرصہ پہلے ہندوستان میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ یہ خاندان محمود غزنوی کے حملوں کے دوران یہاں آیا تھا۔ یہ بنیادی طور پر ترکستان سے تعلق رکھتے تھے اور افغانستان میں آکر بس گئے تھے۔ یہاں کئی صدیاں رہنے کے بعد ان کے طور طریقے اور اندازِ معاشرت افغانی رنگ میں ڈھل گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی معاشرتی شناخت افغانستان کے حوالے سے ہی کی جاتی ہے۔ بلکہ جب جلال الدین خلجی نے حکومت سنبھالی تو دہلی کے لوگوں نے ابتدا میں اس کی حکومت کو قبول نہ کیا کیونکہ وہ اسے ایک 'افغان غاصب سلطنت' سمجھتے تھے۔

خلجی سپاہی، سلطان محمود غوری کے عہد میں ترک فوج میں نہایت اہم حیثیت کے حامل تھے۔ جب ترائن کی لڑائی میں محمد غوری شدید زخمی ہوگیا تھا تو ایک خلجی سپاہی نے ہی اس کی جان بچائی تھی۔ بہار اور بنگال کو بھی، اس دور میں ایک خلجی سردار ، بختیار خلجی نے فتح کیا تھا۔

بلبن کے دَور میں خلجیوں کو ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ اس دَور میں البری ترکوں اور خلجیوں کے درمیان باہمی چپقلش جنم لے چکی تھی تاہم اس وقت یہ زیر زمین ہی رہی۔

ملک چھجو کی بغاوت

ملک چھجو بلبن کا ایک قریبی رشتے دار تھا۔ یہ بلبن کے عہد سے ہی الٰہ آباد کا گورنر چلا آ رہا تھا۔ اُس نے 1290ء میں جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کردی اور سلطان غیاث الدین، کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس سازش (1) میں کئی دوسرے گورنر بھی اُس کے ساتھ شامل تھے۔ ملک چھجو نے اپنے نام کے سکّے جاری کروا دیے اور مساجد میں اس کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جانے لگا۔

وسعت سلطنت کے سلسلے میں ملک چھجو نے دہلی کی طرف پیش قدمی کی تو جلال الدین خلجی خود لشکر کی سربراہی میں آگے بڑھا۔ جلال الدین خلجی کے بیٹے نے ملک چھجو کا راستہ روکا اور ملک چھجو کو گرفتار کر لیا۔ ملک چھجو کو زنجیروں میں جلال خلجی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ملک چھجو کی یہ حالت دیکھ کر جلال خلجی رو دیا۔ اُس نے ملک چھجو کو رہا کر دیا اور بعد ازاں اس کی باقاعدہ ضیافت کی۔ ملک چھجو کی سابقہ وفاداریوں کو سراہا گیا۔ علاؤالدین خلجی نے جو اُس وقت کڑا (الٰہ آباد) کا گورنر تھا، جلال خلجی کے اس رویّے کو سخت ناپسند کیا۔ جلال خلجی نے یہ کہہ کر اسے چپ کرا دیا کہ وہ اپنی حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے مسلمانوں کا خون نہیں بہا سکتا۔

1- سازش صرف اُسی صورت میں کی جاتی ہے جب کسی بھی اقدام کے کرنے کی کھلم کھلا اجازت یا ماحول میسر نہ ہو۔ سازش کسی بھی فرد یا گروہ کی جائز یا ناجائز خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہو سکتی ہے۔

بادشاہوں کے دَور میں عموماً مختلف سیاسی گروہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے بادشاہ کے خلاف خفیہ طور پر سازشیں کرتے تھے تاکہ اسے برطرف کر کے اپنی مرضی کا حاکم مقرر کیا جا سکے۔

تاریخ میں ان سازشوں کے علاوہ عام لوگوں کی بغاوت یا سازشوں کا بھی پتہ ملتا ہے، جن میں لوگ اپنی معاشی بدحالی سے تنگ آ کر حکمران طبقے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر فرانس میں اٹھارھویں صدی کے آخر میں اس قسم کی بغاوت ہوئی تھی جسے تاریخ میں انقلاب فرانس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سیدی مولہ کی بغاوت

سیدی مولہ ایک ایرانی النسل درویش تھا۔ پہلے، یہ اجودھن (پاک پتن) میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی صحبت میں رہا اور بعدازاں دہلی چلا آیا۔ یہاں اُس نے ایک بڑی خانقاہ تعمیر کروائی اور لنگر جاری کیا۔

ہزاروں لوگ یہاں آکر اپنی بھوک مٹاتے اور دوسری روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے لگے۔ بلبن کے عہد میں بڑے بڑے امرأ اس کے مرید تھے، بلکہ بادشاہ کا ایک بیٹا بھی اس کا مرید تھا۔ خلجیوں کے اقتدار سنبھالتے ہی جن امرأ کو اپنی جاگیروں سے ہاتھ دھونا پڑا، ان سب نے اس خانقاہ پر ڈیرے لگا لیے۔

ان امرأ نے سیدی مولہ کی مقبولیت سے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ سب نے مل کر سیدی مولہ کو تاج و تخت حاصل کرنے پر اکسایا۔ سیدی مولہ پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

سیدی مولہ نے ایک حکمت عملی کے تحت بادشاہت سے نجات اور شریعت کے نفاذ کے لیے لوگوں میں آمادگی پیدا کرنا شروع کردی۔ اس سلسلے میں ایک تنظیم عمل میں لائی گئی ۔ جس میں بہت سے عہدیدار اور سرگرم رکن تھے۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ مزید متحرک ہوتے گئے اور انھوں نے جلال الدین خلجی اور کئی ایک امرأ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ وقت سے پہلے ہی فاش ہوگیا۔

سیدی مولہ کو گرفتار کر لیا گیا اور اُس سے باز پرس کا سلسلہ شروع ہوا ۔ سیدی مولہ نے اپنی بے گناہی پر اصرار کیا مگر بادشاہ اس سے مطمئن نہ تھا۔ بادشاہ نے آگ کا ایک بڑا الاؤ تیار کروایا اور سیدی مولہ اور اس کے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اس میں کود جائیں ۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ اگر وہ بے گناہ ہوئے تو انھیں کوئی گزند نہ پہنچے گی اور اگر وہ مجرم ہوئے تو وہ خود سزا پا جائیں گے۔

علماء نے اس طریق کار کی مخالفت کی اور کہا کہ آگ کا کام تو جلانا ہے ۔ اس میں وہ کسی مجرم یا معصوم کا لحاظ نہیں کرتی ——— یہ دونوں کو یکساں طور پر جلا دے گی۔ بادشاہ نے بھی دلیل پر اپنا فیصلہ ترک کر دیا اور سیدی مولہ کو ملک بدر کرنے کا

حکم دے دیا۔ اسی اثناء میں بادشاہ کے قریبی ایک شخص نے بڑھ کر سیدی مولہ پر وار کیا اور اُسے شدید زخمی کر دیا۔ بادشاہ ابھی سیدی مولہ کو ختم کرنے میں پس و پیش کر رہا تھا کہ اس کے بیٹے نے سیدی مولہ پر ہاتھی دوڑا کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

مجموعی طور پر جلال الدین خلجی کے عہدِ حکومت میں سخت بدامنی کی فضا رہی۔ اس صورتحال کو 'آب کوثر' میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"بادشاہ کی درویشانہ طبیعت اور حلم و بے آزاری کے بعض لوگ مدّاح تھے، لیکن ان سے امورِ ملکی میں خلل پڑنا شروع ہو گیا ۔ چنانچہ بادشاہ کی نرم دِلی کی شہرت عام ہوئی تو ملک بھر میں چوروں، رہزنوں اور ڈاکوؤں نے سر اُٹھا کر فتنہ و فساد شروع کر دیا۔ جب وہ گرفتار ہو کر بادشاہ کے سامنے آتے تو بادشاہ انھیں پیروں اور مشائخوں کی طرح تلقین و وعظ کے بعد چوری اور دوسرے اعمال ناشائستہ سے توبہ کروا کے رہا کر دیتا، وہ واپس جا کر پھر نئے سرے سے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے۔"

"بادشاہ کہا کرتا تھا کہ میں نے لڑائیاں لڑی ہیں اور میدان میں بڑا کُشت و خون گوارا کر سکتا ہوں، لیکن جو شخص دست و پا گرفتہ میرے سامنے آئے اس کو قتل کرنے کی مجھے ہمت نہیں پڑتی۔ اس کے امیر اور اراکین (سلطنت) یہ باتیں دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ بلکہ امرأ نے عام طور پر یہ کہنا شروع کر دیا کہ بادشاہ امور جہانداری سے ناواقف ہے۔ حکماء نے کہا ہے کہ بادشاہت کے دو رکن ہوتے ہیں، ایک لطف اور دوسرا قہر۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک میں خلل پڑ جائے تو حکومت کو زوال آجاتا ہے۔"

جلال الدین خلجی کا قتل

جلال الدین خلجی کا بھتیجا علاؤالدین خلجی اپنے ذاتی سیاسی عزائم رکھتا تھا۔ وہ جلال الدین خلجی کی نرم پالیسیوں کو بھی ناپسند کرتا تھا۔ اُس نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر دکن کی ایک ریاست دیوگری پر حملہ کرکے بہت سا مال غنیمت حاصل کر لیا۔ اب اس دولت سے وہ بنگال اور دہلی کو بھی فتح کرنا چاہتا تھا۔

جلال الدین خلجی کو جب اپنے بھتیجے کے عزائم کا علم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوا۔ علاؤالدین خلجی نے اپنی 'معصومیت' ثابت کرنے کے لیے اپنے چچا کو ملنے کی دعوت دی۔ اس سلسلے میں اسے اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ علاؤالدین سے تنہا ملے۔

جونہی جلال الدین خلجی، علاؤالدین کے پاس پہنچا، علاؤالدین کے اشارے پر اسے قتل کر دیا گیا۔

تجزیہ :۔

جلال الدین خلجی کا دور حکومت غیر ضروری طور پر نرم پالیسیوں پر مبنی تھا ۔ اس میں اس کی ضعیف العمری کا بھی بڑا دخل تھا کیونکہ وہ فیصلہ کرنے کی قوت میں کمزور ہو چکا تھا اور ذاتی طور پر کسی قسم کے خون خرابے سے اجتناب کرتا تھا۔ خون خرابے سے بچنے کے لیے اس نے کئی قلعوں کو فتح کرنے کی صلاحیت کے باوجود انھیں محاصرے کے بعد ترک کر دیا۔

بلبن کے انتہا پسندانہ سخت رویوں کے مقابلے میں خلجی کا دور بھی انتہائی نرم رویّوں پر مشتمل تھا اور اسے اس کی وجہ سے سازشوں اور بغاوتوں کی صورت میں اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔

تاہم اُس نے خلجی خاندان کی حکومت کی بنا ڈالی، جو ایک کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

غور و فکر کے لیے سوالات

الف۔

I- 'بلبن کے بعد پیدا ہونے والے حالات، بلبن کی غیر ضروری سخت گیری کی وجہ سے پیدا ہوئے'، بحث کریں۔

II- جلال الدین خلجی کی نرم خوئی میں بلبن کی سخت گیر پالیسیوں یا اس میں جلال خلجی کی ذاتی شخصیت کا عمل دخل زیادہ تھا؟ تجزیہ کریں۔

III- جلال الدین خلجی کے دَور میں ہونے والی بغاوتوں کا جائزہ لیں۔

ب۔ مختصر جواب دیں۔

1- تاریخی عمل میں کون سی حکومتی پالیسیاں بہتر اور قابل قبول ہوتی ہیں؟

2- کیقباد کے دورِ حکومت میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

3- خلجی کون تھے؟

4- سازش یا بغاوت سے کیا مراد ہے؟

5- جلال خلجی کے عہد میں ہونے والی بغاوتوں کا تذکرہ کریں؟

6- جلال خلجی کے اندازِ حکومت پر تبصرہ کریں۔

7
ہندوستان میں مسلم حکومت میں وسعت پسندی اور عروج

پس منظر

سلطان محمد غوری کی فتوحات کو ایبک اور التتمش نے ایک حکومتی بنیاد فراہم کر کے ، ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد رکھی ۔ التتمش کے بعد اہم سیاسی گروہوں میں خاص طور پر ترک امرأ اور غیر تُرک امرأ کے درمیان سیاسی رسہ کشی جاری رہی ۔ اس سیاسی رسہ کشی اور انتشار میں بلبن ایک طاقتور بادشاہ کے رُوپ میں ابھرا ۔ اُس نے اپنے مخصوص نظریات کے تحت ایک نظام حکومت استوار کیا اور اس کے دورِ حکومت میں کوئی شخص بھی انتشار پھیلانے کی جرأت نہ کر سکا ۔ بلبن کے خاتمے کے ساتھ ہی سابقہ سیاسی غرض مندیوں اور مفادات کی چپقلش پھر سے شروع ہو گئی اور خاندان خلجی اقتدار میں آگیا ۔

خلجی خاندان کا پہلا حکمران جلال الدین خلجی اپنی غیر ضروری نرم پالیسیوں کے باعث حکومتی اور سیاسی انتشار کو کنٹرول نہ کر سکا ۔ بلکہ اُس کے دَور میں سیاسی اور انتظامی بد نظمی میں اضافہ ہوا ۔ جلال خلجی کو قتل کروا کے اس کا بھتیجا علاؤالدین خلجی اقتدار میں آیا ۔

علاؤالدین خلجی اپنے نظریات اور اقدامات کے اعتبار سے نہایت مؤثر حکمران ثابت ہوا ۔ اُسکی پالیسیوں کے باعث مسلم حکومت کو نہ صرف سیاسی اور فوجی مقبوضات میں وسعت حاصل ہوئی بلکہ انتظامی طور پر بہتر رُجحانات میسّر آئے ۔ علاؤالدین خلجی کے قائم کردہ نظام کی بدولت اس کے بعد آنے والے تغلق خاندان نے بھی فائدہ اٹھایا ۔

علاؤالدین خلجی 1296ء-1316ء

"علاؤالدین (خلجی) نے یہ ارادہ کیا کہ دارالسلطنت میں اتنا لشکر رکھا جائے جو مغلوں (منگولوں) کے حملے روکنے کے لیے کافی ہو اور جس سے مقبوضات کا انتظام بھی کیا جا سکے۔ لشکر کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے بہت زیادہ روپے کی ضرورت تھی۔ شاہی خزانے میں جس قدر روپیہ تھا وہ لشکر کی تنخواہ اور دوسرے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے صرف پانچ چھ سال تک کام آسکتا تھا۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے اپنے خاص اور قابلِ اعتماد امرأ سے مشورہ کیا۔ بادشاہ نے ان امرأ سے پوچھا کہ "لشکر میں کس طرح اضافہ کیا جائے؟ میرے خیال میں چنگیزیوں (منگولوں) اور دیگر حکمرانوں کی تقلید میں سپاہیوں کی تنخواہ میں کمی کر دی جائے۔"

امرأ نے جواب دیا "حضور کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے کہ جب ضروریات روزمرہ کی اشیاء سستے داموں بکیں، نیز گھوڑوں، ہتھیاروں، سامان اسلحہ وغیرہ میں بھی مناسب کمی کر دی جائے۔ اس ارزانی کی وجہ سے سپاہیوں کو اپنی تنخواہوں میں کمی محسوس نہ ہو گی۔"

علاؤالدین (خلجی) نے اس مشورے کو بہت پسند کیا اور اپنے اراکین سلطنت کی مدد سے چند قواعد مرتب کیے جن پر عمل کرنے سے اشیاء کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی ہو گئی اور بادشاہ کا مقصد پورا ہو گیا۔"

(تاریخ فرشتہ)

مذکورہ واقعہ علاؤالدین خلجی کے مجموعی اقدامات میں سے ایک مثال ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے اس کے تمام تر اقدامات کے پس منظر میں اس کی سیاسی اور فوجی خواہشات موجود تھیں۔ یہ کہنا کہ اس کے پیش نظر عوامی بھلائی کو فوقیت حاصل تھی، درست نہیں ہے۔ عوامی بہبود کے امور بالواسطہ ہی ممکن ہوئے۔

ابتدائی حالات

علاؤالدین خلجی، سلطان جلال خلجی کا بھتیجا تھا۔ اسکی تاریخ پیدائش اور ابتدائی

زندگی کے بارے میں معلومات مسیر نہیں ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اُس نے باقاعدہ طور پر رسمی تعلیم حاصل نہ کی ۔ ابتدا میں البتہ اس نے سپاہیانہ تربیت حاصل کی اور اس میں اعلیٰ مہارت کے درجے تک پہنچا ۔

سلطان جلال خلجی نے اسے اہم عہدوں پر فائز کیا اور اپنی ایک بیٹی سے اس کی شادی کر دی ۔ علاؤالدین خلجی کو جلال خلجی کے خلاف ملک چھجو کی بغاوت میں اہم کردار ادا کرنے پر دو علاقوں کی گورنری دے دی گئی ۔ یہیں سے علاؤالدین خلجی نے جلال خلجی کی نرم رو پالیسیوں پر تنقید شروع کر دی اور اپنے لیے سیاسی عزائم کے لیے سرگرمیاں بھی شروع کر دیں ۔

علاؤالدین نے جلال خلجی کی پالیسیوں کی وجہ سے نالاں امرا کو اپنے ساتھ ملانا شروع کر دیا ۔ 1296ء میں اُس نے دیوگری پر جلال خلجی کی اجازت کے بغیر حملہ کیا اور یہاں سے بہت سا سامان غنیمت اور روپیہ حاصل کیا ۔ اس روپے سے وہ دہلی اور دوسرے اہم مقامات کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ جلال خلجی کو جب اس کے ان عزائم کا علم ہوا تو وہ سخت پریشان ہوا ۔ علاؤالدین خلجی نے ملاقات کے بہانے ، جلال خلجی کو تن تنہا بلوا کر اسے قتل کروا دیا اور اس طرح حکومت پر قابض ہوگیا۔

علاؤالدین خلجی کے سامنے مسائل

(1) بادشاہ بننے کے بعد علاؤالدین خلجی کے سامنے بہت سے مسائل تھے ۔ لوگ اُسے غاصب سمجھتے تھے کیونکہ اُس نے ہوشیاری اور سازش سے اپنے ہی چچا کو قتل کروا دیا تھا ۔ جلال الدین خلجی کے قریبی اور خیر خواہ امرا علاؤالدین سے ناخوش تھے۔ اب ان کو اپنی سلامتی کا مسئلہ بھی در پیش تھا ۔ جلال الدین خلجی کا بڑا بیٹا ایک قابل شخص تھا ۔ وہ ملتان ، پنجاب اور سندھ کا آزاد حکمران تھا ۔ جلال خلجی کے تمام خیر خواہ یہاں جمع ہونا شروع ہو گئے ۔ یہ لوگ علاؤالدین خلجی کے لیے کسی وقت بھی مسئلہ بن سکتے تھے ۔

(2) سلطنتِ دہلی کے اکثر علاقوں میں لوگ بغاوت پر آمادہ تھے ۔ بلبن کے بعد

سیاسی اور انتظامی طور پر مختلف ریاستوں میں مرکز سے آزاد ہونے کی تحریکات جنم لے رہی تھیں ۔

دواب اور اودھ میں امرأ اور دوسرے سیاسی گروہ دہلی کی حکومت سے ناخوش تھے اور اس موقع کی تلاش میں تھے کہ وہ بغاوت کرکے آزاد ہو جائیں ۔

شمالی مغربی سرحدوں پر کھوکھر، خلجیوں کے دشمن تھے۔ منگول کسی وقت بھی ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے تیار تھے ۔

مرکز سے دُور صوبوں ، بنگال ، بہار ، اڑیسہ وغیرہ میں نیم آزاد یا مکمل طور پر آزاد ہندو یا مسلم ریاستیں قائم ہو چکی تھیں ۔ راجستھان ، گجرات اور دوسرے جنوبی علاقہ جات مسلم حکومت کے اثر سے نکل چکے تھے ۔

(3) انتظامی ادارے ایک سیاسی انتشار کے نتیجے میں بالعموم اور جلال خلجی کی پالیسیوں کی وجہ سے بالخصوص اپنی کارکردگی کھو چکے تھے ۔ حکومتی اہل کار سُستی اور بددیانتی کے باعث غیر مؤثر ہو چکے تھے ۔ انتظامی بدحالی کے باعث حکومت کو مالی طور پر بھی سخت دشواری کا سامنا تھا ۔

خلجی کی ابتدائی کامیابیاں

جلال الدین خلجی کے حامی امرأ کی سرگرمیوں کا محور خود اس کا خاندان تھا ۔ جلال خلجی کی بیوہ نے اپنے بڑے بیٹے کی جگہ چھوٹے بیٹے کو تخت نشین کروا دیا جس سے بڑا بیٹا ناراض ہوگیا ۔ ان حالات نے علاؤ الدین کی سیاسی طور پر بڑی مدد کی ۔

علاؤالدین خلجی نے بادشاہت کے اعلان کے بعد دہلی کی طرف پیش قدمی شروع کی ۔ وہ راستے میں لوگوں میں دولت بانٹتا رہا ۔ دولت ملنے سے لوگوں نے علاؤالدین کے چچا کے قتل کے جرم کو بھلا دیا ۔ اسی طریقے سے وہ اُس کے ساتھی بنِ

گئے ۔ دہلی پہنچنے تک علاؤالدین کی فوج میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا ۔ عوام کے نزدیک اب علاؤالدین ایک بہتر بادشاہ بن چکا تھا ۔

اب علاؤالدین خلجی نے جلال خلجی کے خاندان سے نمٹنے کے لیے ایک مضبوط فوج کے ساتھ ملتان پر حملہ کیا ۔ جلال خلجی کے بڑے بیٹے کو اس کے ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار کر لیا گیا اور بعد ازاں اسے قتل کر دیا گیا ۔ جلال خلجی کے دوسرے اہل خانہ کا بھی ایسا ہی حشر ہوا ۔ جو امرأ اقتدار میں اس کے لیے خطرہ ہو سکتے تھے ، ان کو قتل کر کے راستے سے ہٹا دیا گیا ۔ وفادار اور مخلص امرأ کو کلیدی عہدے دیے گئے ۔

خلجی کی خواہشات اور عزائم

کوئی بھی بادشاہ اپنی ذاتی خواہشات اور عزائم کے مطابق ہی اپنے لیے لائحہ عمل مرتب کرتا ہے ۔ اس میں کسی اور ادارے یا افراد کا عمل دخل نہیں ہوتا ۔

علاؤالدین خلجی کی پہلی خواہش تھی کہ وہ دنیا کا ایک بہت بڑا بادشاہ بنے ۔ اس کی ایک وسیع سلطنت ہو اور وہاں اس کی مرضی کے مطابق اسکی حکومت چلے ۔ اپنے حریفوں پر قابو پانے کے بعد اس کا حوصلہ اور خواہشات بڑھیں اور اُس نے پوری دنیا کو فتح کر کے ایک نیا مذہب جاری کرنے کا سوچنا شروع کر دیا ۔ وہ اپنے دربار میں بڑی صراحت کے ساتھ اپنی اس خواہش کا تذکرہ کرتا تھا ۔ امرأ بادشاہ کے، ڈر سے اس کی بات تو سن لیتے مگر اس کے بارے میں کچھ نہ کہتے ۔

علاؤالدین خلجی کا ایک دوست علاء الملکؒ اس سے نسبتاً بے تکلف تھا ۔ اُس نے خلجی کو سمجھایا کہ نیا مذہب شروع کرنے سے اس کی رعایا میں مسلمان ، اس کے خلاف ہو جائیں گے ۔ وسعت سلطنت کے بارے میں اس نے بادشاہ کو سمجھایا کہ اگر وہ سلطنت کو وسیع کرنے کے لیے دنیا کے دور دراز علاقوں میں مہم جوئی کرے گا تو اس کے پیچھے ہندوستان میں بغاوت ہو جائے گی اور یہ علاقہ بھی اس کے ہاتھ سے جاتا رہے گا ۔ یہ سب سن کر علاؤالدین خاموش ہو گیا اور پھر آئندہ کے لیے اُس نے ایسا سوچنے اور کہنے سے توبہ کر لی ۔ البتہ علاؤالدین خلجی نے اپنی اس خواہش کو ہندوستان

کے علاقے تک محدود کر دیا اور یہیں پر وسعت پسندی اور انتظامی بہتری کی طرف توجہ دی ۔

علاؤالدین خلجی کی حکمت عملی

علاؤالدین اپنے نظریے اور طریقِ کار کے اعتبار سے ایک منفرد حثیت رکھتا ہے ۔ اُس نے سابقہ بادشاہوں کے برعکس انتظامی اداروں میں ضمنی ردّ و بدل کی بجائے بنیادی ہیئت اور کارکردگی میں تبدیلی کے نظریے پر عمل کیا۔

شہنشاہیت کے ضمن میں اس کے عمومی رجحانات میں چند ایک یہ تھے ۔

1- علاؤالدین ایک آمر مطلق تھا ۔ وہ بادشاہ کی ذات کو عام انسانوں سے بلند اور بالاتر سمجھتا تھا اور اپنے آپ کو زمین پر اللہ کا نمائندہ سمجھتا تھا ۔ بادشاہت کے سامنے ، اسکی نگاہ میں سب رشتے ہیچ تھے ۔

2- علاؤالدین اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتا تھا ۔ مگر بحیثیت بادشاہ اُس نے خلیفۂ بغداد سے رسمی منشورِ خلافت حاصل نہ کیا ۔ اس سے پہلے التمش نے خلیفۂ بغداد سے یہ منشور حاصل کیا تھا ۔

علاؤالدین مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتا تھا ۔ اس سلسلے میں اسکی قاضی مغیث سے گفتگو بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔

علاؤالدین نے قاضی مغیث کو دربار میں بلوا کر اس سے مختلف معاملات کے بارے میں شرعی وضاحت طلب کی ۔ علاؤالدین ، قاضی مغیث کے نقطۂ نظر کو سنتا رہا اوراس میں ایک بادشاہ کے حیثیت سے رائے دیتا گیا۔ آخر میں اس نے تمام گفتگو کے بارے میں اپنی رائے پیش کی ۔ تاریخ فیروز شاہی نے اس کو اس طرح درج کیا ہے :۔

> "اے قاضی مغیث ، اگرچہ میں علم سے بے بہرہ ہوں اور میں نے کتابیں نہیں پڑھی ہیں ، لیکن میں کئی پشت سے مسلمان ہوں ۔ چونکہ بغاوت میں بے شمار لوگ مارے جاتے ہیں، اس لیے میں ہر اُس چیز کا حکم دیتا ہوں جس سے بغاوت نہ ہو ۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ گستاخی اور عدم توجہی کرتے ہیں اور میرے احکامات بجا نہیں لاتے ، تو میرے لیے

ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے خلاف سخت اقدامات کروں تاکہ وہ میرے فرمانبردار ہو جائیں ۔

میں یہ نہیں جانتا کہ میرے یہ احکام شرع کے مطابق ہیں یا اس کے خلاف ـــــ جس چیز میں اصلاح دیکھتا ہوں اور جو کچھ مجھے مصلحت وقت کے مطابق نظر آتا ہے ، اسی کا میں حکم دیتا ہوں اور میں یہ نہیں جانتا کہ کل بروز قیامت خدا تعالٰی میرے ساتھ کیا کرے گا ۔"

3- علاؤالدین نے نہ صرف کسی بھی مذہبی گروہ کی حکومتی معاملات میں مداخلت ختم کر دی بلکہ دوسرے سیاسی اور غیر سیاسی گروہوں کو بھی مداخلت کی اجازت نہ تھی ۔ کسی قسم کی مداخلت کے خاتمے کی وجہ اصل میں خلجیوں کا صرف اپنی طاقت کے بل بوتے پر اقتدار سنبھالا تھا ۔ اس میں وراثت یا کسی خاص گروہ کی مدد نہ لی گئی تھی ۔ چونکہ یہ اقتدار میں آنے کے سلسلے میں کسی کے محتاج نہ تھے ، اس لیے انھیں کسی گروہ کو خوش رکھنے یا ان کے مفادات کا خیال رکھنے کی بھی چنداں ضرورت نہ رہی تھی ۔ علاؤالدین خلجی خصوصی طور پر صرف اور صرف اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق ہی اُمور طے کرتا تھا ۔ کسی وزیر یا اعلٰی اہلکار کو بھی اس کی مرضی کے خلاف رائے دینے کی جرأت نہ تھی ۔

علاؤالدین خلجی کی سیاسی اور انتظامی اصلاحات

(1) بغاوتیں ، اور ان کا حتمی مداوا

علاؤالدین کے ابتدائی دورِ حکومت میں کئی ایک بغاوتیں ہوئیں ، ان میں 1299ء میں گجرات کے فتح کے بعد مال غنیمت کی تقسیم پر نو مسلموں (1) کے ایک گروہ نے بغاوت کر دی ۔ اس بغاوت کو کچل دیا گیا مگر اس میں علاؤالدین کا بھتیجا قتل ہو گیا ۔

1- یہ لوگ منگول تھے۔ جلال الدین خلجی کے دور میں حملہ آور ہوئے مگر شکست کھائی۔ بعد میں یہ لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔

ایک دفعہ علاؤالدین نے ایک علاقے پر حملہ کیا ۔ راستے میں وہ ایک دن شکار میں مصروف ہوگیا ۔ اس وقت اس کے ساتھ صرف چند ساتھی تھے ۔ اسی اثنا میں اس کے اپنے ہی رشتے داروں نے اس پر حملہ کر دیا ۔ حملے میں علاؤالدین بے ہوش ہوگیا ۔ حملہ آوروں نے اس کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا اور حرم میں داخل ہو کر عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کی کوشش کی ۔ علاؤالدین کو جب ہوش آیا تو اُس نے کارروائی کرکے حملہ آوروں کو بھگا دیا ۔

ایک بغاوت علاؤالدین کے ایک قریبی رشتہ دار نے کی ، اُسے بھی پکڑ کر قتل کر دیا گیا ۔ اسی طرح علاؤالدین کی ایک علاقے میں مہم کے دوران اس کی دہلی سے غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر ایک بغاوت کی گئی ، اسے بھی دبا دیا گیا ۔

اگرچہ ان تمام بغاوتوں کو دبا دیا گیا مگر ایک قلیل عرصے میں اتنی زیادہ بغاوتوں کے روپذیر ہونے سے علاؤالدین کو سخت پریشانی تھی ۔ اس کا خیال تھا کہ مسلسل بغاوتوں سے سیاسی قوت میں انتشار آ جاتا ہے اور پھر بادشاہت کے دور میں کسی بھی مخالف گروہ کا بغاوت پر اتر آنا ایک عام طریقہ بن چکا تھا ۔

علاؤالدین بغاوتوں کے رو پذیر ہونے کے محرکات کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کا تدارک مستقل بنیادوں پر کرنا چاہتا تھا ۔ اس سلسلے میں اُس نے اپنے امرأ سے مشورے کیے اور بغاوتوں کے رو پذیر ہونے کے محرکات اور احوال کا جائزہ لیا ۔ علاؤالدین کے مشاہدے اور تجزیے کے مطابق ، بغاوتوں کے محرکات مندرجہ ذیل تھے ۔ اس کا خیال تھا کہ ان محرکات کا سد باب کرکے بغاوتوں کا حقیقی خاتمہ کیا جاسکتا ہے ۔

1- علاؤالدین کا خیال تھا کہ "دولت کی فراوانی کے باعث اہم گروہوں میں طاقت مرتکز ہو جاتی ہے اور ان کے پاس کرنے کو کچھ کام نہیں رہتا ۔ اس فراغت کے باعث ان کی توجہ بُرے خیالات اور بغاوت کی طرف ہو جاتی ہے ۔"

اِس محرکِ سازش کے سدّباب کے لیے ، علاؤالدین نے حکم دیا کہ امرأ سے روپیہ لے لیا جائے ۔ اگر کسی کے پاس جاگیر ہو تو وہ بھی واپس لے لی جائے ۔ اِس حکم پر

سختی سے عمل کیا گیا اور اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومتی اہلکاروں اور ساہو کاروں کے علاوہ کسی کے پاس کچھ نہ بچا ۔ علاؤالدین نے حکومتی وظائف ، انعامات اور وقف کی صورت میں دی گئی مراعات یا قطعہ اراضی بھی واپس لے لیں۔

ان اقدامات سے ہر شخص روزی کمانے میں ایسا مصروف ہوگیا کہ بغاوت تو دُور کی بات ہے ، کسی کو اپنا ہوش تک نہ رہا ۔

2- محکمہ جاسوسی کا بنیادی مقصد حکومت کو عوام کے اندازِ سوچ ، ضروریات یا اس (حکومت) کے خلاف کسی قسم کی سازش یا سرگرمیوں سے آگاہ کرنا ہوتا ہے ۔ علاؤالدین کو وراثت میں جو محکمہ جاسوسی ملا وہ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے مؤثر نہ تھا ۔ اس طرح بادشاہ عام لوگوں کے احوال عمومی اور اہم سیاسی رجحانات سے بے خبر رہتا تھا ۔

علاؤالدین نے ایک مؤثر نظام جاسوسی جاری کیا ۔ اس پر سختی سے عمل کروایا گیا اور اب عالم یہ تھا کہ بادشاہ نہ صرف ہر معاملے سے باخبر رہتا تھا بلکہ لوگوں سے کسی سازش کے بارے میں سوچنے کی ہمت بھی چھین لی گئی ۔ اس کے بارے میں تاریخ فیروز شاہی میں درج ہے ۔

"امرأ و ملوک ، اکابر و مصارف اور اہلکارانِ حکومت کے گھروں میں (رات کو) جو کچھ ہوتا ، صبح ہوتے ہیں اسکی اطلاع جاسوسوں کی رپورٹ کے ذریعے بادشاہ کو پہنچ جاتی ۔ جاسوسی کی رپورٹ میں جو کچھ ہوتا ، اس کو فروگذاشت نہیں کیا جاتا تھا ۔ اس کے بارے میں جواب طلب کیا جاتا تھا ۔ جاسوسوں کی کارروائی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ہزاروں ستونوں کے اندر بھی چھپ کر کھل کر بات کرنا ممکن نہ رہا تھا ۔ امرأ اگر کوئی بات کرتے بھی تو اشارے سے کہتے ، اور اپنے گھروں میں دن رات جاسوسوں کی رپورٹوں سے ڈرتے رہتے تھے ۔"

(3) علاؤالدین کا خیال تھا کہ شراب نوشی کی محفلوں میں امرأ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں اور اس ماحول میں سازشیں جنم لیتی ہیں ۔

علاؤالدین نے شراب نوشی ، شراب فروشی اور بعد ازاں جوا وغیرہ کھیلنے کی ممانعت کر دی ۔ ایسے جرائم کے مرتکب افراد کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں ۔ ان سزاؤں کے لیے انھیں کنوؤں اور قید خانوں میں رکھا جاتا تھا ۔ اِس فرمان پر عمل کرنے کی ابتدا شاہی محل سے کی گئی ، ـــ شاہی مجلس خانے میں شراب نوشی کے تمام برتن اور شراب ضائع کر دی گئی ۔ بقول برنی ، جو شراب پھینکی گئی تھی ، اتنی زیادہ تھی کہ زمین پر ساون (برسات) کی طرح کیچڑ اور گیلی مٹی نظر آنے لگی ۔

(4) علاؤالدین کے خیال میں سازشوں اور بغاوتوں کی ایک اور اہم وجہ ، امرأ کے درمیان سماجی تعلقات اور باہمی شادیاں تھیں ۔ ایسے تعلق سے امرأ کے درمیان یگانگت بڑھ جاتی تھی اور پھر یہ مل کر بادشاہ کے خلاف سازشیں کرتے تھے ۔

علاؤالدین نے حکم جاری کیا کہ ملوک ، امرأ ، بزرگان اور معتبرانِ شہر ایک دوسرے کے گھر نہ جائیں ، نہ ضیافتیں کریں ، نہ جلسے منعقد کریں اور نہ ہی بادشاہ کی اجازت کے بغیر آپس میں قرابت داریاں کریں ۔ اس حکم پر بڑی سختی سے عمل کروایا گیا ۔ ان لوگوں کے گھروں میں اجنبیوں کو بھی آنے کی اجازت حکومت سے لینا پڑتی تھی!

2- ٹیکس اور مالیاتی نظام

ٹیکس یا مالیاتی نظام میں بہتری کی صورت میں لامحالہ حکومتی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے ۔ اس آمدنی سے کوئی بھی حکمران یا بادشاہ بہتر فوج اور اپنی دوسری ضروریات اور خواہشات کو پورا کر سکتا ہے ۔

مالی نقطۂ نظر سے علاؤالدین کے سامنے یہ مسائل تھے ۔

(الف) داخلی طور پر سازشوں پر قابو پانے کے لیے اگرچہ بڑے مؤثر اقدامات کیے گئے تھے ، مگر ہندو ریاستوں کی طرف سے علاؤالدین اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتا تھا ۔ خارجی اعتبار سے منگولوں کے حملے کا خوف متواتر اُسے پریشان کر رہا تھا ۔

ان تمام مسائل کی نوعیت نہایت اہم اور بنیادی تھی ۔ ان مسائل کا واحد حل ایک مضبوط فوج کا قیام تھا۔ اِس کے لیے کثیر رقم درکار تھی اور فوری طور پر شاہی خزانہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا ۔ ایسے حالات میں مالی صورتحال کو بہتر کرنے کے لیے اقدامات اشد ضروری تھے ۔

(ب) سابقہ حکومتوں کے مالیاتی نظام میں "درمیانے آدمی" کا کردار بہت اہمیت حاصل کر گیا تھا ۔ یہ لوگ ریاست اور مالیہ ادا کرنے والوں کے درمیان رابطے کا کام کرتے تھے ۔ یہ لوگ کسانوں سے زیادہ سے زیادہ مالیہ وصول کرتے ، مگر حکومت کو کم سے کم مالیہ جمع کرواتے تھے ۔ اِس بد دیانتی سے کمائی ہوئی رقوم سے انھوں نے بہت سی جائدادیں خرید رکھی تھیں اور معاشرے اور حکومت میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا ۔ اِس حیثیت سے یہ لوگ سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے ۔ ان کی بد دیانتی کو ختم کرنے سے ان کی سیاسی حیثیت خود بخود ختم ہو سکتی تھی ، جو سیاسی طور پر بادشاہ کے لیے بہت اہم معاملہ تھا ۔

علاؤالدین نے جملہ مسائل کے حل کے لیے چند اصلاحی نوعیت کے اقدامات کیے:۔

(i) علاؤالدین نے ہر قسم کی ملکیت کو بحقِ سرکار ضبط کرنے کا حکم دیا ۔ اس میں وہ املاک بھی شامل تھیں جو سابقہ حکمرانوں نے کسی فرد کو بطورِ گرانٹ ، تحفہ و انعام ، خیراتی وقف یا بطور پنشن دی تھیں ۔ ان لوگوں میں اکثر لوگ وہ تھے جو اب حکومت میں نہیں تھے اور نہ ہی کسی اور صورت میں حکومت کے لیے کچھ کام کر رہے تھے ۔ علاؤالدین نے ان لوگوں سے سب جائدادیں لے کر اپنی حکومت کے اہم اہلکاروں یا ان لوگوں کو دے دیں جو حکومت کے لیے مدد گار ہو سکتے تھے ۔

ان تمام معاملات کا حساب کتاب رکھا جاتا تھا تاکہ بادشاہ کو علم رہے کہ کس کس کے پاس کتنی زمین ہے۔

ان اقدامات سے بادشاہ کے علاوہ کسی اور کو کسی قسم کی گرانٹ دینے کا اختیار نہ

رہا ۔ بادشاہ نے زمینی جائداد کے بجائے روپیہ پیسہ بطور انعام وغیرہ دینا شروع کر دیا ۔

ان اقدامات سے پرانے جاگیرداروں کا سیاسی اثر نہ ہونے کے برابر رہ گیا اور وہ بادشاہ کے رحم و کرم پر رہ گئے ۔ بادشاہ صرف اپنے لیے مفید اور مخلص لوگوں کی پذیرائی کرتا اور دوسرے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا تھا۔

(ii) ٹیکس اکٹھا کرنے والے لوگوں کی بد دیانتی اور ان کے سیاسی اثر کے بارے میں علاؤالدین نے قاضی مغیث کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا "(یہ لوگ) گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں ، عمدہ کپڑے پہنتے ہیں ۔۔۔ ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہیں اور شکار کھیلتے ہیں اور جزیہ و دیگر محصولات سے حکومت کو کچھ نہیں دیتے ۔۔۔ مجلسیں منعقد کرتے ہیں ، ان میں بعض دیوان (وزارت) میں ہرگز نہیں آتے اور اپنے افسروں کی پرواہ نہیں کرتے۔" (تاریخ فیروزشاہی)

اِس کام پر زیادہ تر ہندو لوگ کام کرتے تھے۔ علاؤالدین نے ان کی مراعات ختم کر دیں اور مالیہ اکٹھا کرنے کا کام ان سے واپس لے لیا۔ تمام ٹیکس گزاروں کو حکم دیا گیا کہ وہ کسی بڑے یا چھوٹے زمیندار کی تمیز کیے بغیر براہِ راست ٹیکس جمع کروائیں۔

ٹیکس جمع کرنے والوں کی حالت بقول برنی اس قدر پتلی ہو گئی کہ ان کی بیویاں مسلمانوں کے گھروں میں معمولی کام کرنے پر مجبور ہو گئیں ۔ اِن اقدام سے سازشوں میں ممکنہ طور پر معاون بااثر ہندو گروہ کا خاتمہ ہو گیا اور براہ راست ٹیکس کے نظام سے حکومتی آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ۔

(iii) علاؤالدین نے مالیے کی حد مجموعی پیداوار کا 1/2 حصّہ مقرر کی ۔ ایک مقررہ پیمانے اور معیارِ پیداوار کے مطابق مالیے کا تعین کیا جاتا تھا ۔ مالیہ نقدی یا جنس کی صورت میں ادا کیا جا سکتا تھا ۔ تاہم اس ضمن میں جنس کو ترجیح دی جاتی تھی ۔ یہ نظام مسلمان حکمرانوں میں سب پہلے علاؤالدین نے رائج کیا ۔ مالیے کا معیار فی ایکڑ پیداوار کی بجائے فی ایکڑ اراضی مقرر کیا گیا تھا ۔ پیداوار کی کمی یا زیادتی کا مالیے کی ادائیگی سے کوئی تعلق نہ تھا ۔

(iv) علاؤالدین نے ٹیکس کا دائرہ بڑھانے اور اس طرح اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے کئی ایک نئے ٹیکس جاری کیے ۔ ان میں ہاؤس ٹیکس ، جانور چرانے کا ٹیکس ، دودھ دینے والے جانور مثلاً گائے ، بھینس اور بکری پر ٹیکس ، تاہم اس ٹیکس سے دو گائے یا دس بکریاں یا اس سے کم تعداد مستثنیٰ تھی۔ اس کے علاوہ آبپاشی ٹیکس اور درآمدی و برآمدی ٹیکس ، حسب سابق جاری رکھے گئے۔

ان تمام ٹیکسوں کا بوجھ دوسرے طبقوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ عام کسانوں پر پڑا ۔ ایک کسان کو اپنی پیداوار کا 75 سے 80 فیصد حصّہ سرکاری ٹیکس کی صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا ۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ علاؤالدین کے نظام مالیہ پر عمل درآمد صرف دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں کیا گیا۔ جنوبی اور مرکز سے دُور علاقوں میں اِس پر عمل نہ کیا جا سکا۔

مالیاتی انتظام کو بہتر بنانے کے لیے ایک نیا محکمہ بنایا گیا۔ جس میں نئے اہلکار بھرتی کیے گئے۔ اگرچہ مکمل طور پر مالی بددیانتی کو ختم نہ کیا جا سکا تاہم مجموعی طور پر اس کے انتظام میں اصلاح ہوئی۔ حکومتی آمدنی میں اضافہ ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علاؤالدین ایک مخالف سیاسی گروہ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

3- فوجی نظام

علاؤالدین سے پہلے فوجی انتظام کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ انحصار جاگیرداروں پر کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں بلبن نے کچھ بہتری کی ۔ مگر علاؤالدین کے زمانے میں اس کی صورتحال یہ تھی کہ جاگیردار اور امرا ہی فوجیوں کی تربیت اور سامان جنگ کا انتظام کرتے تھے۔ اس کام کے لیے انھیں جاگیریں دی جاتی تھیں اور جاگیروں سے حاصل شدہ مالیہ سے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ سپاہیوں کو تنخواہ کے عوض سرکاری مالیہ وصول کرنے کا پروانہ دے دیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک عام سپاہی کو خاصی دقّت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

علاؤالدین فوج کی تیاری کے سلسلے میں جاگیرداروں کی محتاجی سے سخت نالاں تھا۔ جاگیردار بوقت ضرورت مناسب انتظام نہ کر پاتے تو غیر تربیت یافتہ فوجی، ناکارہ ہتھیار اور کمزور جانور فراہم کر دیتے۔ علاؤالدین اپنے فوجی مسائل کے حوالے سے اس انتظام کو ناقص اور غیر مؤثر سمجھتا تھا۔

علاؤالدین نے ایک مستقل فوج کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ اس کی تمام تر ذمہ داری مرکز کے سپرد تھی اور یہ فوج مرکز میں کسی بھی مقابلے کے لیے ہر دم تیار رہتی تھی۔ کسی بھی متوقع بد دیانتی کو روکنے کے لیے ہر سپاہی کا حلیہ درج کیا جاتا تھا اور جانوروں کو داغا جاتا تھا۔ یہ طریقہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ علاؤالدین نے رائج کیا۔ اکثر اوقات فوج کا بڑی احتیاط سے معائنہ کیا جاتا تھا۔ فوجی نقطۂ نظر سے اہم قلعوں کی تعمیر نو کی گئی اور ان پر مستقل فوج متعین کی گئی۔ یہاں پر سپاہیوں اور جانوروں کی خوراک کو گوداموں میں محفوظ رکھا جاتا تھا، تاکہ حالت جنگ میں غلے میں کمی نہ ہو ۔ سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہ ادا کی جاتی تھی۔

4- منڈی اور قیمتوں کے تعین کا نظام

ایک بہت بڑی فوج کو باقاعدہ تنخواہوں کی ادائیگی کا شاہی خزانہ متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ بقول فرشتہ، علاؤالدین کی فوج کی تعداد چار لاکھ پچھتر ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ان کے طعام و رہائش ، فوجی سامان اور تنخواہوں کے لیے ایک کثیر رقم کی ضرورت تھی۔

علاؤالدین نے فوج کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ابتدا میں تنخواہیں بڑھانے کا فیصلہ کیا ۔ مگر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ خزانہ اس اضافے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ آخر اس نے یہ ترکیب نکالی کہ سپاہیوں کی تنخواہوں میں اضافے کی بجائے فوجیوں کی ضروریات کی اشیاء کی قیمتوں میں کمی کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ اس اقدام سے ہر فوجی اپنی موجودہ تنخواہ میں بھی بخوبی گزارہ کر سکتا تھا ۔ دہلی اور اس کے گردونواح میں تاجر، مصنوعی قلت پیدا کر کے اجناس کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے تھے۔ ان کو راہ راست پر لانا بھی ضروری تھا تاکہ عام لوگوں کو اپنی ضرورت کی اشیاء بلاوجہ مہنگے داموں نہ خریدنا

پڑیں۔

اس سلسلے میں علاؤالدین نے درج ذیل اقدامات کیے۔

1- ہر قابل فروخت چیز کی قیمت فروخت کا تعین کر دیا گیا۔ ان میں روزمرہ استعمال کی اشیاء ، غلام ، جانور اور گھوڑے وغیرہ شامل تھے۔

2- روزمرہ استعمال کی اشیاء کے لیے منڈیاں مقرر کی گئیں۔ اس کے علاوہ جانوروں اور غلاموں کی منڈیاں بھی مقرر تھیں۔

3- کسی قسم کی متوقع قلت سے بچنے کے لیے اجناس کو گوداموں میں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔

عام حالات میں لوگ جتنا چاہیں ، غلہ خرید سکتے تھے۔ البتہ غلے میں قلت کی صورت میں ایک خاندان کو نصف من (1) سے زیادہ غلہ نہ دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی مقررہ حد سے زیادہ غلہ خریدنے کی کوشش کرتا تو اُسے پکڑ کر سزا دی جاتی تھی۔ ذخیرہ اندوزوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ منڈی کے اعلیٰ افسر کے علاوہ جاسوس بھی منڈی میں چلتے نرخوں کا جائزہ لے کر بادشاہ کو مطلع کرتے رہتے تھے۔ کسی بھی فرق کی صورت میں کڑی سزا دی جاتی تھی۔

کپڑے کے سوداگروں کو حکومت قرضے فراہم کرتی تھی۔ کپڑے کے سوداگر اندرون اور بیرونِ ملک سے کپڑا منڈیوں میں لاکر فروخت کرتے تھے۔ سوداگروں سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ وہ کپڑے کو مقررہ قیمت پر فروخت کریں گے۔

دلچسپی کے لیے مختلف اشیاء کی قیمتوں کا ایک چارٹ حسب ذیل ہے۔

1 — عمدہ قسم کا کپڑا	ایک ٹنکہ (1) فی تھان (2)
2 — گندم	$7\frac{1}{2}$ جیتل (3) فی من
3 — دھان	5 جیتل فی من

(3,2,1 ، فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

1- اُس زمانے میں چالیس سیر کا ایک من ہوتا تھا۔ البتہ ایک سیر چوبیس تولے کے مساوی تھا۔ اس طرح ایک من آج کل کے حساب سے تقریباً 11 کلوگرام کا بنتا تھا۔

(i) غلام لڑکا 20 سے 30 ٹنکے

(ii) مزدور لڑکی 5 سے 12 ٹنکے

(iii) خوبصورت لڑکی 40 ٹنکے

(iv) باسلیقہ ، خوبصورت لڑکی 100 سے 200 ٹنکے

اکثر مؤرخین کی رائے ہے کہ قیمتوں کے اس نظام کا نفاذ صرف دہلی اور اس کے گرد و نواح میں ہی ممکن ہو سکا ۔ تاہم علاؤالدین کے یہ اقدامات اس کی فوجی اور سیاسی ضروریات کے لیے نہایت اہم ثابت ہوئے۔

4 — ماش 5 جیتل فی من

5 — چنا 5 جیتل فی من

6 — اعلیٰ نسل کا گھوڑا 100 سے 120 ٹنکہ

7 — اعلیٰ نسل کا بیل 4 یا 5 ٹنکے

8 — دودھ دینے والی گائے یا بھینس 10 یا 12 ٹنکے

اُس زمانے میں غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت عام تھی۔ بلکہ جس کے پاس زیادہ غلام یا کنیزیں ہوتی تھیں، اس کو اتنا زیادہ معتبر اور اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ علاؤالدین نے ان کی بھی قیمتیں مقرر کر دی تھیں۔

سلطنت میں وسعت

علاؤالدین کی خواہش تھی کہ اس کی سلطنت زیادہ سے زیادہ وسیع ہو ۔ ابتدائی دور میں تو وہ پوری دنیا کو فتح کرنے کی خواہش رکھتا تھا مگر اُس نے ایک دوست کے

1- ٹنکہ ، آج کل کے حساب سے ایک روپے کے برابر بنتا ہے۔

2- ایک تھان ، اس زمانے میں تقریباً 19 میٹر کا ہوتا تھا۔

3- ایک جیتل آج کل کے حساب سے ڈیڑھ پیسے کے برابر بنتا ہے۔

سمجھانے پر یہ ارادہ تو ترک کر دیا تاہم اُس نے ہندوستان کے علاقہ جات کو فتح کرکے اپنی خواہش کو پورا کرنے کی سعی کی۔ وہ اپنے آپ کو سکندر ثانی کہلوانا پسند کرتا تھا۔

علاؤالدین کی فتوحات کی فہرست بہت طویل ہے جو اس کتاب میں سمونا مشکل ہے۔ ضروری معلومات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ (اس ضمن میں نقشے کو سامنے رکھیں)

شمال مغربی ہندوستان

گجرات اور جیسلمیر : گجرات بہت بڑی قدرتی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ قطب الدین ایبک نے اسے ایک مرتبہ فتح تو کر لیا تھا مگر یہ سلطنت دہلی کا حصّہ نہ بن سکا ۔ علاؤالدین نے 1298ء میں اسے فتح کیا ۔ یہاں سے اُسے بہت سا مال غنیمت ملا۔ یہاں کے راجا کی بیوی بھی اس مال غنیمت میں شامل تھی۔ علاؤالدین نے اس سے شادی کر لی۔ یہیں سے علاؤالدین کے ایک سپہ سالار نے ایک خوبصورت غلام بھی خریدا۔ جس نے بعد میں جنوبی ہندوستان کی فتوحات میں بڑا اہم کردار ادا کیا ۔ اس غلام کا نام "کافور ہزار دیناری" تھا۔

رنتھمبور 1303ء میں فتح ہوا۔

چتوڑ :

یہ علاقہ راجپوتوں کا مرکز تھا۔ راجپوتوں نے یہاں پر منگولوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ راجپوتوں کی طاقت کے مرتکز ہونے کے باعث، اسے ناقابلِ تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ چتوڑ کے قلعے کے اردگرد پہاڑیوں اور جنگلات نے اسے اور بھی محفوظ بنا دیا تھا۔

چتوڑ کی مہم کی کمان ، علاؤالدین نے خود سنبھالی ۔ ایک سخت مقابلے کے بعد راجپوتوں نے خراج دینا منظور کر لیا۔

مالوہ :

یہ علاقہ بھی ابھی تک کوئی سلطان فتح نہ کر سکا تھا۔ ابتدائی حملوں میں علاؤالدین کو بھی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ایک راجپوت نے ایک سازش کرکے قلعے کا ایک خفیہ راستہ بتا دیا ۔ علاؤالدین نے اچانک حملہ کرکے قلعہ فتح کر لیا اور اس کے اردگرد کے علاقوں کو
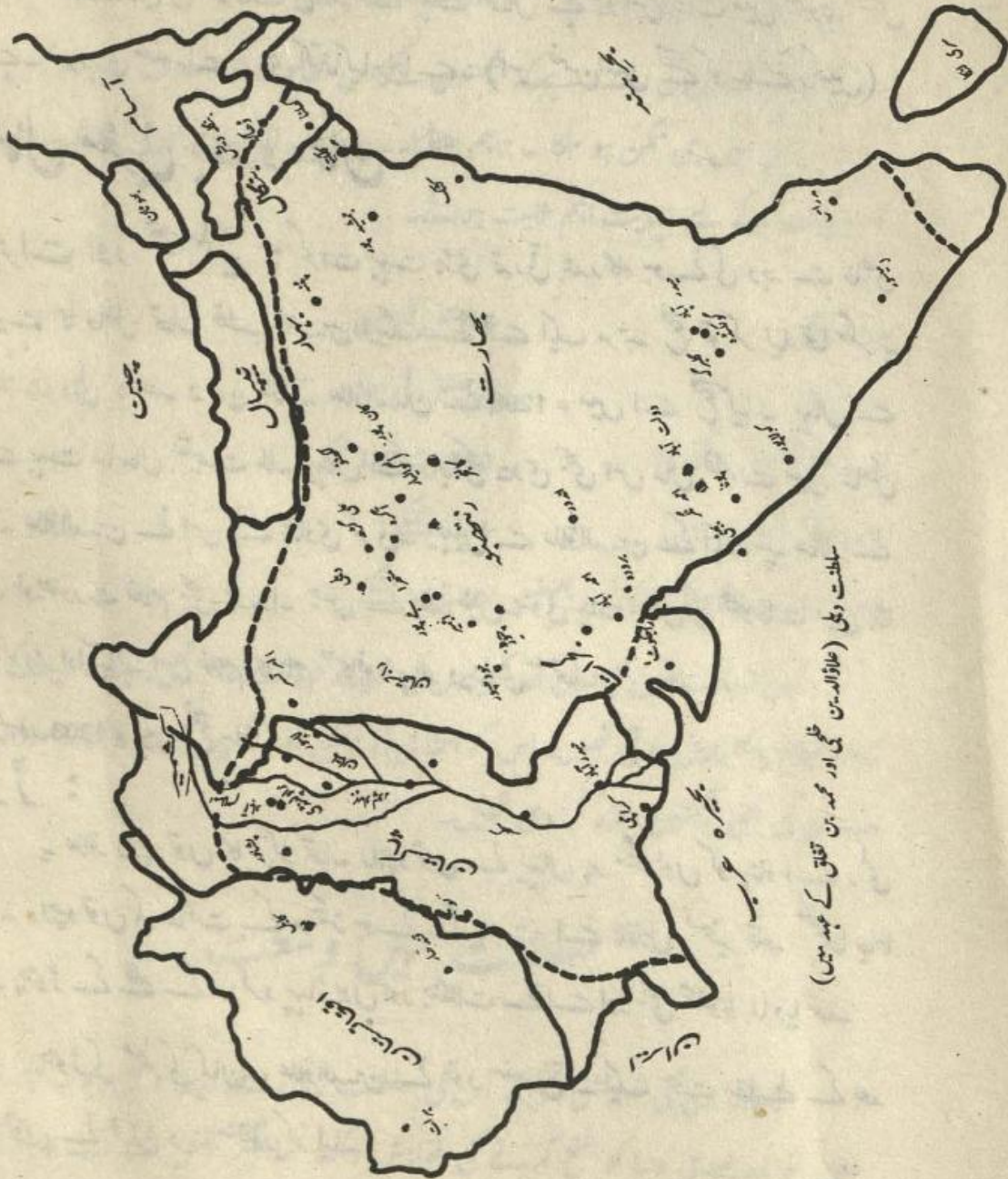
سلطنت دہلی (علاؤالدین خلجی اور محمد بن تغلق کے عہد میں)

بھی قبضے میں لے لیا گیا۔

مالوہ کی فتح کے بعد 1308ء میں علاؤالدین نے راجپوتوں کے اہم مراکز سیوانہ اور جالور کو فتح کر کے راجستھان کی فتح مکمل کر لی۔

جنوبی ہندوستان

جنوبی ہندوستان اب تک مسلمان حکمرانوں کی فتوحات میں شامل نہ ہو سکا تھا۔ علاؤالدین نے بادشاہ بننے سے پہلے جنوبی ہندوستان میں دیوگری کے علاقے پر حملہ کر کے بہت سی دولت حاصل کی تھی۔

علاؤالدین ، جنوبی ہندوستان کی مرکز سے دُوری اور یہاں کے حالات کے تناظر میں بخوبی سمجھتا تھا کہ یہاں کسی علاقے کو فتح کر کے مستقل طور پر سلطنت میں شامل نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ علاؤالدین کا حقیقت پر مبنی تجزیہ تھا۔ اسی تناظر میں علاؤالدین نے یہ پالیسی مرتب کی کہ جنوبی ہندوستان کے راجاؤں کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ اس کی بادشاہت کو قبول کر لیں ، اطاعت گزار رہیں اور سالانہ خراج ادا کرتے رہیں۔

اُس وقت جنوبی ہندوستان میں چار بڑی ریاستیں ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھیں۔ ان ریاستوں میں مخاصمت اس قدر زیادہ تھی کہ علاؤالدین کے حملے کے وقت ایک راجا کے سوا کسی نے دوسرے کی مدد نہ کی۔ اس اندرونی بد اعتمادی کا علاؤالدین کو فائدہ پہنچا اور اس نے ایک ایک کر کے چاروں ریاستوں کو اپنا اطاعت گزار بنا لیا۔ یہ ریاستیں تھیں ، دیوگری، جو 1308ء میں ، تیلنگانا 1310ء میں ، ہوئیسالا 1311ء میں اور پانڈیہ 1315ء میں فتح ہوئیں۔ تاریخ فیروزشاہی میں رقم ہے کہ اس علاقے کا فاتح ملک کافور جب دہلی میں واپس آیا تو مال غنیمت میں 612 ہاتھی، 20,000 گھوڑے، 96,000 من سونا، 500 من ہیرے جواہرات کے علاوہ بیش قیمت کپڑے اور گراں قدر نوادرات شامل تھے۔

علاؤالدین نے براہ راست فتوحات کر کے یا اطاعت گزار بنا کر ایک بہت بڑا علاقہ زیرنگیں کر لیا۔ اتنا بڑا علاقہ سلطنت دہلی میں پہلے کبھی شامل نہ تھا۔ علاؤالدین کی فتوحات کی وسعت نقشے میں ملاحظہ کریں۔

شمالی علاقہ جات اور منگولوں کے حملے

علاؤالدین کے دورِ حکومت میں منگول ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ جات سے حملہ آور ہوتے رہے۔ اُس وقت منگولوں کی قوت پہلے کے مقابلے میں خاصی کم ہوچکی تھی۔ اس کی وجہ ان کے درمیان گروہ بندی کا جنم لینا تھا۔ تاہم وہ ایشیا میں اب بھی ایک اہم طاقت کی حیثیت کے حامل تھے۔

علاؤالدین کے دور میں منگولوں کے حملوں میں شدت آگئی۔ پہلے وہ ہندوستان پر حملے کرتے، یہاں لوٹ مار کرتے اور مال و اسباب اکٹھا کرکے واپس چلے جاتے تھے۔ اب منگولوں کے حملوں کی نوعیت وسعت پسندانہ تھی۔ وہ ہندوستان کے علاقوں پر قبضہ کرکے انھیں اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس جارحانہ انداز میں ان کی مدد وہ مقامی گروہ بھی کر رہے تھے جو سلاطین دہلی سے نالاں تھے۔ وہ منگولوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار اور غارت گری کرکے حکومت کو انتظامی طور پر کمزور کرنا چاہتے تھے۔

منگولوں نے ہندوستان پر بے شمار حملے کیے، ان کا اجمالی جائزہ یہ ہے:

پہلا حملہ:

علاؤالدین کے سلطان بننے کے کچھ دیر بعد 98-1297ء میں منگولوں کا پہلا حملہ ہوا۔ اس میں ایک لاکھ منگولوں نے حِصّہ لیا۔ یہ حملہ پسپا کر دیا گیا اور اس جنگ میں 20 ہزار منگول قتل ہوئے۔ ان کے بیوی بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔

دوسرا حملہ:

یہ حملہ 1299ء میں ہوا۔ منگولوں نے سیون (سیستان) پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں علاؤالدین کے سپہ سالار نے اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔

تیسرا حملہ :

1299ء میں ہی منگولوں نے ہندوستان پر ایک اور حملہ کیا۔ اب منگول ہندوستان فتح کرنے کے خیال میں تھے اور ان کا لشکر دو لاکھ گھوڑسواروں پر مشتمل تھا۔ راستے میں کسی قسم کی لڑائی سے اجتناب کرتے ہوئے، منگولوں کی فوج دہلی کے گرد و نواح میں پہنچ گئی۔ علاؤالدین نے بڑی عقل مندی اور جنگی بصیرت سے جنگ کی منصوبہ بندی کی ۔ یہ بڑا کڑا وقت تھا مگر علاؤالدین نے تحمل اور دانش کا دامن نہ چھوڑا۔ اُس کے ساتھی اسے کھلے میدان میں لڑنے سے منع کر رہے تھے، مگر علاؤالدین نے اسے فوج کے اجتماعی جذبہ جنگ کے لیے نقصان دہ قرار دیا ۔ یہ اقدام بزدلی بھی گردانا جا سکتا تھا۔ آخر اس نے بھرپور طریقے سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے روز دہلی کے قریب ایک میدان میں علاؤالدین اپنی فوج کے ساتھ اُترا ۔ اس نے ایک طے شدہ منصوبہ بندی کے مطابق منگولوں کی فوج کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا۔ دونوں اطراف سے سپاہی جی توڑ کر لڑے۔ شدید جنگ ہوئی ۔ منگولوں کو علاؤالدین کی قوت کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا۔ انھوں نے مزید جنگ سے احتراز کیا اور واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

چوتھا حملہ:

یہ حملہ 1303ء میں ہوا۔ اُس وقت علاؤالدین کو چتوڑ سے واپس آئے چند ماہ ہی گزرے تھے۔ منگولوں نے بڑی سرعت کے ساتھ پیش قدمی کی تاکہ صوبائی گورنر علاؤالدین کی امداد کو نہ پہنچ سکیں۔ علاؤالدین کی فوج بھی ایک طویل مہم کے بعد باقاعدہ طور پر لڑنے کی اہل نہ تھی۔ علاؤالدین نے قلعہ بند ہو کر دفاعی انداز میں منگولوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ منگولوں نے دہلی کے مضافات کو تہ و بالا کر دیا اور قلعے کا محاصرہ دو ماہ تک جاری رکھا۔ منگول محاصرے کی جنگی تکنیک سے نابلد تھے، اس لیے قلعہ فتح نہ کر سکے۔

اسی جنگ کے بعد علاؤالدین نے سرحدی دفاع کا منصوبہ بنایا اور اہم مقامات پر قلعہ بندی کروائی ۔ اس نے شمال مغربی علاقوں کے لیے علٰحدہ گورنر بھی مقرر کیا ۔

پانچواں حملہ :

یہ حملہ 1305ء میں ہوا۔ ملک کافور اور غازی ملک کے ساتھ منگولوں کا مقابلہ ہوا اور انھیں خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔

چھٹا حملہ :

1306ء میں ہوا۔ منگولوں نے دو اطراف سے یہ حملہ کیا۔ علاؤالدین کے سپہ سالاروں، ملک کافور اور غازی ملک نے منگولوں کو شکست دی۔ اس جنگ میں پچاس ہزار افراد گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں سے مردوں کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے روند دیا گیا۔ بچوں اور عورتوں کو غلام بنا لیا گیا۔

منگولوں نے متواتر کئی حملے کیے، مگر ان تمام حملوں کو ناکام بنا دیا گیا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ بات غور طلب ہے کہ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے زمانے میں منگول پورے ایشیا میں ناقابلِ تسخیر سمجھے جاتے تھے، اب وہ کیوں کمزور اور پس ماندہ ہو گئے تھے؟ اس کے چند عوامل پیش کیے جاتے ہیں۔

1- ہلاکو خاں کے انتقال کے بعد مختلف قبائل نے اپنے طور پر انفرادی سیاسی مقاصد بنالیے تھے۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کو اپنا حریف سمجھتا تھا۔ ان حالات میں چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے دور میں پیدا شدہ باہمی اتحاد ختم ہو کر رہ گیا۔

2- ہندوستان پر حملوں کے دوران، منگول اپنے لشکر میں بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو بھی ہمراہ لے آتے تھے۔ یہ فوجی نقطہ نظر سے بہت بڑی غلطی تھی۔ جنگ میں ذرا بھر مخدوش حالت سے ایک طرف فوج کو تو مشکل کا سامنا ہو ہی جاتا تھا، اُس وقت بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کی حفاظت کی اضافی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہو جاتی تھی۔ اس طرح فوج کی توجہ جنگ کی طرف سے کم ہو جاتی تھی اور نتیجتاً انھیں ہزیمت اٹھانا پڑتی۔

3- منگول، چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے زمانے میں اپنی سیاسی اور فوجی پوزیشن کو مستحکم کر رہے تھے اور اس وقت انھیں وسط ایشیا میں طاقت ور حکمران کا سامنا

تھا۔ چونکہ یہ ان کی بقا کی جنگیں تھیں ، اس لیے انھوں نے نہایت محنت اور لگن سے اپنے آپ کو ہر لحاظ سے مستعد اور طاقت ور رکھنے کی کوشش کی۔

ہلاکو خان کے بعد آنے والی منگول نسلوں میں بقا کی جنگ کے برعکس وُسعت پسندی کا نظریہ غالب تھا ۔ اس وسعت پسندی کے لیے وہ نہ تو مستعدی سے کام لے رہے تھے اور نہ ہی اپنی فوجی قوت کو مستحکم کر رہے تھے ۔ اس نسل کے لوگوں کو بنی بنائی فوجی اور سیاسی ساکھ اپنے بزرگوں سے ملی تھی۔ اب یہ سُستی اور کاہلی کا شکار ہو رہے تھے کیونکہ اب انھیں حالات کی سختی کا سامنا نہ تھا۔ ان کی زندگی میں سخت کوشش کی بجائے آرام طلبی بڑھ گئی تھی۔ ایسے حالات میں اجتماعی قوت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔

4- علاؤالدین کی فوج اپنے انتظام ، حکمت عملی اور فوجیوں کی تربیت کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور مضبوط تھی۔ علاؤالدین کی فوجی اصلاحات کے نتیجے میں ہر سپاہی ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ جس سے سپاہیوں کا معیارِ جنگ بھی بہتر ہوا تھا۔

علاؤالدین کا انتقال

علاؤالدین کے آخری ایامِ حیات بڑی مایوسی میں گزرے۔ وہ مستقل بیماری سے چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ان حالات میں اُس نے ملکی نظام اپنے غلام ملک کافور کے سپرد کر دیا تھا۔ علاؤالدین کا انتقال 1316ء میں ہوا۔ بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ اُسے ملک کافور نے زہر دے دیا تھا۔

تجزیہ

سلطان علاؤالدین خلجی، اپنی اصلاحات اور انتظامی حکمت عملی کے لحاظ سے نہ صرف سلاطین دہلی بلکہ ہندوستان کے سارے مسلمان بادشاہوں میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ اس کی حکمتِ عملی، منصوبہ بندی اور انتظامی کارکردگی میں ایک تخلیقی انداز جھلکتا ہے۔ اگرچہ وہ رسمی طور پر تعلیم یافتہ نہ تھا، تاہم وہ اپنے مشاہدے اور بصیرت سے حالات کو نہایت گہرائی سے سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ کسی بھی اقدام سے پہلے حالات اور ان کے محرکات کو پوری توجہ سے پرکھتا تھا ۔ اپنی خواہش کے مطابق منصوبہ بندی کرتا ، پھر پُوری توجہ سے پرکھتا اور پھر اس پر عمل کرواتا تھا۔ یہی طریق کار اس کی کامیابی کا راز تھا۔

علاؤالدین اگرچہ ایک کامیاب حکمران تھا مگر اس کی تمام تر منصوبہ بندی اس کی ذاتی خواہشات کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی بنیادی خواہش اپنے سیاسی اثر کو بڑھانا تھی اور اس کے لیے ایک مضبوط فوج کی تیاری لازم تھی۔ فوجی ضروریات کے پیش نظر اُس نے اصلاحات کیں تاکہ موجود وسائل میں اس کی فوجی ضروریات پوری ہو سکیں۔ ان اصلاحات میں نئے مالیاتی نظام، قیمتوں کے کنٹرول کا نظام اور فوجی نظام کی تنظیم نو شامل ہے۔

ان تمام اصلاحات سے علاؤالدین خلجی اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب تو رہا مگر اس کا تمام تر بوجھ عام کسانوں اور مزدوروں کو برداشت کرنا پڑا۔ وہ اپنی پیداوار کا قریباً 3/4 حِصہ سرکار کے سپرد کر دیتے تھے۔ اس سے عام کسانوں میں بددلی پھیلی اور اس کا اثر مجموعی پیداوار پر پڑا۔

خلجی کی وُسعت پسندی کی پالیسی سے سلطنت دہلی کا سیاسی اثر ہندوستان کے بہت بڑے علاقے تک پھیل گیا۔ علاؤالدین کی فوجی طاقت کے مقابلے کی سکت نہ ہونے کے باعث جنوبی ہندوستان کے راجاؤں نے اطاعت گزاری قبول کر لی۔ تاہم بعد میں اسی سیاسی جبر کے خاتمے کے بعد بہت جلد نہ صرف جنوبی ہندوستان بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی آزاد حکومتیں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔

یاد دہانی کے لیے نکات

واقعاتی تسلسل

1—	کیقباد	1290-1286ء
2—	جلال الدین خلجی کی تخت نشینی	1290ء
3—	علاؤالدین خلجی کی دیوگری کی مہم	1296ء
4—	علاؤالدین خلجی کی تخت نشینی	1296ء
5—	رنتھمبور کی فتح	1301ء
6—	چتوڑ کی فتح	1303ء
7—	منگولوں کے حملے	1306-1298ء
8—	علاؤالدین خلجی کا انتقال	1316ء

اہم نکات

(i) بلبن کے انتقال کے بعد ایک دورِ انتشار شروع ہوا، جس میں بلبن کی سخت گیر پالیسیوں کے خلاف انتہا پسندانہ رد عمل ظاہر ہوا۔

(ii) جلال الدین خلجی نے ترک امرأ سے ایک سیاسی چپقلش کے بعد حکومت سنبھال کر بلبن کے خاندان کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی خلجی خاندان کی حکومت شروع ہوگئی۔

(iii) جلال الدین خلجی ایک نرم خُو حکمران تھا۔ اس کی غیر ضروری نرمی کے باعث انتظامی اور سیاسی طور پر بدامنی اور بدحالی پیدا ہوگئی۔

(iv) علاؤالدین خلجی نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کروا کے حکومت سنبھال لی۔

(v) علاؤالدین خلجی نے بلبن کے استحکام سلطنت کو عروج بخشا۔ اُس نے نہایت باعمل نقطۂ نظر سے اصلاحات کیں۔ امرأ پر پابندیاں لگانا اس کی ایک مثال ہے۔

(vi) علاؤالدین ایک طاقت ور بادشاہ بننا چاہتا تھا، اس ضمن میں اُس نے مضبوط فوجی اور دوسری مالیاتی اصلاحات کیں۔ ان میں قیمتوں کے تعین کے لیے اصلاحات شامل ہیں۔

(vii) سازشوں کا سدّباب کرنے کے لیے ، علاؤالدین نے اصلاحات کیں ۔

(viii) علاؤالدین خلجی نے سلطنت دہلی کے سیاسی اثر کو بہت بڑے علاقے تک وسعت دی۔ اس نے جنوبی ہند میں مقبوضات برقرار رکھنے کی بجائے، یہاں راجاؤں کو اطاعت گزار بنا کر ان سے خراج وصول کرنے کی پالیسی اپنائی ۔

(ix) علاؤالدین کی پالیسیوں کا سب سے زیادہ منفی اثر کاشت کاروں پر پڑا ۔ ان کی پیداوار کا 3/4 حِصّہ ٹیکس کی صورت میں بادشاہ کے پاس چلا جاتا تھا۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

(i) علاؤالدین خلجی کی اصلاحات کے محرکات کا تجزیہ کریں۔

(ii) علاؤالدین کی اصلاحات کے بنیادی محرکات میں بادشاہ کی اپنی ذات اور اس کی سیاسی ضروریات شامل تھیں، بحث کریں۔

(iii) علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت کا بحیثیت مجموعی سلطنت دہلی کے پورے دور میں کیا مقام ہے؟ بحث کریں۔

(iv) اگر آپ علاؤالدین خلجی کے دَور میں ایک کسان کی زندگی بسر کرتے ہوتے تو آپ علاؤالدین کی پالیسیوں کو کیسا سمجھتے ؟ اپنے نقطۂ نظر کو دلائل سے واضح کریں ۔

خلجی خاندان کا خاتمہ اور خاندان تغلق

سلطان علاؤالدین خلجی کے انتقال کے بعد سلطنت دہلی کے معاملات میں پھر انتشار پیدا ہوا ۔ اس دور کے خاتمے کے ساتھ ہی خلجی خاندان کی حکومت کا خاتمہ بھی ہو گیا اور اس کی جگہ تغلق خاندان نے عنانِ حکومت سنبھال لی۔

علاؤالدین کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین بادشاہ بنا دیا گیا۔ اس کی عمر پانچ ، چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ملک کافور اس بادشاہ کا نائب بن گیا اور اس طرح اُس نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ملک کافور نے اپنی سیاسی حیثیت کو مضبوط بنانے کے لیے شہاب الدین کی والدہ سے شادی بھی کر لی۔ ملک کافور نے علاؤالدین خلجی کے تمام بیٹوں کو گوالیار کے قلعے میں اندھا کروا کے قید کر دیا۔

شاہی خاندان سے نمٹنے کے بعد، ملک کافور نے اُن امرا اور جاگیرداروں کی طرف توجہ دی جو اس کے مخالف ہو سکتے تھے۔ ملک کافور کے ان اقدامات سے اکثر امرا اُس سے بدظن ہونے لگے۔

اچانک حالات نے بڑی تیزی سے پلٹا کھایا۔ ملک کافور نے اپنے چند سپاہیوں کو علاؤالدین خلجی کے تیسرے بیٹے مبارک خاں کو قتل کرنے بھیجا ۔ مبارک خان نے ان سپاہیوں کو اپنے گلے کا ایک قیمتی ہار دیا اور قتل کرنے سے باز رکھا۔ اس کے ساتھ ہی سپاہیوں کے ساتھ گفتگو کر کے ان میں شاہی خاندان سے وفاداری کے جذبات کو ابھارا۔ سپاہیوں پر اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے واپس آ کر ملک کافور ہی کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح ملک کافور صرف 35 روز کے اقتدار کے بعد قتل کر دیا گیا۔

مبارک شاہ خلجی

ملک کافور کے قتل کے بعد علاؤالدین خلجی کا ایک اور بیٹا قطب الدین مبارک شاہ خلجی 1316ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو قتل یا قید کروا دیا۔ عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سابقہ خلجی دور حکومت کے ہزاروں قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ جن امرأ سے ان کی جاگیریں چھین لی گئی تھیں، ان کو لوٹا دی گئیں۔ فوج کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان کو چھ ماہ کی تنخواہ بطور بونس دے دی گئی۔ علاؤالدین خلجی کی زرعی اصلاحات اور قیمتوں کے تعین کے نظام کو ختم کر دیا گیا۔ اس سے منافع خوروں کو بڑی خوشی ہوئی اور چیزوں کے نرخ بڑھنے لگے۔

مبارک شاہ خلجی کو اپنے بادشاہ بننے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ غیر متوقع طور پر بادشاہت ملنے سے وہ اپنے آپ میں نہ رہا اور اُس نے عیش و عشرت شروع کر دی۔ کاروبار سلطنت سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ تاہم اُس نے حکومتی معاملات ایک نو مسلم خسروخاں کے سپرد کر دیے۔ خسروخان نے مہاراشٹر میں ایک راجا کو خراج نہ دینے پر قتل کر کے سارا علاقہ فتح کر کے مبارک شاہ کے دل میں اپنے لیے کافی عزت حاصل کر لی تھی۔

خسرو خان نے مہاراشٹر کی مہم سے خاصی دولت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو خودمختار بادشاہ بنانا چاہتا تھا۔ امرأ کو جب علم ہوا تو انھوں نے خسروخان کے ان عزائم کی اطلاع مبارک شاہ کو دی مگر خسروخان نے اپنی وفاداری کا یقین دلا کر بادشاہ کو مطمئن کر دیا۔ اس پر مبارک شاہ نے شکایت کرنے والے امرأ کو سزا دی۔

مبارک شاہ کا دورِ حکومت حد درجہ بے اعتدالی کا دور تھا۔ تاریخ فیروزشاہی نے اس دَور کے احوال اس طرح بیان کیے ہیں۔

> "اس (مبارک شاہ) کی اچھی عادتیں غُصّہ و غضب، بے مہری، فحاشی اور قہاری میں تبدیل ہوگئیں تھیں۔ وہ ناحق لوگوں کو قتل کرانے لگا۔ اپنے مقربوں اور نزدیک رہنے والوں سے فحش کلامی کرنا اور ان کو گالیاں دیتا

تھا۔ اس کی ہوا پرستی پہلے کے مقابلے میں سو گنا زیادہ ہو گئی ـــــ
حکومت کو زوال اور فتنوں اور حوادث کا خوف اس کے دل کی چہار دیواری
میں سے گزر نہیں پاتا تھا ـــــ غرض یہ کہ اب اس کی فرعونیت اور
ناہنجاری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جو حکومت کو کبھی پھلنے اور پھولنے
نہیں دیتا۔ شرم و حیاء اس کی آنکھوں سے قطعاً جاتی رہی۔ وہ عورتوں کے
کپڑے اور زیورات (1) پہن کر مجمع میں آ جاتا تھا۔

اس کے بعد برنی نے مبارک شاہ کے دربار میں ایک مسخرے کی حرکات کا ذکر کیا ہے جس کی بڑی پذیرائی کی جاتی تھی۔ یہ مسخرا دربار میں بالکل برہنہ ہو کر آتا، امرأ کو فحش گالیاں دیتا، امرأ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتا اور حد درجہ ناپسندیدہ حرکات کرتا تھا۔

یہ سب حالات بادشاہ کی کمزوری اور انتظامی انتشار کی غمازی کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں سازشوں کا سامنے آنا قدرتی عمل تھا۔

آخر کار 1320ء میں خسرو خان نے جو موقع کی تاک میں تھا اچانک حملہ کر کے مبارک شاہ کو پکڑ لیا۔ مبارک شاہ کو قتل کر کے خسرو خاں نے حکومت سنبھال لی۔

اس طرح علاؤالدین خلجی کی محنت اور بصیرت سے کئی سالوں میں بننے والی وسیع سلطنت اس کے بیٹے نے صرف چار سال کے مختصر عرصے میں اپنی حرکتوں کی وجہ سے گنوا دی۔

1- اُس زمانے میں آج کے مقابلے میں، عورتوں کو فکری اور عملی طور پر مردوں کے مقابلے میں کم تر سمجھا جاتا تھا۔ اس تناظر میں عورتوں کے انداز اور لباس وغیرہ کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

خسرو خان بحیثیت بادشاہ

(15 اپریل — 7 ستمبر 1320)

خسرو خان ایک نومسلم تھا ۔ ابتدا میں وہ خاصا پُرجوش اور مخلص مسلمان تھا ۔ مبارک شاہ کے پیدا کردہ حالات میں اسے تخت نشینی کی دھن سوار ہوئی ۔ اس سلسلے میں گجرات کے ہندوؤں نے اس کی مدد کی ۔ آخر کار اقتدار حاصل کرنے میں اسے کامیابی ہوئی اور اس نے مبارک شاہ کو قتل کروا دیا ۔

اقتدار میں آنے کے بعد ، خسروخان نے علاؤالدین خلجی کے تمام بیٹوں کو قتل کروا دیا ۔ اس کے علاوہ خلجی خاندان کے خیر خواہ امرأ کو بھی راستے سے صاف کر دیا گیا ۔ کئی امرأ کو اعلیٰ عُہدے دے کر ان کی ہمدردیاں حاصل کی گئیں ۔

اس بندوبست کے باوجود خسروخان اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا تھا ۔ کئی امرأ اور گورنر خسرو خان کے اقتدار کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتے تھے ۔ ان میں شمال مغربی علاقوں کا گورنر غازی ملک تغلق اہم تھا ۔ یہ اقتدار کا خواہشمند تھا ۔ اس کا بیٹا محمد جونا دہلی کا گورنر تھا ۔ محمد جونا نے اپنے باپ کی مدد کے لیے دہلی چھوڑ دیا اور اپنے باپ کے پاس چلا آیا ۔

امرأ کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی خسروخان کو اس کی پالیسیوں کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے ۔ آہستہ آہستہ حالات کسی بھی تبدیلی کے لیے سازگار ہو رہے تھے ۔ غازی ملک تغلق نے اپنے حق میں سیاسی فضا ہموار کی اور کئی امرأ اس کے ساتھ مل گئے ۔ غازی ملک نے ایک لشکر لے کر دہلی کی طرف پیش قدمی کی ۔ لڑائی میں خسرو خان گرفتار ہوا ۔ اسے بعد میں قتل کر دیا گیا ۔

سلطان غیاث الدین تغلق

(1320ء — 1325ء)

"میں ان میں سے ایک ہوں، جن کو سلطان علاؤالدین (خلجی) اور سلطان قطب الدین (مبارک شاہ) نے بلند مرتبے پر پہنچایا۔ اسی جذبۂ نمک حلالی کی وجہ سے ——— میں نے اپنی جان کی بازی لگائی اور اپنے ولیٔ نعمت کے دشمنوں اور تباہ کرنے والوں کے خلاف تیغ زنی کی اور جس طرح مناسب سمجھا، ان کا انتقام لیا۔ اب تم لوگ علائی (علاؤالدین سے نسبت) اور قطبی (قطب الدین مبارک شاہ سے نسبت) حکومت کے اراکین میں سے ہو، یہاں موجود ہو۔ اگر ہمارے ولیٔ نعمت کے خاندان میں سے کوئی زندہ بچا ہوا ہے تو اسی وقت اس کو لاؤ اور تخت پر بٹھا دو ۔۔۔ میں اس کی خدمت بجا لاؤں گا۔ اگر دشمنوں نے (اس خاندان کا) کلیتاً صفایا کر دیا ہے تو ۔۔۔ تم جس کو تخت کا سزاوار اور بادشاہی کے لائق سمجھتے ہو ——— اسے تخت پر بٹھا دو، میں بھی اس کی اطاعت کروں گا۔"

(تاریخ فیروز شاہی)

خسرو خان کو قتل کرنے کے بعد غازی ملک تغلق نے یہ تقریر کی۔ اگرچہ وہ خود بادشاہ بننے کا خواہشمند تھا تاہم اس نے اپنی تقریر میں رواداری کا ثبوت دیا۔ وہاں پر موجود تمام امرأ اور عوام نے غازی ملک کو تخت کا حق دار قرار دیدیا۔ اس طرح خلجی خاندان کی حکومت برخاست ہو گئی اور خاندانِ تغلق نے حکومت سنبھال لی۔

غازی ملک تغلق نے حکومت سنبھالنے کے بعد اپنے آپ کو 'سلطان غیاث الدین تغلق' کہلوانا پسند کیا۔ لفظ 'تغلق' اس کے نام کا حصہ تھا۔ اسی لیے آنے والے حکمرانوں نے جو اس کے خاندان سے تھے، 'تغلق' اپنے نام کے ساتھ رکھا۔ تغلق کسی

نسل کا نام نہ تھا ۔ تغلق خاندان نے 1320 سے 1414ء تک دہلی کے تخت پر حکومت کی ۔

غیاث الدین تغلق کا باپ بلبن کا غلام تھا ۔ یہ نسلاً ترک تھے ۔ غیاث الدین تغلق کی ابتدائی زندگی بڑی عُسرت اور غریبی میں گزری ۔ اس نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا ایک سپاہی کی حیثیت سے کی ۔ غیاث تغلق لڑائی کے دوران بڑی دلیری اور ہمت سے کام لیتا تھا ۔ اس وجہ سے امرأ کے حلقوں میں اس کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ۔ علاؤالدین خلجی نے اس سے خوش ہو کر اسے 'غازی ملک' کا خطاب دیا ۔ بعد ازاں اسے مغربی سرحدات ، دیپالپور ، ملتان اور سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا ۔

علاؤالدین کے انتقال کے بعد مبارک شاہ خلجی اور پھر خسرو خان کے دور میں سیاسی و انتظامی طور پر سلطنت کے ہر گوشے میں بد نظمی اور بے اطمینانی بڑھ رہی تھی ۔ ان حالات میں غیاث الدین تغلق نے خسرو خان کو قتل کیا اور خود اقتدار سنبھال لیا ۔

احوالِ مملکت

غیاث الدین تغلق نے جب حکومت سنبھالی تو مجموعی طور پر مملکت کے حالات اس طرح تھے ۔

(i) علاؤالدین خلجی کا قائم کردہ انتظامی ڈھانچہ ، مبارک شاہ اور پھر خسروخاں کی بداعتدالیوں کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا ۔ مرکز میں نااہل بادشاہ ہونے کے باعث انتظام کے ذمے دار افسران اور امرأ وغیرہ کوتاہی برت رہے تھے ۔ اس کے نتیجے میں مختلف صوبوں میں نیم خودمختاری کا رجحان بڑھ رہا تھا ۔

(ii) مبارک شاہ اور خسروخان نے وفاداریاں خریدنے کے لیے ملکی خزانے کو بے دردی سے لُٹا دیا تھا ۔ اب غیاث الدین تغلق کو ایک تباہ حال اقتصادی حالت کا سامنا تھا ۔

غیاث الدین تغلق نے اپنے چند سالہ دور میں نہ صرف بادشاہت کے ادارے کو مؤثر بنایا بلکہ بغاوتوں اور دوسری سیاسی و انتظامی ناہمواریوں کو ختم کر کے ملک میں سکون اور امن کی فضا پیدا کی ۔

غیاث الدین تغلق کی پالیسیاں

سیاسی طور پر اپنے لیے حالات کو بہتر بنانے کے لیے غیاث الدین تغلق نے مجموعی طور پر مفاہمت کا رویہ اختیار کیا ۔ اس نے ترک امرأ کو اپنے ساتھ ملا لیا کیونکہ وہ اس کی نسل سے تھے اور وہ اس کے لیے معتمد اور مددگار ہو سکتے تھے ۔ خسرو خان کی مدد کرنے والے امرأ سے درگزر کرتے ہوئے ، ان کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا گیا ۔

مجموعی طور پر اس مفاہمت سے غیاث الدین تغلق کو خاطر خواہ فائدہ ہوا اور اس نے اپنے حق میں ایک بہتر سیاسی فضا قائم کر لی ۔

اصلاحات

زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے غیاث الدین تغلق نے زیر کاشت رقبے کو بڑھانے پر زور دیا ۔ غیاث الدین تغلق نے علاؤالدین خلجی کی اصلاحات کو بحال نہ کیا ۔ (یہ اصلاحات مبارک شاہ نے کالعدم کر دی تھیں) ۔ غیاث الدین تغلق کا خیال تھا کہ حالات بدل جانے سے اب نئی اصلاحات کی ضرورت ہے اور علاؤالدین خلجی کی اصلاحات وقتی تقاضوں کے مطابق کارآمد نہ ہوں گی ۔

علاؤالدین خلجی نے زمین کی پیمائش کر کے فی بیگھہ لگان مقرر کیا تھا۔ غیاث الدین تغلق نے زیر کاشت رقبے کی بجائے اصل پیداوار پر لگان عائد کیا ۔ کیونکہ پہلی صورت میں پیداوار کم ہو یا زیادہ کاشت کاروں کو زیر کاشت رقبے کے لحاظ سے لگان دینا ہوتا تھا ۔ اب حقیقی پیداوار پر لگان سے حکومت کی آمدنی تو کم ہو گئی مگر کسانوں پر غیر ضروری بوجھ کم ہو گیا ۔ اب کم پیداوار کی صورت میں مالیہ بھی کم کر دیا جاتا تھا ۔ مالیہ اکٹھا کرنے والے اہلکاروں کو یہ حکم تھا کہ وہ مقررہ مالیے کے علاوہ کسی قسم کی رقم کا مطالبہ نہ کریں ۔ اہلکاروں کو باقاعدہ تنخواہ کے علاوہ جمع شدہ مالیے پر کمیشن دینے کی رسم کو ختم کر دیا ۔ کمیشن کے بدلے مالیہ سے مستثنیٰ زمین ان کو دے دی گئی ۔ جن ہندو افسران کو علاؤالدین خلجی نے نوکریوں سے سبکدوش کر دیا تھا ، ان کو غیاث الدین تغلق نے بحال کر دیا ۔ مالیے کی شرح پہلے کے مقابلے میں بہت کم کر دی گئی ۔ اب

یہ کل پیداوار کا 1/10 حصہ تھی ۔

رفاہِ عامہ

غیاث الدین تغلق نے ذرائع مواصلات کو بہتر بنایا ۔ سڑکوں کی مرمت کروائی گئی ۔ ڈاک کے نظام کو مؤثر بنایا گیا ۔ گداگری کی ممانعت کر دی گئی ۔ گداگروں اور غریبوں کے لیے "مساکین گھر" تعمیر کیے گئے ، جہاں ضروریات زندگی کی تمام اشیاء بلا قیمت مہیا کی جاتی تھیں ۔

غیاث الدین تغلق نے شراب نوشی اور ناچ گانے کو ممنوع قرار دے دیا ۔ علاؤالدین خلجی کے بعد مبارک شاہ اور خسرو خان کے دور میں یہ دونوں برائیاں عام ہو چکی تھیں ۔

سلطنت میں وسعت

علاؤالدین خلجی نے وسعتِ سلطنت کے ضمن میں فوجی مقبوضات بڑھانے کی بجائے اکثر ریاستوں کو اپنی بادشاہت کو قبول کرنے پر مجبور کیا ۔ ان کو اطاعت گزار بنا کر خراج دینے پر آمادہ کیا گیا تھا ۔

غیاث الدین تغلق نے اس پالیسی کے برعکس مختلف علاقوں پر قبضہ کر کے انھیں اپنی سلطنت میں ضم کرنے کی پالیسی پر زور دیا ۔

غیاث الدین تغلق نے تلنگانہ اور اڑیسہ کے علاقوں کو فتح کیا ۔ بنگال کا علاقہ بہت عرصہ پہلے سلطنت دہلی کا حصہ بنا دیا گیا تھا، مگر مرکز سے دوری کے باعث یہ ہمیشہ پریشانی کا باعث رہتا تھا ۔ غیاث الدین تغلق کے دور میں یہاں مختلف گروہ بنگال کی حکومت سے برسرپیکار رہتے تھے ۔ ان میں سے ایک نے اپنی مدد کے لیے غیاث الدین تغلق سے رجوع کیا ۔ مؤخرالذکر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً مدد کرنے کا فیصلہ کر کے بنگال کا رخ کیا ۔ وہاں پہنچنے تک اس سے مدد مانگنے والا خود ہی جیت چکا تھا ۔ اس راجا نے غیاث الدین تغلق کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا ۔ غیاث تغلق نے اس کو بنگال میں اپنا نائب مقرر کر کے دہلی کا رخ کیا ۔

غیاث الدین تغلق کا انتقال

غیاث الدین تغلق ابھی راستے میں ہی تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا محمد جونا اپنے اقتدار کے لیے تگ و دو کر رہا ہے ۔ غیاث الدین تغلق اس پر پریشان ہوا اور بڑی تیزی سے دہلی پہنچا ۔

محمد جونا نے دہلی سے چند کلومیٹر دور ایک گاؤں میں غیاث الدین تغلق کے استقبال کا بندوبست کیا ۔ بادشاہ کے لیے لکڑی کا ایک محل بنوایا گیا ۔ یہ محل تین روز میں مکمل کیا گیا تھا ۔ کھانے کے بعد محمد جونا نے اپنے باپ کو نئے خریدے گئے ہاتھی دکھانے کا اہتمام کیا تھا ۔ ان ہاتھیوں میں سے ایک ، جب محل کے ایک حصے تک پہنچا تو پورا محل گر گیا ۔ اس سے غیاث تغلق اور اس کے چند ساتھی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے ۔

اکثر مؤرخین کی رائے ہے کہ محمد جونا نے ایک سازش کے تحت اپنے باپ کو ہلاک کیا تھا ، بعض اس کو محض ایک حادثہ مانتے ہیں ۔

تجزیہ

غیاث الدین تغلق اپنے ذاتی اطوار اور پالیسیوں کے اعتبار سے میانہ رو اور انصاف پسند حکمران تھا ۔ اس نے دہلی کی سلطنت کو انتشار کے دور سے نکال کر دوبارہ استحکام کی راہ دی ۔ غیاث تغلق کے بارے میں ایک ہم عصر مؤرخ کی رائے یہ ہے ۔

"تخت دہلی پر سلطان تغلق شاہ جیسا بادشاہ کبھی نہ بیٹھا ہے اور شاید ہی اس کے بعد بھی کوئی اس جیسا حکمران اس تخت پر جلوہ افروز ہو گا ۔۔۔ سلطان تغلق کے احکامات ، اس کی تخت نشینی کے ایک سال کے اندر ہی اس طرح نافذ ہو گئے کہ دوسرے بادشاہ ایک قرن تک لوگوں کا ناحق خون بہانے اور بے دریغ سزائیں دینے کے بعد بھی نافذ نہ کر سکتے تھے ۔ اگر بادشاہ کی بادشاہی کے لیے رعیت پروری کو لازمی شرط قرار دیا جا سکتا ہے تو تغلق شاہ کے بادشاہ ہونے کے زمانے میں ہی اس کی رعیت پروری ہندوستان اور خراسان میں ضرب المثل ہو گئی تھی ۔۔۔"

یاد دہانی کے لیے نکات

1- علاؤالدین خلجی کے انتقال کے بعد ملک کافور نے اقتدار سنبھالا مگر پینتیس دنوں کی حکومت کے بعد اسے قتل کر دیا گیا۔

2- ملک کافور کے بعد مبارک شاہ خلجی نے حکومت سنبھالی۔ اس کا دور عیاشیوں اور بے اعتدالیوں کا دور تھا۔ اس دَور میں حکومتی معاملات یکسر نظرانداز کر دیے گئے۔

3- مبارک شاہ خلجی کی بے اعتدالیوں سے خسرو خان نے فائدہ اٹھایا اور مبارک شاہ کو قتل کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔

4- خسرو خان کی حکومت کو امرأ نے ناپسند کیا اور غازی ملک (غیاث تغلق) نے حکومت سنبھال لی۔

5- غیاث تغلق اپنی پالیسیوں میں میانہ رو تھا۔ اس نے کسانوں پر مالیے کا بوجھ کم کیا۔

غور و فکر کے لیے نکات

الف 1- علاؤالدین خلجی کے بعد پیدا ہونے والے حالات میں مختلف بادشاہوں نے حکومت سنبھالی مگر وہ ناکام رہے، آپ کے خیال میں کیا اس کی وجہ علاؤالدین خلجی کی اصلاحات تھیں، ہاں یا نہ ہر دو صورتوں میں دلائل سے وضاحت کریں۔

2- غیاث الدین تغلق ایک میانہ رو بادشاہ تھا، بحث کریں۔

ب۔ مختصر جواب دیں۔

(i) خسرو خان پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

(ii) غیاث الدین تغلق کے اقتدار سنبھالنے تک کی زندگی کا خاکہ تحریر کریں۔

(iii) غیاث الدین تغلق کے اقتدار سنبھالتے وقت حکومتی احوال کیا تھے؟

(iv) کسانوں پر مالیے کا بوجھ کم کرنے کے لیے غیاث الدین تغلق نے کون سے اقدام کیے؟

محمد بن تغلق

(1325ء — 1351ء)

"پہلا منصوبہ جو سلطان محمد کے دماغ میں آیا اور جو علاقوں کی ویرانی (خرابی)، رعایا کی بربادی کا باعث ہوا، یہ تھا کہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ دوآبہ کے علاقے میں خراج کی شرح میں دس فیصد اور پانچ فیصد کا اضافہ ہونا چاہیئے (اس منصوبے پر بڑی سختی سے عمل کیا گیا)، جس سے کاشت کاروں کی کمر ٹوٹ گئی۔ (مالیہ) اس قدر سختی سے وصول کیا جاتا تھا کہ اس کی وجہ سے کمزور اور نادار کاشت کار (رعایا) تو بالکل ہی برباد ہو گئے، اور ان میں سے جو مال دار تھے اور سامان وغیرہ رکھتے تھے، وہ باغی اور سرکش ہو گئے۔ علاقے ویران ہو گئے اور زراعت تقریباً ختم ہو گئی۔ دور افتادہ ولایتوں کے کاشت کاروں نے جب دوآبہ کے کاشت کاروں کی تباہی اور ویرانی کا حال سنا تو اس طرف سے کہ کہیں ان پر بھی وہی احکامات نہ نافذ کر دیے جائیں، جو دوآبہ کے کاشت کاروں پر کیے گئے ہیں ——— انھوں نے بھی بغاوت کر دی اور جا کر جنگلوں میں چھپ گئے۔"

(تاریخ فیروز شاہی)

محمد تغلق کی اصلاحات اور انتظامی اقدامات کے باعث اس کے اقتدار کا آدھے سے زیادہ عرصہ (1335ء تا 1351ء) بغاوتوں کی نذر ہو گیا۔ اس کی اکثر اصلاحات ناکام ہوئیں۔ انتظامی عدم توازن کے باعث بہت سے علاقے مرکز سے آزاد ہو گئے۔ مجموعی طور پر محمد بن تغلق کا دور ایک ناکام حکمران کا دور تھا۔

محمد بن تغلق — شخصیت:

باپ کے انتقال کے بعد محمد جونا، سلطنت دہلی کا بادشاہ بنا۔ اب اسے محمد بن تغلق کے نام سے پکارا جانے لگا۔

محمد بن تغلق کو بہت سے علوم پر دسترس حاصل تھی ۔ وہ فارسی ، عربی ، ترکی اور ہندی زبانوں کا ماہر عالم تھا ۔ اس زمانے کے مروجّہ علوم کے ساتھ ساتھ فلسفہ میں اسے خصوصی دلچسپی تھی ۔ ہمعصر مؤرخ برنی نے لکھا ہے کہ "اگر ارسطو اس کے زمانے میں ہوتا تو یقیناً وہ سلطان محمد تغلق کے شاگردوں میں سے ایک ہوتا ۔"

محمد بن تغلق کی علمی استعداد اور اس کے علمی رجحانات میں خاصا تضاد پایا جاتا تھا ۔ ہمعصر سیاسی اور معاشرتی رجحانات اور اس کے ذاتی نقطۂ نظر میں بڑا بُعد تھا ۔

برنی نے اس کی خواہشات کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ بادشاہی کے ساتھ (اپنی ذات میں) پیغمبری کو بھی جمع کرنا چاہتا تھا (نعوذ باللہ) ۔ اس کی خواہش تھی کہ ہر اقلیم کا بادشاہ اس کے غلاموں میں سے ایک ہو ۔" اس قسم کی خواہشات کے حصول کے لیے محمد بن تغلق نے جدّت پسندی (۱) سے کام لیا ۔

1- جدّت پسندی کا عمومی مطلب یہ ہے کہ مروجہ رجحانات کو بدلنے کے لیے نیا اور بہتر انداز اپنایا جائے ۔ نیا طریقہ کار وضع کیا جائے جس پر چل کر لوگوں کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں ۔ اس جدت پسندی کے عمل میں معاشرے سے ٹکر لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ وقت کے آگے بڑھنے سے جو نئے مسائل ابھرتے ہیں ان کو دُور کرنا مقصود ہوتا ہے ۔

مثال کے طور پر ہماری تعلیم میں کئی سال پرانا طرز تدریس چل رہا ہے ۔ اس میں بچوں کو سبق رٹوا دیا جاتا ہے اور پھر طوطے کی مانند بچے امتحان میں سبق دہرا دیتے ہیں ۔ اس عمل میں بچے جو کچھ بھی رٹتے ہیں ان کو اس کی کچھ سمجھ نہیں ہوتی ۔ حالانکہ زندگی میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ معاملات کو سمجھنے کے بغیر تو ممکن نہیں ہے! سبق رٹنے اور سمجھ کر نہ پڑھنے والے بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو انھیں زندگی کے مسائل کے سامنے بڑا سخت مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنے متعلقہ مسائل کو سمجھ نہیں پاتے اور زندگی میں ناکام رہ جاتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو طالب علمی کے دور میں سمجھنے کی تربیت ہی نہیں دی جاتی ۔

اگر اس نظامِ تعلیم کو بدل دیا جائے اور بچوں کو ایسے طریقے سے پڑھایا جائے جس میں بچے ہر بات کو سمجھیں اور باعمل سرگرمیاں کر سکیں تو اعلیٰ دماغ اور سوچ و فکر والے لوگ پیدا ہوں گے ، جو ہماری زندگی کو بہتر بنائیں گے ۔ یہ نیا طریقہ جو اپنایا جائے گا اسے ہم جدّت پسندی کہہ سکتے ہیں ۔

محمد بن تغلق کی اصلاحات

I- مالیاتی اصلاحات

محمد بن تغلق نے مالیے کے انتظام کو بہتر بنانے کے لیے کئی ایک اقدام کیے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

1- محمد بن تغلق نے حکم دیا کہ صوبوں کے اخراجات اور آمدنی کا حساب رجسٹروں میں رکھا جائے گا۔ یہ سب رجسٹر پڑتال کے لیے مرکز کو روانہ کیے جائیں گے۔ اس اقدام کا مقصد تمام علاقوں کے مالی معاملات کی نگرانی تھا۔

2- دوآب میں نئے ٹیکسوں کا اجرا کیا گیا۔ سابقہ ٹیکسوں میں 5 سے 10 فیصدی اضافہ کر دیا گیا۔ یہ شرح ٹیکس کاشت کاروں پر ایک نامناسب بوجھ تھا، انھوں نے کاشت کاری ترک کر کے ڈکیتی اور راہزنی شروع کر دی۔ برنی نے لکھا ہے:-

> "دوآب میں غلے کی کمی کا اثر ملک کے دوسرے علاقوں میں غلے کی قلت کی صورت میں نمودار ہوا۔ ساتھ ہی بارشیں بھی نہ ہوئیں، چنانچہ قحط عام ہو گیا اور یہ قحط کئی سال تک جاری رہا۔ ہزارہا آدمی قحط میں مر گئے۔ طبقے کے طبقے تباہ ہو گئے۔ ان حالات میں ٹیکس افسران نے ٹیکس وصول کرنے میں بدستور سختی جاری رکھی تو بغاوتیں شروع ہو گئیں۔"

بعد ازاں محمد بن تغلق نے ٹیکسوں کا نظام ختم کر دیا مگر اس وقت تک حالات بہت بگڑ چکے تھے۔ جو رقم کاشت کاروں کو بیل اور بیج خریدنے یا آبپاشی کے کنویں لگانے کے لیے دی گئی، اس سے بھوکے کاشت کاروں نے اپنے پیٹوں کی آگ کو بجھایا۔

مجموعی طور پر محمد بن تغلق کی یہ پالیسی ناکام رہی۔ بلکہ بعد میں بھی دوآب سے ٹیکس حاصل نہ ہو سکے۔ مزید برآں یہ کہ بادشاہ غیر مقبول ہو گیا۔

II- زراعت کے لیے منصوبہ بندی

زراعت میں بہتری لانے کے لیے محمد بن تغلق نے ایک علٰحدہ محکمہ بنایا۔ اس محکمے کا بنیادی مقصد زیر کاشت رقبے میں اضافہ کرنا تھا۔ اس منصوبے کے لیے ساٹھ

مربع میل (قریباً 100 مربع کلومیٹر) کا ایک علاقہ منتخب کیا گیا ۔ یہاں تین سال میں کئی قسم کی فصلیں بوئی گئیں ۔ اس منصوبے پر مجموعی طور پر ستر لاکھ ٹنکے خرچ کیے گئے۔ مگر یہ تجربہ ناکام گردانا گیا اور تین سال کے بعد اسے ترک کر دیا گیا ۔

اس منصوبے کی ناکامی کی وجوہات میں سب سے اہم افسران کی بدنیتی اور ناقص منصوبہ بندی تھی ۔ تین سال کا عرصہ اس نوعیت کے منصوبے کے لیے خاصا کم تھا اور اس کی کامیابی کے لیے مزید انتظار ضروری تھا۔ اُسے محض جلد بازی میں ختم کر دیا گیا ۔

III- دارالحکومت کی تبدیلی

محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں سلطنتِ دہلی کی حدود بہت وسیع ہو گئی تھیں ۔ دکن کا علاقہ پہلی مرتبہ سلطنت کا حصہ بنا تھا ۔ دہلی میں بیٹھ کر سلطنت کے دور دراز علاقوں مثال کے طور پر دکن اور بنگال پر حکومت کرنا آسان نہ تھا ۔

محمد بن تغلق ایسے مقام کا متلاشی تھا ، جس کو سلطنت میں جغرافیائی طور پر مرکزی حیثیت حاصل ہو ۔ کچھ امرأ نے اُجین کا نام تجویز کیا مگر محمد بن تغلق نے دیوگیری کو اپنا پایۂ تخت منتخب کیا ۔ اس کا نام بدل کر دولت آباد رکھ دیا گیا ۔

1327ء میں محمد بن تغلق نے حکومتی اہلکاروں کے ساتھ دولت آباد کا رخ کیا ۔ اگلے سال اس نے حکم جاری کیا کہ مسلم امرأ اور علماء بھی اشاعتِ اسلام کے لیے اس علاقے میں سکونت اختیار کریں ۔ تبدیلئ مکان کے لیے بادشاہ نے ہر قسم کی ممکن امداد کی ۔ برنی لکھتا ہے کہ "اس علاقے (دہلی) کے وہ لوگ جو برسوں سے اس کو اپنا وطن بنائے ہوئے تھے ، اپنے آباؤ اجداد کے مکانوں میں رہ رہے تھے اور ان کو اس سے دل بستگی پیدا ہو گئی تھی ، کوچ کرنے کو تیار نہ تھے" ۔

بادشاہ کے دباؤ کے تحت بالآخر بے شمار لوگوں نے نقل مکانی شروع کی ۔ ان میں سینکڑوں لوگ مصائب سفر سے راستے ہی میں مر گئے ۔ ہندوؤں اور غیر مسلموں کو نقل مکانی کی اجازت نہ تھی ، کیونکہ شہر خالی ہونے کی وجہ سے دہلی کو خارجی حملے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ محمد بن تغلق کے دور میں دو پایۂ تخت ـــــ دہلی اور دولت آباد رہے ۔

محمد بن تغلق کا دارالحکومت بدلنے کا فیصلہ حقیقت پسندانہ نہ تھا ۔ دولت آباد میں بادشاہ کی موجودگی سے جنوبی علاقوں کا انتظام تو بہتر ہوگیا مگر دہلی سے غیر حاضری کی بنا پر شمالی سرحدات اور دوسرے علاقہ جات دفاعی اور انتظامی نقطۂ نظر سے نظرانداز کر دیے گئے ۔ اور پھر شمالی علاقہ جات ایک عرصے سے سلطنتِ دہلی کا حصہ تھے ان کو کنٹرول میں رکھنا آسان تھا اور حکومتی نقطۂ نظر سے ضروری بھی تھا ۔ ان امور کے علاوہ نقل مکانی کا طریقہ کار بھی آسان اور بہتر نہ ہونے کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہوگیا ۔

۱۷- علامتی سکے کا اجرأ

سلطنت میں وسعت کے باعث مروجہ چاندی کے سکوں کی مانگ میں خاطرخواہ اضافہ ہوگیا تھا ۔ خزانے میں مطلوبہ سکے بنانے کے لیے کافی چاندی موجود نہ تھی ۔ دوسری طرف فوجی ضروریات کے لیے خزانے میں چاندی کی ایک خاصی مقدار رکھنا ضروری بھی تھا ۔

محمد بن تغلق نے علامتی سکے (۱) جاری کرنے کا حکم دیا اور یہ اعلان کیا کہ ان سکوں کو چاندی کے سکوں کے برابر ہی سمجھا جائے ۔ چونکہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک پہلا تجربہ تھا ۔ لوگ اس نظام کو بہتر طور پر سمجھ نہ سکے ۔ پہلے انھیں کسی بھی لین دین میں چاندی کے سکے ملتے تھے ، اب محض تانبے کے سکے ملتے تھے ۔ بظاہر چاندی کے مقابلے میں اس کی وقعت کچھ بھی نہ تھی ۔

۱- اس زمانے میں ہر سکّے میں اس کی قیمت کے برابر چاندی یا سونا موجود ہوتا تھا ۔ یعنی یہ کہ اگر ایک شخص کے پاس سو ٹنکے ہوتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس سو ٹنکے کی مالیت کی چاندی یا سونا انھی سکوں میں موجود ہوتا تھا ۔ سکّے چاندی یا سونے کے بنائے جاتے تھے ۔ یوں سمجھیں کہ لین دین کا معیار چاندی اور سونا تھا اور ہر سکے میں اس کی (سکّے) مالیت کا سونا یا چاندی موجود ہوتی تھی ۔ کرنسی یا علامتی سکہ تانبے کا ہوتا تھا مگر اس کی قیمت کو اتنی چاندی کے مطابق فرض کر لیا گیا تھا ۔ علامتی سکّے کے اجرأ میں حکومت یہ ضمانت دیتی ہے کہ اس کو اگر لوٹا دیا جائے تو حکومت اس کے بدلے میں اتنی ہی مقدار کی چاندی یا سونا دے گی ۔

نویں صدی عیسوی میں چین میں علامتی سکے رائج تھے، تیرھویں صدی، عیسوی میں یہاں کاغذ کے نوٹوں کا بھی رواج تھا ۔ ہندوستان میں یہ ایک نیا تجربہ تھا ۔

لوگوں نے حکومت کو ٹیکس کی ادائیگی تو ان نئے تانبے کے سکوں کی صورت میں شروع کر دی ، مگر وہ اپنے واجبات خالص سونے اور چاندی کے سکوں میں وصول کرنا پسند کرتے تھے ۔ مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی تاجروں نے بھی علامتی سکے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ اس سے بیرون ملک تجارت کو نقصان پہنچا ۔ تاریخ فیروز شاہی میں اس منصوبے کے بارے میں پیدا شدہ حالات اس طرح رقم ہیں ۔

"اس منصوبے پر عمل درآمد ہونے سے ہندوؤں کا ہر گھر دارالضرب بن گیا اور مختلف علاقوں کے ہندوؤں نے کروڑوں اور لاکھوں کی تعداد میں تانبے کے سکے بنا لیے ۔ انہی سکوں سے وہ خراج ادا کرتے تھے اور ان ہی سے اسلحہ ، گھوڑے اور دوسری قیمتی اشیاء خریدتے تھے ---- زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ دور کے علاقوں میں تانبے کے سکے ، تانبے کی دھات کے طور پر ہی بکنے لگے ۔ سناروں نے اپنے گھروں میں تانبے کے سکے بنانے شروع کر دیے ۔ چنانچہ تانبے کے سکوں سے خزانہ بھر گیا ، ---- تانبے کے سکے اتنے خوار اور ارزاں ہو گئے کہ ان کی حیثیت سنگریزوں اور مٹی کے ٹھیکروں سے زیادہ نہ رہی ۔"

ان حالات میں حکومت جعلی سکوں کی روک تھام کے لیے مناسب اقدام نہ کر سکی ۔ محمد بن تغلق کا یہ فیصلہ اگرچہ تکنیکی اور مالیاتی نقطۂ نظر سے مناسب تھا ، مگر وہ عوام میں اس کے بارے میں اعتماد پیدا نہ کر سکا ۔ حالانکہ آج کل یہی علامتی کرنسی کا نظام ساری دنیا میں رائج ہے ۔

آخر کار ، محمد بن تغلق نے تین چار سال کے بعد علامتی سکوں کے اجرا کو ختم کر دیا ۔ لوگوں میں یہ اعتماد بحال کرنے کے لیے کہ خزانہ بھرا ہوا ہے ، اس نے تانبے کے عوض سونے/چاندی کے سکوں کو جاری کرنے کا حکم دے دیا ۔ جعلی سکّوں کی بھرمار تو پہلے ہی تھی ، لوگوں نے تانبے کے سکّوں کی بوریاں بھر بھر کے شاہی خزانے سے سونا حاصل کیا ۔

مجموعی طور پر محمد بن تغلق کی تمام تر اصلاحات ناکام رہیں ۔ وہ اپنی جدّت

پسندی سے نئے منصوبے تو تیار کر لیتا ۔ مگر منصوبہ بندی میں ہم عصر حالات اور لوگوں کے مزاج کی پرواہ نہ کرتا تھا ۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بجا ہو گا کہ ان تمام منصوبوں کی تیاری میں اس کی انتظامی جدّت پسندی کے علاوہ کسی اور محرک کو عمل دخل حاصل نہ تھا ۔

ناقص منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ ، محمد بن تغلق انتظامی طور پر بہتر ماحول اور کارآمد افسران کا خیال نہ رکھتا تھا ۔ ایسے منصوبوں کے لیے بنیادی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ان کو مرحلہ وار طور پر نافذ کیا جائے اور ان کے مکمل نفاذ تک انتظار کیا جائے ۔ محمد بن تغلق ایک عرصے تک تو انتظار کرتا تھا مگر پھر جلدبازی میں منصوبے کو ختم کر دیتا تھا ۔ عملی طور پر محمد بن تغلق منصوبوں کے نفاذ میں ناکام رہا ۔

وسعت پسندی

1327 ء میں منگولوں نے ہندوستان پر حملہ کیا ۔ منگولوں نے ملتان ، لاہور اور دہلی کے گردونواح میں لوٹ مار کی ۔ محمد بن تغلق نے ان کو زروجواہر دے کر واپس جانے پر آمادہ کیا ۔ ان کے جانے کے بعد محمد بن تغلق نے سرحدات کی حفاظت کا بندوبست کیا ۔

اپنے والد کی طرح محمد بن تغلق نے بھی سلطنت کو وسعت دینے کی طرف توجہ دی ۔ اُس نے ہندوستان کا ایک وسیع علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کیا ۔ اتنی بڑی سلطنت پہلے کسی بادشاہ کو نصیب نہ تھی ۔ منگولوں کے جانے کے بعد محمد بن تغلق نے پشاور اور کلانور کے علاقے فتح کیے اور اس کے بعد وسعتِ سلطنت کی طرف باقاعدہ توجہ دی ۔

خراسان کی مہم

اپنے دورِ حکومت کے ابتدائی سالوں میں محمد بن تغلق نے خراسان اور عراق کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا ۔ اس وقت ان علاقوں میں سیاسی ابتری تھی اور ان علاقوں کے امرأ نے محمد بن تغلق کا ساتھ دینے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا ۔ یہ لوگ اپنے اپنے علاقوں سے بھاگ کر محمد بن تغلق کے دربار میں جمع ہو گئے تھے ۔

محمد بن تغلق نے 3 لاکھ 70 ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج تیار کی اور تمام سپاہیوں اور افسران کو ایک سال کی پیشگی تنخواہ بھی ادا کر دی ۔ جلد ہی عراق اور ایران میں حالات تبدیل ہو گئے اور اس مہم کی منصوبہ بندی بے سود نظر آنے لگی ۔ محمد بن تغلق نے یہ مہم ختم کر کے فوج کو منتشر کر دیا ۔ اس مہم کی منصوبہ بندی سے حکومتی خزانے پر غیر ضروری بوجھ پڑا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہ ہوا ۔

قراجل کی مہم

قراجل یا قراچیل کے پہاڑ چین اور تبت کے راستے پر ہمالیہ کے دامن میں واقع ہیں ۔ محمد بن تغلق کے دورِ حکومت کے ابتدائی سالوں میں چین کے حاکم نے ہمالیہ کے دامن میں واقع چند ہندوستانی ریاستوں پر قبضہ کر لیا تھا ۔ محمد بن تغلق نے اس اقدام کو جارحیت قرار دیا اور اپنے بھتیجے خسرو ملک کی سربراہی میں اس طرف ایک مہم روانہ کی ۔

خسرو ملک پیشقدمی کرتے وقت راستے میں چوکیاں قائم کرتا رہا تاکہ پیچھے سے حملہ نہ ہو سکے ۔ اس کو آہستہ آہستہ کئی اہم کامیابیاں حاصل ہوئیں ۔ اس طرح اس نے غیر ضروری طور پر پُراعتمادی کا مظاہرہ کیا اور چوکیاں تعمیر کرنا ترک کر دیں ۔ خسرو ملک تبت اور چین کو فتح کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا ۔ اس نے تبت کی طرف پیشقدمی شروع کر دی ۔ راستے میں فوج میں طاعون پھیل گیا ۔ واپسی کا ارادہ کیا گیا تو پہاڑی لوگوں نے فوج کا راستہ روک لیا ۔ اس طرح فوج کو سخت نقصان کا سامنا کرنا پڑا ۔ مؤرخین کے مطابق صرف چند اشخاص زندہ سلامت واپس پہنچے ۔ اس طرح یہ مہم ناکام ہو گئی ۔

ان مہمات کی ناکامی کے باوجود محمد بن تغلق نے جنوبی ہندوستان میں بہت سے علاقوں کو فتح کیا (دیکھیں نقشہ) اس نے اپنی حکومت کے ابتدائی دس سالوں میں وسعتِ سلطنت پر زور دیا مگر 1335ء کے بعد اس کے دورِ حکومت کے اختتام تک بغاوتوں اور شورشوں کا ایک سلسلہ جاری رہا ۔

عہدِ سلاطین کے مختلف بادشاہوں کے دَور کے سکّے

بغاوتیں :

محمد بن تغلق کی غیر ضروری مہم جوئی میں خزانے کا ضیاع ، قحط سالی اور سب سے بڑھ کر اس کی غیر حقیقت پسندانہ پالیسیوں کے باعث بغاوتیں ابھریں ۔ محمد بن تغلق نے اپنی انفرادیت پسندی کو اس قدر اچھالا کہ اس نے عوام اور امرأ کے لیے معتبر اور قابل احترام علماء اور مشائخ کی عزت کا بھی خیال نہ کیا ۔ ان لوگوں سے اچھے تعلقات تو درکنار اس نے ان کی عزت اور معاشرے میں ان کی وقعت کو کم کرنے کی سعی بھی شروع کر دی ۔

جب لوگوں کے سامنے بادشاہ اور علماء و مشائخ میں سے کسی ایک کے انتخاب کا مسئلہ آیا تو انھوں نے علماء و مشائخ کو فوقیت دی ۔ کیونکہ ان اصحاب کے ساتھ عوام کا دلی اور معاشرتی تعلق بادشاہ کے مقابلے میں زیادہ تھا ۔

اپنے اندازِ حکومت کے باعث ، محمد بن تغلق کی حکومت پہلے ہی ناکام سمجھی جاتی تھی ۔ لوگوں کا بادشاہ پر اعتماد ختم ہو چکا تھا ۔ ان حالات میں امرأ نے بغاوتیں شروع کر دیں ۔ غیر مسلم پہلے ہی غیر ملکی تسلط کے خلاف تھے ، انھوں نے آزاد حکومتیں قائم کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی ۔ محمد بن تغلق کے خلاف اٹھارہ بغاوتیں ہوئی ، جن میں سے کچھ کامیاب ہوئیں۔ تاہم ان سے حکومت کی سیاسی اور انتظامی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی۔ انتشار اور خودمختاری کی ایک مہم شروع ہو گئی، جس سے نہ صرف تغلق خاندان بلکہ سلاطینِ دہلی کی حکومت کا بحیثیتِ مجموعی زوال شروع ہو گیا۔

ملتان ، سندھ اور اُچ کی بغاوتوں کو دبا دیا گیا ۔ بنگال میں بغاوت کو ابتدا میں دبا دیا گیا مگر لکھنوتی اور سنار گاؤں میں 1340 ء میں آزاد ریاست قائم ہو گئی ۔ 1336 ء میں وجیانگر میں بھی ایک آزاد ریاست وجود میں آ گئی ۔ مالابار 1334 ء میں آزاد ہو گیا ۔ 1337 ء میں مہاراشٹر میں ایک خودمختار مسلمان 'بہمنی ریاست' کی بنیاد ڈالی گئی ۔

محمد بن تغلق کا انتقال

ایک بغاوت کو ختم کرنے کے سلسلے میں محمد بن تغلق سندھ میں تھا کہ بیمار ہو گیا ۔ ٹھٹھ کے قریب 1351 ء میں وہ انتقال کر گیا ۔

تجزیہ

محمد بن تغلق کا اندازِ حکومت بے عمل اور خیالی نظریات پر مبنی تھا ۔ اس سے مراد ایسے اقدام کرنا ہے جس کا تعلق ٹھوس احوال و واقعات سے نہ ہو بلکہ اس کی بنیاد محض فکری مفروضوں پر ہو ۔ مثال کے طور پر اگر ہم اپنے نظام تعلیم کو اب موجودہ مسائل کے حوالے سے استوار نہ کریں ۔ اس کے لیے اپنے ملک کی موجودہ ضروریات کو پیش نظر نہ رکھیں تو جو نظام بھی استوار ہو گا وہ عملی طور پر بے کار ثابت ہو گا ۔ اب ہماری ضروریات یہ ہیں کہ ہم سائنسی تحقیق ، زرعی ، انجینئرنگ اور دوسرے پیشہ ورانہ میدانوں میں نئے نئے کام کریں اور ملک میں ترقی ہو ۔ ان مقاصد کی ایک ٹھوس حقیقت ہے ۔ اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ بچوں کی تخلیقی استعداد کو بڑھایا جائے ، وہ نئے نئے خیالات کو جنم دیں اور پھر ان پر عمل بھی کر سکیں ۔ اب اگر کوئی فرد ان حالات کے برعکس یہ کہے کہ سائنس اور پیشہ ورانہ علوم کی ضرورت نہیں اور اس کی بجائے کوئی اور مضامین پڑھانے کی سفارش کرے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اپنے پیش کردہ نظام کو چند مفروضوں پر استوار کر رہا ہے ، جن کا تعلق محض خیالی دنیا سے ہے ، حقیقت سے ہرگز نہیں ۔ یہ طریقہ حقیقی حالات میں لاتعلق رہتے ہوئے فرسودہ ثابت ہو گا ۔

محمد بن تغلق بہت پڑھا لکھا شخص تھا مگر اس کے تمام تر منصوبے ناقابل عمل مفروضوں پر مبنی تھے ۔ ان کا تعلق اس وقت کے ٹھوس حالات اور لوگوں کے مزاج سے ہرگز نہ تھا ۔ وہ باعمل نقطۂ نظر کا حامل نہ تھا ، وہ اپنے ذاتی خیالات اور مفروضات کے مطابق منصوبے بناتا ۔ یہ منصوبے اپنے بنیادی خاکے اور خیال میں قابل عمل نہ ہوتے تھے ۔ انتظامی طور پر تنفیذی معاملات میں کوتاہی برتی جاتی اور پھر نتائج کا انتظار کیے بغیر جلد بازی میں ان منصوبوں کو ترک کر دیا جاتا تھا ۔

محمد بن تغلق کے مقابلے میں باعمل منصوبہ بندی کے لیے علاؤالدین خلجی کی مثال دی جا سکتی ہے ۔ علاؤالدین خلجی پڑھا لکھا شخص نہ تھا مگر وہ احوال و واقعات کی روشنی میں منصوبہ بندی کرتا ، اور پھر سختی سے اس پر عمل درآمد کرواتا تھا ۔ نتیجتاً وہ کامیابی سے ہم کنار ہوتا تھا ۔

بعض مؤرخین کی رائے میں محمد بن تغلق اپنی ذات کو غیر ضروری طور پر اچھالنے کی کوشش کرتا تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عوام پر جبر کر کے انھیں اپنا ہم نوا بنا لے گا ۔ سیاسی طور پر مؤثر گروہوں سے اس نے بلاوجہ ٹکر لی اور ان کی اہمیت کو ماننے سے انکار کر دیا ۔ یہ اس کی بڑی غلطی تھی ، جس کے نتیجے میں وہ سیاسی طور پر بہت سی مشکلات سے دوچار ہوا ، بلکہ اس کے خلاف بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی علاقے آزاد ہو گئے ۔

یاد دہانی کے لیے نکات

1- محمد بن تغلق کی تمام تر حکمتِ عملی اس کی ناقص منصوبہ بندی اور غیر حقیقت پسندانہ رویے کے باعث ناکام رہی ۔

2- مالیاتی اصلاحات سے ، بہت سے علاقوں میں بدحالی اور قحط پیدا ہو گیا ۔

3- زراعت کا منصوبہ جلد بازی کی وجہ سے ناکام ہوا ۔

4- دارالحکومت کی تبدیلی کا فیصلہ غیر حقیقت پسندانہ تھا اور اس سے شمالی علاقہ جات غیر محفوظ ہو گئے ۔

5- علامتی سکوں کے اجرأ سے حکومتی خزانے پر سخت بوجھ پڑا ۔ تکنیکی طور پر درست ہونے کے باوجود ، لوگوں میں اعتماد پیدا نہ کرنے کے باعث یہ منصوبہ ناکام ہوا ۔ لوگوں نے بددیانتی سے لاکھوں روپیہ سرکاری خزانے سے حاصل کر لیا ۔

6- محمد بن تغلق کی فوجی مہمات ناکام رہیں ۔

7- محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں آخری 16 سال بغاوتوں کی نذر ہو گئے اور اس کے نتیجے میں بہت سے اہم علاقے آزاد ہو گئے ۔

8- محمد بن تغلق بنیادی طور پر غیر حقیقی مفروضوں پر مبنی حکمتِ عملی استوار کرتا تھا۔ وہ اپنی حکمتِ عملی ٹھوس حقائق اور لوگوں کے مزاج کے مطابق نہ بناتا تھا ۔

9- محمد بن تغلق کے دور سے تغلق خاندان کا بالخصوص اور سلاطین دہلی کی حکومت کا بالعموم زوال شروع ہو گیا ۔

غور و فکر کے لیے نکات

الف (i) محمد بن تغلق اپنی ذاتی کمزوریوں کے باعث ناکام حکمران رہا ۔ تجزیہ کریں ۔

(ii) محمد بن تغلق کی پالیسیاں غیر حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کے باعث ناکام ہوئیں ۔ بحث کریں ۔

ب — مختصر جواب دیں ۔

(i) جدّت پسندی سے کیا مراد ہے ؟

(ii) محمد بن تغلق کی مالیاتی اصلاحات کا عام لوگوں پر کیا اثر پڑا ؟

(iii) محمد بن تغلق نے زراعت میں بہتری کے لیے کیا کیا اقدام کیے؟

(iv) دارالحکومت کی تبدیلی ایک غیر موزوں فیصلہ تھا ، محمد بن تغلق نے یہ فیصلہ کیوں کیا ؟

(v) علامتی سکّوں کے اجرأ کا فیصلہ کیوں ناکام ہوا ؟

(vi) وسعت سلطنت کے سلسلے میں محمد بن تغلق کی مہمات کیوں ناکام ہوئیں؟

(vii) محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں ایک طویل عرصہ بغاوتوں کی نذر ہو گیا ۔ نوٹ لکھیں ۔

ج — نیچے ایک بیان کے ساتھ چند وجوہات دی گئیں ہیں۔ یہ سب وجوہات اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، تاہم ان میں سے کوئی ایک سب سے اہم اور بنیادی نوعیت کی ہے۔ ان تمام وجوہات پر کلاس میں باہم گفتگو کریں اور جو بھی مشترکہ فیصلہ ہو ، اس پر ✓ کا نشان لگائیں:۔

محمد بن تغلق کی پالیسیوں کی بنیاد :

(الف) اس کی ذاتی سوچ اور نظریات تھے ۔

(ب) اس کی خود پسندی تھی ۔

(ج) غیر حقیقت پسندی اور بے عملی تھی ۔

فیروز شاہ تغلق

(1351ء تا 1388ء)

فیروز شاہ تغلق، غیاث تغلق کے چھوٹے بھائی کا بیٹا تھا۔ سات برس کی عمر میں اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کی پرورش بعد میں غیاث الدین تغلق نے ہی کی۔ سلطان محمد بن تغلق بھی فیروز تغلق کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اسے اہم عہدوں پر فائز کر رکھا تھا۔

محمد بن تغلق کے انتقال کے بعد فیروز شاہ تغلق نے بادشاہت سنبھالی۔ اس کے عہد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور (1351 — 1371ء) میں سلطنت میں امن و امان اور سیاسی استحکام برقرار رہا مگر دوسرے دور میں (1371 — 1388ء) ملک میں انتشار بڑھا اور خاندانِ تغلق سے حکومت چھن گئی۔

فیروز شاہ تغلق نے وسعتِ سلطنت کی بجائے استحکام سلطنت کی طرف توجہ دی۔ اس نے چند ایک اصلاحات بھی کیں۔ اجمالی جائزہ یہ ہے:۔

ا- مالی اصلاحات

محمد بن تغلق کی اصلاحات کی ناکامیوں اور دوسرے غیر مناسب اقدامات کے باعث مجموعی معاشی صورتحال اور خاص طور پر کاشت کاروں کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ فیروز شاہ تغلق نے کاشت کاروں کو فوری طور پر سہارا دینے کے لیے ان پر واجب الادا دو کروڑ ٹنکے کے قرضہ جات کو معاف کر دیا۔

مالیے کی وصولی کے لیے ایک نیا نظام رائج کیا گیا۔ اس میں کھیت کی اصل پیداوار پر مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔ شرح مالیہ کل پیداوار کا 1/5 برقرار رکھی گئی۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں اس شرح کے برقرار رہنے کے باوجود پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ کاشت کاروں کی حالت میں بھی بہتری ہوئی۔

فیروز شاہ تغلق نے ان تمام غیر مناسب ٹیکسوں کو کالعدم قرار دیدیا جو عوام پر غیر ضروری بوجھ بن گئے تھے ۔ ان کی کل تعداد 23 تھی اور ان میں مثال کے طور پر چند ایک یہ تھے:۔ صابن سازی پر ٹیکس، گل فروشی، ماہی فروشی، چرائی، روغن گری، قصابوں پر ٹیکس، ریڑھی والوں پر ٹیکس وغیرہ وغیرہ۔ ان ٹیکسوں کے خاتمے سے عام لوگوں کو کافی سہولت میّسر آئی۔

کچھ ٹیکسوں کی شرح میں کمی کر دی گئی ۔ مال غنیمت کی شرح تقسیم میں خاص طور پر بہتری لائی گئی ۔ علاؤالدین خلجی کے دور میں مال غنیمت کا 4/5 حصہ حکومت کا ہوتا تھا اور 1/5 حصہ فوج میں تقسیم کر دیا جاتا تھا ۔ فیروز شاہ تغلق نے 4/5 حصہ فوج میں اور 1/5 حصہ حکومت کے لیے مخصوص کر دیا ۔

اب تک برہمنوں پر جزیہ کی ادائیگی معاف تھی کیونکہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ لوگ اپنی زندگی صرف مذہبی امور کے لیے وقف کر دیتے ہیں ۔ فیروز شاہ تغلق نے محسوس کیا کہ اب برہمن مذہبی امور کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی فوجی تربیت کی طرف بھی توجہ دے رہے ہیں ۔ اس تناظر میں ان پر جزیہ لاگو کرنا ضروری سمجھا گیا ۔ اس اقدام پر برہمنوں نے بڑا احتجاج کیا ۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنے فیصلے کو تو نہ بدلا البتہ شرح میں کمی کر دی ۔

دیگر ٹیکسوں کی شرح اس طرح تھی : خراج ، پیداوار کا 1/5 حصہ ، عشر ، زرعی پیداوار پر لاگو تھا اور 1/10 حصہ وصول کیا جاتا تھا ۔ زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصد یا جائیداد کا چالیسواں حصہ سالانہ تھی اور معدنیات کی کانوں پر پیداوار کا 1/5 حصہ بطور ٹیکس واجب الادا تھا ۔

ٹیکسوں کے نئے نظام سے عام لوگوں کی زندگی میں آسانی پیدا ہوئی ۔ ان اقدامات سے اگرچہ حکومتی آمدنی میں کمی واقع ہوئی تاہم فیروز شاہ تغلق نے مالیہ اور ٹیکس وصول کرنے والے اہلکاروں کو سخت تاکید کر رکھی تھی کہ مقررہ شرح سے ہرگز زیادہ وصول نہ کیا جائے ۔

II- فوجی اصلاحات

فوج کے انتظام کے لیے ، فیروز شاہ تغلق نے تمام تر ذمہ داری مرکز کے برعکس جاگیر داروں کے سپرد کر دی ۔ اب پھر پرانا نظام بحال کر دیا گیا ۔ اس میں علاقائی گورنر اور جاگیر دار فوج کی تنخواہوں ، ان کی تربیت اور تیاری کا خیال رکھتے تھے ۔ اس کے لیے ان کو بادشاہ کی طرف سے جاگیریں دی گئی تھیں ۔ اس نظام میں پھر عام کاشت کاروں پر زیادتی کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔ مالیہ کی وصولی سے اخراجات پورے کیے جاتے تھے اور اس وصولی میں جاگیر دار کاشت کاروں پر بڑی سختی کرتے تھے ۔

فیروز شاہ تغلق نے فوج کے عہدوں کو موروثی بنا دیا ۔ اس نے حکم جاری کر دیا تھا کہ اگر کوئی فوجی مر جائے تو اس کا عہدہ اس کے بیٹے کو دیدیا جائے ، اگر بیٹا نہ ہو تو اس کے داماد کو دیدیا جائے ۔

اس اقدام سے فوجی نظام اپنے معیار اور تربیت کے لحاظ سے ختم ہو کر رہ گیا ۔ اب کسی کو اپنی قابلیت اور بہادری دکھانے کی خواہش نہ تھی کیونکہ اس کے عہدے کو برقرار رکھنے کے لیے یہ چیزیں ضروری معیار نہ سمجھی جاتی تھیں ۔ اب عہدہ برقرار رکھنے کے لیے کسی عزیز کا فوج میں ہونا ہی کافی تھا ۔ اس طرح فوج نااہل افسروں اور سپاہیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ۔ اس کے اثرات بڑے واضح طور پر چند ہی سالوں میں نظر آنے لگے ۔

III- عدل و انصاف اور رفاہِ عامہ

فیروز شاہ تغلق سے پہلے مجرموں کو غیر ضروری طور پر بڑی سخت سزائیں دی جاتی تھیں ۔ ان میں مجرموں کے ہاتھ ، پاؤں ، ناک ، کان کاٹنا ، سینے کی ہڈیاں توڑ دینا ، ہاتھ پاؤں اور سینے میں میخیں گاڑھنا ، پگھلا ہوا سیسہ حلق میں انڈیل دینا ، آنکھیں نکال دینا ، زندہ انسان کی کھال اتار دینا ، آرے کے ساتھ زندہ انسان کو چیر دینا وغیرہ وغیرہ شامل تھیں ۔ فیروز شاہ تغلق نے ایسی تمام سزاؤں کو ممنوع قرار دے دیا ۔

ملک میں اسلامی معیارِ انصاف کو نافذ کرنے کی کوشش کی گئی ۔ ملک بھر میں مفتیوں اور قاضیوں کا تقرر عمل میں لایا گیا ۔ ہندوؤں کے قضیات کا فیصلہ ان کے

قوانین کے مطابق کیا جاتا تھا ۔ تاہم ملکی قانون سب کے لیے یکساں تھے ۔

رفاہ عامہ کے کاموں میں فیروز شاہ تغلق نے بڑی دلچسپی لی ۔ اس نے غریب اور نادار لڑکیوں کی شادی کے لیے ایک علیٰحدہ ادارہ قائم کیا ۔ غریبوں ، بیواؤں اور معذور لوگوں کی امداد کے لیے علیٰحدہ محکمہ کھولا گیا ۔ یہاں مستحق افراد کے نام درج کیے جاتے تھے اور ان کو گزراوقات کے لیے مناسب امداد دی جاتی تھی ۔ ملک بھر میں ہسپتال اور ڈسپنسریاں بنائی گئیں ۔ یہاں سے ہر خاص و عام کو مفت دوا مہیا کی جاتی تھی ۔ زراعت کے لیے بہت سی نہریں کھدوائی گئیں ۔ باغات لگوائے گئے ۔ آبپاشی اور گھریلو ضروریات کے لیے پانی کے ڈیم بنائے گئے ۔

مجموعی طور پر فیروز شاہ تغلق کے دورِ حکومت میں وسعتِ سلطنت کی طرف توجہ نہ دی گئی ۔ فیروز شاہ تغلق نے سابقہ دورِ حکومت میں آزاد ہونے والی ریاستوں کو بھی دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ۔ اس کی زیادہ تر توجہ انتظامی معاملات کو بہتر بنانے پر مرکوز رہی ۔

اپنی آخری زندگی فیروز شاہ تغلق نے خاصی پریشانی میں گزاری ۔ اپنے دو بیٹوں کے انتقال کے بعد اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا ۔ وہ جانشین کا انتخاب کرنے میں ناکام رہا جو اس کے بعد بہتر طور پر حکومت کی نگرانی کر سکتا ۔ امرأ کی سازشوں کے باعث وہ سخت پریشان تھا ۔ ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی ۔ انہی ایام میں 1388ء میں فیروز شاہ تغلق تراسی سال کی عمر میں انتقال کر گیا ۔

تجزیہ

محمد بن تغلق کی غیر حقیقت پسندانہ پالیسیوں کے باعث انتظامی اور سیاسی طور پر سلطنت کے معاملات بگڑ چکے تھے۔ یہی حالات فیروز شاہ تغلق کو ورثے میں ملے۔

فیروز شاہ تغلق کے فوجی انتظام کی ذمے داری کو جاگیرداروں کے حوالے کرنے سے بادشاہ کی قوت میں کمزوری واقع ہونا قدرتی تھا۔ علاؤالدین خلجی نے جاگیرداروں کی طاقت کو کم کرنے کے لیے ان سے فوجی انتظام کا کام واپس لے لیا تھا جس کے نتیجے میں بادشاہ جاگیرداروں کے ہاتھوں بے بس نہ رہا اور اس نے ایک مضبوط فوج کے بل بوتے پر خارجی اور داخلی طور پر کامیابیاں حاصل کیں۔ فیروز شاہ تغلق نے دوبارہ جاگیرداروں کو فوجی انتظام سونپ کر ان کو سیاسی طور پر مضبوط کر دیا۔ اس کا اثر بعد میں آنے والے دور پر پڑا اور یہی جاگیردار مختلف علاقوں میں اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر مرکز سے علٰحدہ ہوتے گئے۔

فیروز شاہ تغلق کی مالی اصلاحات اور رفاہ عامہ کے کام یقیناً قابلِ ستائش ہیں۔ ان میں عام بہبود اور انسانی ہمدردی کا پہلو نمایاں تھا۔ یہ انداز عام طور پر بادشاہوں میں کم نظر آتا ہے۔ وسعت پسندانہ پالیسی اختیار نہ کرنے سے فیروز شاہ تغلق نے مجموعی زوال کی صورت کو نسبتاً کم کر دیا۔

یاد دہانی

واقعاتی تسلسل

1- علاؤالدین خلجی کے بعد دورِ انتشار ——— 1316 تا 1320ء

(الف) ملک کافور ——— 1316ء

(ب) مبارک شاہ خلجی ——— 1316-1320ء

(ج) خسرو خان ——— 15 اپریل تا 7 ستمبر 1320ء

-2	غیاث الدین تغلق	——	1325-1320ء
-3	محمد بن تغلق	——	1351-1325ء
-4	وجیانگر کی آزاد ریاست کی بنیاد	——	1336ء
-5	بنگال کی آزاد حیثیت	——	1338ء
-6	بہمنی ریاست کی بنیاد	——	1347ء
-7	فیروز شاہ تغلق	——	1388-1351ء
-8	فیروز شاہ تغلق کا انتقال	——	1388ء

غور و فکر کے لیے چند نکات

-1 فیروز شاہ تغلق کی پالیسیوں کے باعث سلاطین دہلی کی حکومت میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل وقتی طور پر کمزور پڑگیا، دلائل کے ساتھ تبصرہ کریں۔

-2 فیروز شاہ تغلق کی اصلاحات کا جائزہ لیں۔

8

سلاطینِ دہلی کی حکومت میں انحطاط

پس منظر

ہندوستان میں محمود غزنوی کے حملوں کے کافی عرصے کے بعد شہاب الدین محمد غوری نے یہاں بہت سے علاقے فتح کیے ۔ انہی مقبوضہ علاقوں پر قطب الدین ایبک اور التتمش نے ایک حکومت کی بنیاد رکھی ۔ اس حکومت کو بلبن اور علاؤالدین خلجی نے استحکام بخشا ۔ غیاث تغلق کے زمانے میں سلاطینِ دہلی کی حکومت اپنی وسعت کے اعتبار سے پہلے کبھی اتنی نہ تھی ۔ بعد میں محمد بن تغلق کی پالیسیوں کی وجہ سے انتظامی اور سیاسی طور پر سلاطینِ دہلی کی حکومت میں انحطاط واضح طور پر اُبھرنا شروع ہوگیا ۔ اقتصادی ، سیاسی اور انتظامی طور پر معاملات مرکز کے کنٹرول سے باہر ہونے لگے ۔

ان حالات میں سلاطینِ دہلی کے مخالف سیاسی گروہوں نے اپنی کارروائیاں شروع کر دیں ۔ انھوں نے اپنے اپنے علاقوں کو بادشاہ سے آزاد کروانا شروع کر دیا ۔ انہی ایاّم میں جلتی پر تیل کا کام امیر تیمور کے حملے نے کیا اور مرکزی قوت مزید پاش پاش ہوگئی ۔

امیر تیمور کے حملے کے بعد اگرچہ کئی ایک خاندانوں نے دہلی پر حکومت کی مگر انحطاط کا جو طوفان اٹھ چکا تھا ، یہ حکمران اس کے سامنے محض ایک تنکا ٹھہرے اور آخر کار ہندوستان میں سیاسی طور پر نیا ماحول پیدا ہوگیا۔ جس کا فائدہ پھر ایک مسلمان حملہ آور نے اٹھایا۔ اس کا تعلق بھی وسط ایشیا سے تھا۔ اس نے یہاں خاندانِ مغلیہ کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

فیروز شاہ تغلق کے جانشین اور امیر تیمور کا حملہ

فیروز شاہ تغلق کے انتقال کے بعد 1388ء سے 1414ء تک اس کے بیٹوں اور پوتوں میں خانہ جنگی کی کیفیت رہی ۔ اس خانہ جنگی سے براہ راست فائدہ ، ہندو راجاؤں اور گورنروں نے اٹھایا ۔ ان سب نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا ۔

اسی دوران 1398ء میں امیر تیمور نے ہندوستان میں سیاسی اور انتظامی بدحالی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں حملہ کر دیا ۔ اُس وقت دہلی کی بادشاہت محمود تغلق کے پاس تھی ۔ حملے کے وقت یہ دہلی سے بھاگ گیا اور اس نے گجرات میں جا کر پناہ لے لی ۔ امیر تیمور کے حملے کے بعد یہ واپس دہلی آیا اور اس نے 1414ء تک حکومت جاری رکھی ۔ یہ حکومت حد درجہ کمزور اور بے اثر تھی ۔

امیر تیمور

امیر تیمور سمرقند کے جنوب میں واقع شہر "سبز" میں 1336ء میں پیدا ہوا ۔ ترکی زبان میں تیمور کے معنی "لوہے" کے ہیں ۔ کسی جنگ میں تیمور کی ایک ٹانگ زخمی ہو گئی تھی ، جس کے باعث وہ لنگڑا کر چلتا تھا ۔ اسی مناسبت سے اُسے "تیمور لنگ" بھی کہا جاتا ہے ۔

اپنے باپ کے انتقال کے بعد تیمور اپنے قبیلے کا سردار بنا ۔ اُس نے اپنے قبیلے کو منظم کر کے ایک فوج تیار کی اور ایران ، عراق ، ایشیائے کوچک ، افغانستان اور حتیٰ کہ روس کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا ۔ انہی فتوحات سے اس کا حوصلہ بلند ہوا اور اس نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا ۔

امیر تیمور نے اپنی خودنوشت "تزک تیموری" میں لکھا ہے کہ اس کے سامنے ہندوستان پر حملہ کرنے کا مقصد کفر و شرک کو ختم کرنا اور دولت اکٹھی کرنا تھا ۔ آبِ کوثر کے مصنف نے اس سے اتفاق نہیں کیا وہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا لیکن اس پر اور اس کے ساتھیوں پر اسلامی تعلیمات کا ابھی تک کوئی اثر

نہ ہوا تھا، جو آہستہ آہستہ بابر اور بعد کے مغلوں پر ہوا تھا۔ ابھی تک اس میں نسلی، روایتی سخت گیری اور درشت مزاجی بہت حد تک باقی تھی۔" ہندوستان میں آکر امیر تیمور نے جو کارروائیاں کیں، ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا اس کا واحد مقصد لوٹ کھسوٹ اور ظلم و جَور تھا۔ اس کی مدافعت کے لیے مقامی طور پر کوئی طاقتور گروہ بھی نہ تھا۔

امیر تیمور کا حملہ

امیر تیمور نے اپنے پوتے کو ہراول کے طور پر ہندوستان بھیجا۔ اس نے 1398ء کے اوائل تک ملتان اور اُچ پر قبضہ کر لیا تھا۔ امیر تیمور نے ستمبر 1398ء کو دریائے سندھ کو عبور کیا اور یہ دونوں لشکر مل کر لاہور پہنچے۔ یہاں سے مختلف علاقے فتح کرتا ہوا امیر تیمور، دہلی پہنچا۔ دہلی پہنچتے پہنچتے اس کے پاس ایک لاکھ قیدی جمع ہو گئے تھے۔ ان قیدیوں میں ہر قوم و مذہب کے لوگ شامل تھے۔ دہلی میں جنگ سے پہلے امیر تیمور نے ان تمام قیدیوں کو قتل کروا دیا تاکہ دورانِ جنگ یہ کسی قسم کا مسئلہ نہ کھڑا کر دیں۔

دہلی میں جنگ

محمود تغلق نے ایک لشکر کے ساتھ تیمور کا مقابلہ کیا۔ سخت جنگ کے بعد امیر تیمور کی جیت ہوئی۔ محمود تغلق جان بچا کر گجرات بھاگ گیا۔ امیر تیمور نے دہلی میں اپنا دربار لگایا۔ دہلی میں قتل عام جاری تھا۔ علماء و مشائخ نے امیر تیمور کو بھاری تاوان دے کر قتلِ عام ختم کرنے کی سفارش کی۔ امیر تیمور نے اس کو قبول کر لیا۔ دہلی کی مساجد میں امیر تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اسی اثنا میں دہلی کے باشندوں اور تیمور کے سپاہیوں کے درمیان ایک معمولی جھگڑے میں تیمور کے چند سپاہی مارے گئے۔ اس پر امیر تیمور نے غصے میں تین دن کے لیے دہلی میں قتل عام کرنے کا حکم دے دیا۔ ہزاروں انسانوں کو قتل کر دیا گیا۔ لوٹ مار کی گئی۔ ہزاروں عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔

چند روز دہلی میں قیام کے بعد امیر تیمور نے دہلی سے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ اس کے مالِ غنیمت میں ہزاروں غلام، کنیزیں، ہزاروں من ہیرے جواہرات، قیمتی موتی، سونے، چاندی کے انبار، سینکڑوں کاریگر اور قیمتی نوادرات شامل تھے۔

ہندوستان چھوڑنے سے پہلے امیر تیمور نے ملتان اور دیپالپور پر سید خضر خان کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اسی نے سید خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

حملے کے اثرات

امیر تیمور اپنے کہنے کے برعکس، ہندوستان میں بسنے والی تمام نسلوں اور تمام مذاہب کے لوگوں کے لیے ظلم و زیادتی کا پیغام بن کر آیا۔ لاکھوں انسان قتل کر دیے گئے، فصلیں تباہ ہوگئیں، آتش زنی کی وجہ سے زمینیں بنجر ہوگئیں جو کئی سال تک ناقابلِ کاشت رہیں۔ اس کے باعث ہندوستان میں قحط پڑ گیا۔

سلطنتِ دہلی کی بچی کھچی طاقت یکسر ختم ہوگئی۔ مرکزیت کا خاتمہ ہوگیا۔ تیمور کے حملے سے پہلے بنگال، دکن اور وجیانگر خود مختار علاقے بن چکے تھے۔ امیر تیمور کے حملے کے بعد گجرات، مالوہ اور جونپور میں بھی خود مختار ریاستیں اُبھر آئیں۔ لاہور، دیپالپور، ملتان اور سندھ کے کچھ حصّوں پر خضر خان نے امیر تیمور کے نائب کی حیثیت سے ایک علٰحدہ حکومت قائم کرلی تھی۔ ان کے علاوہ پورے ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں جنم لے رہی تھیں ان میں سمانہ، کالیا، بیانہ، ماہوبہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

سیّد خاندان (1414ء — 1451ء)

سیّد خاندان صرف 37 سال تک برسراقتدار رہا۔ اس دور میں نہ تو انتظامی سطح پر کوئی بہتری نظر آتی ہے اور نہ ہی سیاسی طور پر کوئی پیش رفت ہوئی۔ مجموعی طور پر عدم استحکام اور خودمختار ریاستوں کے قیام کا سلسلہ جاری رہا۔

اب دہلی کی سلطنت دہلی کے اردگرد چند سو مربع کلومیٹر تک محدود تھی۔

خضر خان (1414ء — 1421ء)

1414ء میں محمود تغلق کے انتقال کے بعد امرأ نے حکومت، دولت خان لودھی کے سپرد کر دی۔ دولت خان لودھی نے بادشاہت کا باقاعدہ اعلان تو نہ کیا تاہم اس نے ایک مطلق العنان آمر کے طور پر حکومت شروع کر دی۔

خضر خان، امیر تیمور کا ہندوستان میں نائب تھا اور لاہور میں مقیم تھا۔ اس نے دہلی کو محاصرے میں لے لیا۔ چار ماہ کے محاصرے کے بعد دولت خان لودھی بھاگ گیا اور خضر خان نے دہلی کی حکومت پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح اُس نے دہلی کی حکومت پر سید خاندان کے اقتدار کی بنیاد ڈالی۔

خضر خان کے دورِ حکومت میں بہت سی ریاستیں خودمختار ہو چکی تھیں۔ تاہم خضر خان نے دوآب، راجپوتانہ اور چند ایک دوسرے علاقوں میں اپنا سیاسی اور فوجی اثر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اِن علاقوں میں اس نے اپنے وفادار گورنر مقرر کر دیے۔

خضر خان نے کاشت کاروں کے حالات کو بہتر کرنے اور بادشاہ کی طاقت کو بحال کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

خضر خان نے 1421ء میں وفات پائی۔

مبارک شاہ (1421 — 1434)

مبارک شاہ، خضر خان کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے برعکس امیر تیمور کے نائب ہونے کی حیثیت کو ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے آپ کو خودمختار بادشاہ سمجھنے لگا۔

سلاطینِ دہلی کی حکومت میں انحطاط کی بنیادی وجہ مقامی جاگیرداروں اور امرأ کا خود مختار ہونا تھا ۔ تغلق خاندان کے آخری دور میں ان کی سیاسی ساکھ بہت مضبوط ہو چکی تھی اور انھوں نے حکومت کو مالیہ کی ادائیگی بھی بند کر دی تھی ۔

مبارک شاہ نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے جاگیرداروں کی ساکھ کو ختم کرنا ضروری سمجھا ۔ اس کے لیے اس نے یہ اعلان کیا کہ جاگیروں پر کسی کا وراثتی حق نہیں اور ان کو ایک جاگیر سے دوسری جاگیر پر منتقل کر دیا ۔ اس تبادلے کا مقصد ان کو سیاسی طور پر بے اثر کرنا تھا ۔ کیونکہ نئے علاقے یا جاگیر میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے میں لامحالہ ان کو ایک طویل مدت کی ضرورت تھی ۔ اس سلسلے میں مبارک شاہ کو کئی ایک جنگیں بھی لڑنا پڑیں ۔

مبارک شاہ نے مندرجہ بالا اقدام کر کے اپنی حیثیت کو مضبوط بنایا۔ اس کے دور میں کئی داخلی اور خارجی سازشیں ہوئیں ، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکیں ۔ امرأ اور جاگیردار مبارک شاہ کے رویے سے ناخوش تھے ، کیونکہ ان لوگوں کے مفادات کا حصول مبارک شاہ کے دور میں ممکن نہ تھا ۔ آخر امرأ اور جاگیرداروں نے ایک منصوبے کے تحت مبارک شاہ کو 1434 ء میں قتل کروا دیا۔

مبارک شاہ ، سید خاندان کے حکمرانوں میں سب سے اہل اور قابل حکمران تھا ۔ اس نے مجموعی طور پر سیاسی اور انتظامی استحکام کے لیے بہت سے اقدامات کیے جن میں اسے چند ایک کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں ، مگر امرأ اور جاگیرداروں نے ذاتی مفادات کے وجہ سے اس کو راستے سے ہٹا دیا ۔

محمد شاہ (1434–1445 ء)

مبارک شاہ کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا ، محمد شاہ برسر اقتدار آیا ۔ اس کا دورِ حکومت حد درجہ غیر مؤثر تھا ۔ ملتان میں لنگاہ خاندان نے خود مختار حکومت قائم کر لی تھی ۔ سرہند میں بہلول لودھی نے مرکزی اور مشرقی پنجاب میں اپنا اثر بڑھانا شروع کر دیا تھا ۔ محمد شاہ نے اس کے سیاسی اثر کو قبول کر کے پنجاب پر اس کے قبضے کو تسلیم کر لیا ۔ محمد شاہ 1445 ء میں وفات پا گیا ۔

علاؤالدین عالم شاہ (1445ء — 1451ء)

محمد شاہ کے انتقال کے بعد علاؤالدین عالم شاہ حکمران بنا۔ یہ اپنی عیش پسند طبع کے باعث امورِ سلطنت میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اس کے دور میں دہلی کی حکومت چند کلومیٹر سے زیادہ علاقے پر نہ تھی۔ 1448ء میں عالم شاہ نے دہلی چھوڑ کر بدایوں میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کی دارالحکومت سے غیر حاضری کے باعث وزیروں اور امرأ نے بہلول لودھی کو دہلی پر حکومت کرنے کے لیے بلا لیا۔ 1451ء میں بہلول لودھی نے ایک دربار منعقد کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی لودھی خاندان کی حکومت کا دور شروع ہو گیا۔
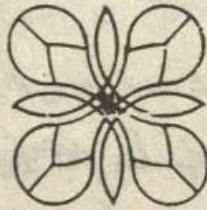
لودھی خاندان

(1451 - 1526ء)

بہلول لودھی (1451 - 1489ء)

لودھی خاندان سلطنت دہلی کا پانچواں اور آخری حکمران خاندان تھا۔ افغانوں کی زبان میں لودھی سے مراد "بڑا یا بزرگ" ہے۔ بہلول لودھی کا دادا، فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں کوہ سلیمان میں اپنے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان چلا آیا تھا۔ اُس نے یہاں ملتان کے صوبیدار کے ہاں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

بہلول لودھی کا والد ایک پرگنے کا مالک تھا۔ اس کے انتقال کے بعد بہلول لودھی کی پرورش اس کے چچا اسلام خان نے کی۔ اسلام خان نے بہلول لودھی کو افغان فوج کا سربراہ مقرر کر دیا۔ سید خاندان کے ایک حکمران عالم شاہ کے زمانے میں بہلول لودھی پورے پنجاب کا حاکم بن گیا تھا۔ بعد میں اس نے دہلی پر بھی قبضہ کر لیا اور وہ دہلی کا بادشاہ بن گیا۔ بہلول لودھی نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنی افغان نسل کے لوگوں کی سرپرستی شروع کر دی۔ وہ اپنے آپ کو اپنے قبیلے کا سردار سمجھتا تھا اور اس لحاظ سے افغانوں کو بہت سے اہم عہدے عطا کیے گئے۔

بہلول لودھی کی خواہش تھی کہ وہ اپنی سلطنت کو وُسعت دے۔ ملتان کے لنگاہ خاندان سے اس نے لڑائی کی، مگر ناکام رہا۔ جونپور کی ریاست کو اپنے زیرِ تسلّط کرنے کے لیے اس نے زندگی بھر کوششیں کیں مگر مرنے سے کچھ عرصہ پہلے اسے یہ کامیابی نصیب ہوئی۔ بہلول لودھی کا انتقال 1489ء میں ہوا۔

سکندر لودھی (1489 - 1517ء)

بہلول لودھی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سکندر لودھی تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے باپ کے سیاسی اثرات اور مقبوضات کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی۔ مگر اس

کے اپنے بھائی نے اس کی راہ میں مشکلات پیدا کر دیں ۔

سکندر لودھی کے بھائی اپنے آپ کو تخت کا حق دار سمجھتے تھے ۔ سکندر نے ان میں سے ایک کو اوٹاوہ اور دوسرے کو جونپور کا گورنر مقرر کر دیا ۔ جونپور میں امرأ نے بغاوت کر دی ، سکندر نے اپنے بھائی کی مدد کی مگر وہ نااہل ثابت ہوا ۔ اس کی جگہ کسی اور شخص کو گورنر مقرر کر دیا گیا ۔ جونپور کے سابقہ سلطان نے سکندر لودھی کے خلاف پھر قسمت آزمائی کی مگر وہ ناکام رہا ۔ سکندر لودھی نے بنگال کے حکمران سے دوستی کا معاہدہ کر کے اسے اپنی مخالفت سے باز رکھا ۔

سکندر لودھی اپنی انتظامی صلاحیتیوں کی بنیاد پر لودھی خاندان میں منفرد مقام رکھتا ہے ۔ اُس نے اپنی سلطنت کی حدود کو وسعت دی اور اپنے حریفوں کو قابو میں رکھا ۔ انتظامی ضروریات کے پیش نظر سکندر نے دارالحکومت دہلی سے تبدیل کر کے آگرہ میں قائم کیا ۔ مجموعی طور پر سکندر لودھی نے سلطنت دہلی کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا دینے کی کوشش کی اور اس میں اسے کامیابی بھی ہوئی ۔ رفاہِ عامہ کے لیے اس نے بہت سے اقدامات کیے۔

سکندر لودھی کا انتقال 1517 ء میں ہوا ۔

ابراہیم لودھی (1517 - 1526 ء)

سکندر لودھی کے انتقال کے بعد افغان سرداروں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ سکندر کا سب سے بڑا بیٹا ابراہیم لودھی ، دہلی کا حکمران ہو گا ۔ سکندر کے چھوٹے بیٹے جلال خان کو جونپور کا حکمران بنا دیا گیا ۔

ابراہیم لودھی اور جلال خان کے درمیان اقتدار کے لیے ایک چپقلش شروع ہو گئی ۔ اس چپقلش میں کئی دفعہ دونوں بھائی برسر پیکار بھی ہوئے ۔ ان دونوں کی لڑائیوں سے افغان قوم دو حصوں میں بٹ گئی ۔ اس نفاق کے باعث افغانوں کی اجتماعی قوت میں بھی کمزوری آگئی ۔

افغانوں کے درمیان نفاق سے میواڑ کے راجا رانا سانگا نے فائدہ اٹھایا ۔ اس نے

سلطنت دہلی کے بہت سے علاقے ہتھیا لیے اور اپنی حکومت کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

ابراہیم لودھی چاروں طرف سے مصائب میں گھر گیا تھا۔ اس کے لیے سب سے بڑا خطرہ رانا سانگا کی بڑھتی ہوئی قوت تھی۔ دونوں کے درمیان ایک طویل جنگ جاری رہی۔ آخر کار ابراہیم لودھی نے رانا سانگا سے صلح کر لی۔ ان جنگوں سے ابراہیم لودھی کی فوجی قوت اور سیاسی ساکھ پر کاری ضرب لگی۔

ابراہیم لودھی درشت مزاج اور آمرانہ پالیسیوں کا حامل تھا۔ اس رویے سے اس کے امرأ اور گورنروں کو بھی مفّر نہ تھا۔ وہ محض بد ظنی کی بنیاد پر گورنروں کو قید کروا دیتا یا انھیں بے عزت کر دیتا۔ اس رویے سے تنگ آکر اکثر امرأ اس کے خلاف ہونے لگے۔ بہار میں بہت سے امرأ نے ابراہیم لودھی سے تنگ آکر اپنی حکومت قائم کر لی۔

پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی پر بھی ابراہیم لودھی کو بھروسہ نہ تھا۔ ابراہیم لودھی کا خیال تھا کہ وہ اس کے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔ ابراہیم لودھی نے دولت لودھی کو دہلی میں طلب کیا۔ دولت لودھی نے خوف کے مارے اپنی بجائے اپنے بیٹے دلاور خان کو دہلی روانہ کر دیا۔ ابراہیم لودھی نے اس کی سخت بے عزتی کی۔ واپس آکر اُس نے اپنے باپ کو ابراہیم لودھی کے برتاؤ اور عزائم سے آگاہ کیا۔

انھی حالات و محرکات کے پیش نظر دولت خان لودھی نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ بابر نے 1524ء میں پنجاب پر فوج کشی کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا اور دولت خان لودھی کو مدد کرنے کے صلے میں جالندھر اور کئی دوسرے اضلاع عطا کر دیے۔ بعد ازاں 1526ء میں بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر ہندوستان میں وسطِ ایشیا ہی کے ایک خاندان مغلیہ کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

تجزیہ : فیروز شاہ تغلق کے بعد 1388ء سے 1526ء تک دہلی کی حکومت پر کئی ایک حکمران رہے ۔ یہ سب حکمران اپنے پیش رو حکمرانوں کے مقابلے میں انتظامی اور سیاسی طور پر بہتر حالات پیدا کرنے میں ناکام رہے ۔ ان کے مدِ مقابل سیاسی گروہ دن بدن تقویت حاصل کرتے رہے اور اپنی اپنی جگہ پر مرکزی حکومت سے آزاد ہوتے گئے ۔ آخر کار ان کی کمزوری سے داخلی اور خارجی طور پر ہر ایک نے فائدہ اٹھایا اور سلاطینِ دہلی کی حکومت اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی۔

یاد دہانی کے لیے اہم نکات

واقعاتی تسلسل:

-1 فیروز شاہ تغلق کے جانشین —— 1388ء - 1414ء

-2 امیر تیمور کا حملہ —— 1398ء

-3 سیّد خاندان کی حکومت —— 1414ء - 1451ء

-4 لودھی خاندان کی حکومت —— 1451ء - 1526ء

(i) بہلول لودھی —— 1451ء - 1489ء

(ii) سکندر لودھی —— 1489ء - 1517ء

(iii) ابراہیم لودھی —— 1517ء - 1526ء

اہم نکات برائے اعادہ

(1) فیروز شاہ تغلق کے بعد آنے والے تغلق خاندان کے حکمران نااہل تھے۔ ان کی انتظامی کمزوریوں کے باعث مختلف علاقے خودمختار ہونے لگے۔

(2) امیر تیمور کے حملے سے دہلی کے حکمران کی رہی سہی طاقت بھی ختم ہو گئی اور آزاد ریاستوں کے قیام کا سلسلہ مزید تیز ہو گیا۔

(3) سیّد خاندان کے دورِ حکومت میں سیاسی اور انتظامی استحکام کی کیفیت مزید بگڑ گئی۔ یہ حکمران ہم عصر حالات میں بہتر پالیسیاں نہ بنا سکے۔

(4) لودھی خاندان کے زمانے میں، افغانوں کی باہمی لڑائیوں کے باعث رانا سانگا ایک طاقت ور مدِّمقابل کے طور پر اُبھرا۔ لودھیوں میں اس کے مقابلے کی سکت نہ تھی اس لیے انہوں نے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

(5) لودھی خاندان کی باہمی آویزش کے نتیجے میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا اور پھر یہیں پر اس نے اپنے خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

1- مجموعی طور پر کن محرکات کی بناء پر سلاطینِ دہلی کو زوال ہوا؟ تجزیاتی نوٹ لکھیں۔

2- امیر تیمور کے حملے سے کیونکر زوال کا عمل تیز تر ہو گیا؟

3- سید خاندان کی سلطنتِ دہلی پر حکومت کا مختصر جائزہ لیں؟

4- لودھی خاندان کی حکمران کن وجوہات کی بنیاد پر سلطنتِ دہلی کے زوال کو نہ روک سکے۔ تجزیہ کریں۔

9 سلاطینِ دہلی کے عہدِ حکومت کا انتظامی ڈھانچہ

قدیم یونان میں بہت سی ریاستیں تھیں، ان میں سے ایک ریاست میں قابل آدمی کے لیے یہ معیار مقرر تھا کہ وہ جسمانی طور پر مضبوط ہو اور خوب طاقت ور ہو۔ اس معیار کے برعکس بہتر انسان کا کوئی تصوّر یہاں موجود نہ تھا۔ اسی طرح آج کے دور میں حکومتی نظام اور اداروں کے قیام کا بنیادی معیار یہ ہے کہ یہ ادارے عوام کی ضروریات اور خواہشات کے مطابق بنائے جائیں اور عوام کی ضروریات اور خواہشات کے مطابق ہی یہ کام کریں۔ اگر حکومتی اداروں کی کارکردگی عوام کی ضروریات اور خواہش کے برعکس ہو تو آج کل ایسے وسیلے موجود ہیں جن کے ذریعے لوگ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتے ہیں اور حکومت کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ ان اداروں کی کارکردگی کو تبدیل کرے یا ان میں بہتری لائے۔ اس نئے انداز کو جمہوری نظام کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں حکومتی ادارے عوام کی رائے کے مطابق بنائے جاتے ہیں اور عوام کی بہتری کے حوالے سے ہی ان کی کارکردگی متعین کی جاتی ہے۔

آج سے سینکڑوں سال پہلے بادشاہت کا باقاعدہ ایک دور تھا۔ اس دور میں عوام کی مرضی کو حکومتی ڈھانچے کی تعمیر میں عمل دخل حاصل نہ تھا۔ اُس نظام کو یک طرفہ نظام کہا جا سکتا ہے کیونکہ بادشاہ اپنی مرضی اور سمجھ کے مطابق انتظامی ڈھانچہ استوار کرتے تھے اور عوام کا کام اس پر عمل کرنا ہوتا تھا۔ ڈھانچے کی استواری میں عوام کی خواہشات اور ضروریات کو براہِ راست فوقیت حاصل نہ ہوتی تھی۔

کوئی بھی بادشاہ اپنے اغراض و مقاصد کی تناظر میں اپنی حکومت کا انتظامی ڈھانچہ استوار کرتا تھا۔ ان میں سرِ فہرست اور بنیادی مقاصد حسبِ ذیل ہوتے ہیں۔

1- ملک کی تمام تر سیاسی، فوجی اور انتظامی طاقت کو اپنے پاس مرتکز رکھنا۔
2- سیاسی یا انتظامی طور پر مؤثر گروہوں کی وفاداریاں جیتنا۔
3- اپنی سلطنت کو وسعت دے کر اپنی سیاسی اور فوجی ساکھ کو منوانا۔

ان بنیادی تقاضوں کے تحت ہی انتظامِ سلطنت کے لیے ڈھانچہ استوار کیا جاتا تھا۔ سلاطینِ دہلی کے دور میں مروّجہ ڈھانچے میں مختلف اداروں کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

بادشاہ : بادشاہ، سلطنت کا واحد، مطلق العنان حاکم ہوتا تھا۔ تمام تر عدالتی، انتظامی اور قانون سازی سے متعلق انتظامات اور اُمور کا سرچشمہ بادشاہ کی ذات ہوتی ہے۔

شہنشاہیت کا تصوّر جو سلاطینِ دہلی کے کردار و عمل کا ستون رہا بنیادی طور پر ایرانی تھا۔ ایران میں بادشاہ کو اللہ کی طرف سے مامور سمجھا جاتا تھا۔ اس مناسبت سے اُسے ظل اللہ یعنی اللہ کا سایہ کہا جاتا تھا۔ ہندوستانی ماحول میں یہ تصور اس لیے بھی کارآمد سمجھا گیا کیونکہ ہندوستان میں بادشاہ کے بارے میں تصورات اس ایرانی تصور سے ملتے جلتے تھے۔ اس تصور کو التتمش نے فروغ دیا اور بلبن کے دَور تک یہ باقاعدہ طور جڑ پکڑ گیا۔

بادشاہ اپنی طاقت کے اثر کو پوری سلطنت میں پھیلانے کے لیے یا دوسرے لفظوں میں اپنی حکومت کو استحکام دینے کے لیے تمام سیاسی گروہوں کی مدد حاصل کرتا تھا۔ ان گروہوں میں سب سے اہم امرأ، جاگیرداروں اور علماء و مشائخ کے گروہ ہوتے تھے۔ علماء و مشائخ عوام میں اپنی مبقولیت کے باعث بادشاہ کے لیے بہتر رائے عامہ استوار کرنے میں معاون ہو سکتے تھے۔ تاہم علماء و مشائخ کا ایک طبقہ اکثر بادشاہ سے ربط و تعلق کو ناپسند کرتا تھا۔ بنیادی ضروریاتِ حکومت کے پیش نظر بادشاہ سب سیاسی گروہوں سے خاص تعلق کی توقع رکھتا تھا اور اس کے بدلے میں ان گروہوں کو خاص مراعات بھی دی جاتی تھیں۔

امرأ کے گروہ سے ہی مرکزی اور صوبائی انتظامیہ کے لیے اعلیٰ افسران اور گورنر

وغیرہ منتخب کیے جاتے تھے۔ یہ ہر محکمے اور سلطنت کے ہر حصے میں بادشاہ کے وفادار نمائندوں کی حیثیت سے انتظامی اور اقتصادی ضروریات کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اگر امرأ کی انتظامی کارکردگی بہتر نہ رہتی یا ان کی وفاداریوں پر بادشاہ کو اعتماد نہ رہتا تو وہ فوری طور پر ان کو تبدیل کرنے کا انتظام کرتا تھا۔ اس کا اندازہ فوجی نظام کے سلسلے میں بلبن اور علاؤالدین خلجی کی پالیسیوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک بادشاہ کے مرنے کے بعد عام طور پر اس کے بیٹے کو وارثِ سلطنت سمجھا جاتا تھا۔ بعض اوقات امرأ اپنے مفادات کے تحت سازشوں سے کام لے کر اپنی پسند کے حکمران لے آتے تھے۔

بادشاہت کے ادارے کے لیے خصوصی انتظامات کیے جاتے تھے اور اس کے لیے کئی محکمے قائم تھے۔ چند ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

شاہی محل سرائے : بادشاہ کے شاہی محل کے انتظام اور یہاں پر ضروری اشیاء کی فراہمی کے جملہ اُمور کی ذمہ داری اس محکمے کے سپرد تھی۔ ان تمام اُمور کی نگرانی کرنے والے افسر اعلیٰ کو وکیل در کہا جاتا تھا۔ شاہی محل سرائے کے دوسرے اہم محکمے یہ تھے۔

(الف) امیر حاجب یا باربک : یہ شاہی دربار کی تقریبات آداب و رسومات بجا لانے کا ذمے دار ہوتا تھا۔ اس کے ذمے دربار میں نشستوں کی تقسیم کا کام ہوتا تھا کہ کس نشست پر اپنے رتبے کے اعتبار سے کون بیٹھے گا۔ بادشاہ سے ملاقات کروانے کا بندوبست کرنا اس کے ذمے تھا۔ تمام عرضداشتیں اس کی معرفت بادشاہ کو بھیجی جاتی تھیں۔ آج کل اس قسم کا عہدہ ذاتی معاون یا سیکرٹری کا ہوتا ہے جو وزیراعظم یا گورنر وغیرہ کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

(ب) نقیب : جب کبھی بادشاہ محل سے باہر آتا تو اس کی آمد کا اعلان کرنا، بادشاہ کی سواری کے لیے راستہ صاف کروانا اس کے ذمے تھا۔ آج کل یہ کام پولیس کا ایک خاص دستہ کرتا ہے۔

(ج) **باڈی گارڈ :** بادشاہ کی حفاظت کے لیے طاقت ور اور مستعد لوگوں کا ایک دستہ بادشاہ کی سواری کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

شاہی خاندان کی عورتوں کی حفاظت کے لیے طاقت ور خواجہ سرا مقرر کیے جاتے تھے۔

(د) **غلام :** محل میں ایک کثیر تعداد میں غلام رکھے جاتے تھے۔ بادشاہ ان کی تربیّت کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ ان سے انتظامی امور میں مدد لی جاتی تھی۔ اُس زمانے میں بادشاہ زیادہ سے زیادہ غلام رکھنا اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ علاؤالدین خلجی کے پاس 50 ہزار اور فیروز تغلق کے پاس ایک لاکھ اسی ہزار غلام تھے۔ فیروز تغلق نے تو غلاموں کے لیے ایک علٰحدہ وزارت بھی قائم کر دی تھی، جس کا نام 'دیوانِ بندگان' تھا۔

(ر) **کارخانے :** شاہی محل میں عام ضروریات کی چیزیں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ ان میں لباس ، برتن اور فرنیچر وغیرہ کی تیاری شامل تھی ۔

مرکزی حکومت کا انتظامی ڈھانچہ

دیوانِ وزارت: بادشاہ کے بعد سب سے اہم ادارہ وزیر کا ہوتا تھا۔ اس کو دیوان وزارت کہا جاتا تھا۔ دیوان کا مطلب ہے "محکمہ"۔ یہ محکمہ خزانے کے امور کا نگراں ہوتا تھا مگر حقیقت میں اس محکمے کے سپرد تمام محکموں کی نگرانی ہوتی تھی۔ وزیر کی تقرری میں اس بات کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ بادشاہ کا وفادار ہو اور وہ ضروری تجربہ اور انتظامی اہلیّت بھی رکھتا ہو۔ وزیر کی مدد کے لیے بعض اوقات ایک نائب وزیر بھی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ سلطنتِ دہلی کے دَور میں وزیر کو صدر اعلٰی یا خواجۂ جہاں بھی کہا جاتا تھا۔

دیوانِ رسالت

دیوانِ رسالت کا کام مذہبی معاملات کی نگرانی تھا۔ یہ محکمہ اہلِ علم کے وظائف

مقرر کرتا تھا۔ اس محکمے کے سربراہ کو صدر الصدور کہا جاتا تھا۔ غربا ، مسجدوں اور خانقاہوں کی مالی امداد کرنا اس محکمے کے فرائض میں شامل تھا۔ صدر الصدور براہ راست بادشاہ کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا۔

دیوانِ قضاء

عدل کے محکمے کو دیوانِ قضاء کہا جاتا تھا۔ اس محکمے کے سربراہ کو قاضی القضاۃ کہا جاتا تھا۔ یہ پوری سلطنت میں مختلف درجوں پر عدالتی نظام کے بندوبست کا ذمے دار ہوتا تھا۔ ہر شہر میں قاضی مقرر کیے جاتے تھے ۔ ان کے فیصلوں کے خلاف صوبائی قاضی اپیل سُنتا تھا اور صوبے کے قاضی کی فیصلوں کے خلاف اپیل قاضی القضاۃ کی عدالت میں پیش کی جا سکتی تھی۔ بادشاہ کو بھی براہ راست مختلف معاملات پر فیصلے کے لیے درخواست دی جا سکتی تھی۔ بادشاہ کا فیصلہ حتمی اور آخری ہوتا تھا۔

دیوانِ انشاء

شاہی خط وکتابت کے محکمے کو دیوانِ انشاء کہا جاتا تھا۔ اس محکمے کے سربراہ کو دبیرِ ممالک یا دبیرِ خاص کہا جاتا تھا۔ فرمانِ شاہی کے متن کو تیار کرنے کے لیے ایک خاص عملہ موجود تھا ۔ کسی بھی فرمان کو جاری کرنے سے پہلے اس کے متن کی منظوری بادشاہ سے حاصل کی جاتی تھی۔ اس محکمے میں شاہی فرامین کا ریکارڈ بھی رکھا جاتا تھا۔

دیوانِ عرض

فوج سے متعلق محکمے کو دیوانِ عرض کہا جاتا تھا۔ اس کے سربراہ کو عارضِ ممالک یا صاحبِ دیوانِ عرض کہا جاتا تھا۔ فوج کی دیکھ بھال، ملازمین کی تنخواہ، سامانِ جنگ کی فراہمی اور تیاری ، فوج کی تربیت ، قلعوں کی تیاری اور فوجیوں کے لیے سامانِ خورد ونوش کا اہتمام کرنا، اس محکمے کے سپرد تھا۔

اس محکمے کے سربراہ کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ شخص فوجی معاملات کو بخوبی سمجھتا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بادشاہ کا فرمانبردار اور وفادار ہو۔ ہر صوبے میں نائبِ عارض مقرر کیے جاتے تھے۔ عارضِ ممالک سال میں کم از کم

ایک بار فوج کا معائنہ ضرور کرتا تھا۔ واضح رہے کہ فوج کا سربراہ یا کمانڈر انچیف بادشاہ خود ہی ہوتا تھا اور اس محکمے کا سربراہ بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا۔

دیوانِ برید

اس محکمے کا کام ملک کے ہر کونے میں ضروری اطلاعات کی ترسیل تھا۔ بادشاہ کی طرف سے ضروری احکام عوام تک اور مختلف علاقوں سے ضروری اطلاعات بادشاہ تک جلد از جلد پہنچانا اس محکمے کے فرائض میں شامل تھا۔ اس محکمے کے سربراہ کو برید ممالک کہا جاتا تھا ۔ ہر صوبے میں بھی ایک نائب برید مقرر کیا جاتا تھا۔

خبر رسانی کے لیے ڈاک چوکیاں قائم کی جاتی تھیں۔ خبر رسانی کے لیے تیز رفتار گھوڑوں یا جہاں گھوڑے نہ جا سکتے ہوں ، وہاں تیز رفتار آدمیوں سے مدد لی جاتی تھی۔ ہر چوکی پر ہر وقت تازہ دم گھوڑے تیار رہتے تھے جو ڈاک کا تھیلہ بڑی تیزی سے اگلی ڈاک چوکی تک پہنچا دیتے تھے۔ دہلی سے بنگال تک ڈاک تین دن میں پہنچ جاتی تھی۔ بعض اوقات بڑے بڑے قصبوں کے وسط میں بڑے بڑے ڈھول رکھ دیے جاتے تھے۔ خطرے کی صورت میں ایک خاص تھاپ بجا کر دور دور تک بسنے والے لوگوں کو اس کی اطلاع دی جاتی تھی۔

اس محکمے کے ملازمین کی تنخواہ عام محکموں کے ملازمین کے مقابلے میں بہتر ہوتی تھی۔

سلطنتِ دہلی کے دَور میں صوبائی انتظامی ڈھانچہ

سلاطینِ دہلی کے دورِ حکومت میں پوری سلطنت کو کئی صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ صوبے کے سربراہ کو حاکم کہا جاتا تھا۔ صوبوں کو انتظامی ضرورت کے تحت مزید کئی حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ وہ یہ تھے۔

1- شق : صوبے کے بعد علاقوں کو "شق" میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس کا افسرِ اعلیٰ، شقدار کہلاتا تھا۔

2- پرگنہ : ایک شق میں کئی پرگنے ہوتے تھے۔ پرگنے کی سطح پر مالی اور انتظامی معاملات کی ذمے داری خوط، مقدم یا چودھری کے سپرد ہوتی تھی۔

3- دیہہ : صوبے کی انتظامی طور پر سب سے چھوٹی اکائی دیہہ یا گاؤں کہلاتی تھی۔ ایک پرگنے میں سو گاؤں ہوتے تھے۔ اس کے انتظام کے لیے پٹواری، سفید پوش اور چوکیدار مقرر کیے جاتے تھے۔

صوبے کے منتظم اعلیٰ، حاکم، والی یا گورنر اپنے اختیارات کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جن کے پاس لامحدود اختیارات ہوتے تھے۔ یہ گورنر زیادہ تر مرکز سے دُور علاقوں میں مقرر کیے جاتے تھے۔ مرکز سے دُوری کے باعث بادشاہ سے ہدایات لینے میں کافی وقت درکار ہوتا تھا۔ بعض اوقات انتظامی طور پر فوری فیصلے کرنا مقصود ہوتے تھے۔ اس لیے ان علاقوں کے گورنروں کو لامحدود اختیارات دے دیے جاتے تھے تاکہ انتظامی معاملات میں رخنہ اندازی نہ ہو۔ لامحدود اختیارات والے گورنروں کو عدالتی، جاسوسی اور خبر رسانی کے محکموں پر کوئی اختیار نہ ہوتا تھا۔ محدود اختیارات والے گورنر عموماً مرکز کے قریب صوبوں میں مقرر کیے جاتے تھے۔

صوبے کے سربراہ کی حیثیت سے گورنر کے عہدے کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس عہدے پر عموماً شہزادوں اور قابل اعتماد امرا کو مقرر کیا جاتا تھا۔ ان کو بڑی بڑی تنخواہوں کے علاوہ بے شمار مراعات حاصل ہوتی تھیں۔ فیروز تغلق کے دَور میں گورنروں کو 8 لاکھ ٹنکے سالانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ نقد تنخواہ کے علاوہ جاگیریں بھی دی جاتی تھیں تاکہ یہ لوگ اپنے اخراجات بخوبی پورے کر سکیں۔

بلبن سے پہلے، صوبائی گورنر اپنے اختیارات اور سرگرمیوں کے لحاظ سے خود مختار حیثیت رکھتے تھے۔ بلبن اور علاؤالدین خلجی نے صوبائی گورنروں کے اختیارات اور حیثیت کو کم تر کرنے کی سعی کی مگر تغلق دَور میں یہ حیثیت بحال کر دی گئی۔

صوبائی گورنروں اور صوبائی انتظام کے بارے میں ہم عصر ماخذوں سے بہت کم مواد ملتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر صوبائی گورنر، بادشاہ کے مفادات کی اپنے اپنے علاقے میں حفاظت کرتے تھے۔ ان میں فوجی اور مالی معاملات سرفہرست تھے۔ امن و امان کو بھی خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

10

ہندوستان میں سلاطینِ دہلی کے دورِ حکومت میں معاشرتی اور ثقافتی حالات

مسلم حکومت کے قیام سے قبل ہندوستانی معاشرہ مجموعی طور پر ایک جاگیرداری نظام کے تابع تھا۔ محدود افراد پر مشتمل ایک حکمران طبقہ یا گروہ تمام تر طاقت اور اختیارات کا مالک تھا۔ یہ آبادی میں ایک مختصر گروہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے مقابلے میں آبادی کا اکثریتی گروہ، اس چھوٹے گروہ کا غلام اور کارکن تھا۔ حکمران طبقے نے اپنے حکومتی انداز کو مؤثر بنانے اور اپنی حکومت کو طوالت دینے کے لیے ایک معاشرتی ڈھانچہ بھی استوار کر لیا تھا۔ اس معاشرتی ڈھانچے میں آبادی کے اکثریتی گروہ کو اس کی شناخت اس طرح کروائی جاتی تھی کہ اُس میں اپنے ماحول کے بہتر طور پر سمجھنے اور اپنی انسانی آزادی کا شعور پیدا نہ ہو۔ معاشی طور پر وہ پہلے ہی اقلیتی حکمران طبقے کا دستِ نگر تھا۔

مسلم حکومت کے قیام سے قبل معاشرے میں شناخت کا بنیادی معیار، پیشہ تھا۔ پیشوں کو اعلیٰ یا کمتر حیثیت میں تقسیم کیا گیا تھا۔ جو پیشے حکومتی طبقے سے متعلق تھے وہ اعلیٰ سمجھے جاتے تھے اور بقایا کو کم تر گردانا جاتا تھا۔ اعلیٰ پیشوں میں مذہبی اور سیاسی اُمور بھی شامل تھے۔ تمام پیداواری پیشوں کو کم تر سمجھا جاتا تھا۔

اُس وقت اکثریتی آبادی کے زندہ رہنے کے لیے تگ و دو صرف ایک معمولی لباس اور ایک وقت کی روٹی تک محدود تھی۔ جو شخص یہ دونوں چیزیں حاصل کر لیتا تھا، وہ اپنے آپ کو کامیاب ترین فرد سمجھتا تھا۔ ان دو چیزوں کے عوض عام آدمی اپنے علاقے کے بااثر لوگوں کے لیے دِن رات محنت کرتا اور اس کی حیثیت ایک غلام سے زیادہ نہ تھی۔

عام لوگوں کے برعکس حکومتی طبقہ اپنے زمانے کے معیار کے مطابق ایک شاہانہ زندگی گزارتا تھا۔ اس طبقے کی تمام تر ضروریات کا انحصار عام لوگوں کی محنت اور پیداواری صلاحیت پر تھا۔ یہ لوگ ذاتی طور پر صرف عیّاشی کرتے تھے۔ کسی قسم کی بھی ملکیت کا حقدار صرف حکومتی طبقے کو ہی سمجھا جاتا تھا۔ عام لوگ کسی قسم کی ملکیت کے حقدار نہ سمجھے جاتے تھے، اِن لوگوں کا کام صرف مزدوری کرنا تھا۔

حکومتی گروہ اور آبادی کی اکثریت کے درمیان مندرجہ بالا تعلق کی بنیاد پر تمام تر معاشرتی اداروں میں منفی رجحانات غالب تھے۔ اس سے انفرادی طور پر لوگ پِس رہے تھے اور مجموعی طور پر معاشرے میں اجتماعی سکت اور عمل تخلیقی رجحان کم ہو رہے تھے۔

ہندوستان میں جن مسلمان حکمرانوں نے حکومت کی، ان کا تعلق وسط ایشیا (ترکستان) سے تھا۔ اُس زمانے میں اس علاقے میں ایرانی اندازِ معاشرت کو تہذیب و ثقافت کا اعلیٰ ترین معیار سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقے کے لوگ ایرانی ادب، زبان، لباس اور عام رہن سہن کے طریقوں کو اپنانا مہذب ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔ بالفاظ دیگر ایرانی اندازِ تہذیب و ثقافت، وسط ایشیا سے آنے والے حکمران طبقے کا آئیڈیل تھا۔

وسط ایشیا سے آکر ہندوستان پر حکومت کرنے والے حکمرانوں نے ثقافتی سطح پر مقامی انداز کو بہت حد تک متاثر کیا۔ انھوں نے جن فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی ان پر ایرانی اور ترکی انداز کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ فنی اثر کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کی زندگی پر بھی اس کے بہت سے اثرات نمایاں تھے۔

مقامی اکثریتی آبادی، اپنے مروّجہ اندازِ زندگی سے ناخوش تھے۔ مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد مقامی لوگ مسلمان ہونے لگے ۔ اس طرح حکومتی طبقے کے مذہب کو قبول کرنے سے ان کی شناخت حکومتی طبقے سے کی جانے لگی۔ دوسری طرف ہندوؤں کے مذہبی اثر کے تحت جو معاشرہ بنا تھا اس میں انسانی توقیر کے معیار حد درجہ غیر انسانی تھے۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کے تحت پیدا ہونے والا معاشرتی ڈھانچہ انسانوں کو

عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس طرح پیدا ہونے والی نئی صورتحال میں مقامی لوگوں نے اسلام قبول کر کے اپنی زندگیوں میں بہتری لانے کو ہی بہتر جانا۔ عام لوگوں میں اسلام کے انسانی عظمت اور معاشرتی مساوات کے پیغام کو پھیلانے میں بنیادی کردار علماء و مشائخ اور صوفیا کرامؒ نے ادا کیا۔

بادشاہوں نے حکومتی سطح پر مختلف معاشرتی اور ثقافتی اداروں میں جو خدمات انجام دیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ان اداروں میں سے چند ایک کا جائزہ یہاں لیا جاتا ہے۔

تعلیم

ہر نسل، اپنی آنے والی نسل کو، اپنے تجربات اور علم و فن منتقل کرتی ہے تاکہ آنے والی نسل اپنی زندگیوں کو ان کی بنیاد پر بہتر طور پر سمجھ سکے، اس میں ترقی اور اضافے کر کے اپنی زندگیوں کو مزید بہتر بنا سکے۔ تعلیم کے بنیادی عناصر دو ہیں۔

1- معاشرے کا ہر فرد زندگی کے بارے میں بہتر شعور حاصل کر سکے۔ اسی شعور کی بنیاد پر وہ اپنے لیے اور اپنے آردگرد بسنے والے لوگوں کے لیے بہتری پیدا کر سکتا ہے۔

2- پیشہ ورانہ یا دوسرے علوم و فنون سیکھ کر نہ صرف اپنے لیے روزگار کا اہتمام کر سکے، بلکہ اپنی علمی اہلیّت سے معاشرے میں بہتر کارکن کے طور پر اپنی خدمات پیش کر سکے۔

ہندوستان میں آنے والے مسلم حکمران تعلیم کے ایک قابلِ قدر ورثے کے حامل تھے۔ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم کو ایک اہم فریضے کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف حکومتیں ابتدائی تعلیم کے لیے مکتب اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسے قائم کرتی تھیں۔

مخصوص علوم و فنون کے لیے خاص مدرسے قائم کیے جاتے تھے۔ ان علوم میں طب، ریاضی اور فلکیات وغیرہ شامل تھے۔ ان اداروں کو مقامی حکمرانوں اور امرأ کی

سرپرستی حاصل ہوتی تھی۔ ان اداروں سے حکومتی مشینری کے لیے قاضی، مفتی، اہلکار اور پیشہ ور ماہرین تیار کیے جاتے تھے۔

محمود غزنوی نے غزنی میں ایک بہت بڑے مدرسے کو قائم کیا۔ اس مدرسے میں ایران اور وسطِ ایشیا کے دوسرے علاقوں سے لوگ آکر علم حاصل کرتے تھے۔ البیرونی، فردوسی اور دوسرے اہم علمائے کرام اس مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ اس مدرسے کے ساتھ منسلکہ لائبریری میں بہت سی نادر کتب کو جمع کیا گیا تھا۔

جب غزنی کے آخری حکمرانوں نے اپنا دارالحکومت غزنی سے لاہور منتقل کیا تو ان کے ساتھ غزنی کی علمی روایت بھی لاہور منتقل ہو گئی۔ بارہویں صدی عیسوی میں لاہور مسلمانوں کا ایک اہم علمی مرکز تھا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے سلطنت دہلی کی حکومت کی بنیاد رکھنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کے سامنے بے شمار سیاسی اور فوجی مسائل حل طلب تھے اور ان کے لیے وہ ہر دم سرگرم عمل رہتا تھا۔ ان مصروفیت کے باوجود محمد غوری نے اشاعتِ تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اجمیر میں اُس نے کئی مدرسے کھولے۔

محمد غوری نے اپنے غلاموں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ ان کو اسلوبِ حکومت سکھائے تاکہ یہ اس کے لیے بہتر اہلکارِ حکومت ثابت ہو سکیں۔

قطب الدین ایبک نے اپنی سیاسی مصروفیتوں کے باعث تعلیم کی ترویج کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ تاہم اس کے ایک نائب بختیار خلجی نے بہت سے مدرسے کھلوائے۔

التتمش نے ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کروایا تھا جو عدم توجہی کی وجہ سے کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔ فیروز شاہ تغلق نے اسکو دوبارہ مرمت کروایا۔ التتمش نے اپنے بیٹے محمود اور بیٹی رضیہ سلطانہ کو خصوصی تعلیم دلوائی۔

رضیہ سلطانہ نے دہلی میں ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کروایا تھا۔ اس کو مدرسۂ معزیہ کہا جاتا تھا۔ علاؤالدین خلجی کے علاوہ دوسرے حکمرانوں نے تعلیم کی ترویج کے لیے

مدرسے کھلوائے۔ فیروزشاہ تغلق نے مدرسوں کی تعمیر کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اس کے دَور میں تعمیر کیے جانے والے مدرسوں کی تعداد تیس بتائی جاتی ہے۔ ان مدارس میں دینی و دنیاوی تعلیم کا یکساں انتظام موجود تھا۔ کامیاب طلبہ کو وظائف بھی دیے جاتے تھے۔

اُس دَور میں کتابیں خرید کر پڑھنا بہت مہنگا کام تھا اور کتاب ہر کوئی حاصل بھی نہ کر سکتا تھا۔ اُس دَور میں پریس وغیرہ تو نہیں ہوتے تھے، کتابوں کو ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ ہاتھ سے لکھ کر ہی کتب کی نقول تیار کی جاتی تھیں اور ان کو مختلف کتب خانوں میں بھجوا دیا جاتا تھا۔ مختلف مدارس میں قلمی کتب رکھی جاتی تھیں تاکہ علماء اور طلبہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ہر مدرسے میں مختلف مضامین پڑھانے کے لیے ایک طے شدہ نصاب پر عمل کیا جاتا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد طلبہ کو سرٹیفیکیٹ جاری کیا جاتا تھا۔ اسے 'اجازہ' کہا جاتا تھا۔ اس سرٹیفیکیٹ پر یہ درج ہوتا تھا کہ فلاں طالب علم نے اس مدرسے میں اتنے سال قیام کیا اور فلاں فلاں مضامین پڑھے اور ان پر عبور حاصل کیا۔

ہر مدرسے کے ساتھ ایک رہائش گاہ بھی ہوتی تھی۔ جہاں دور دراز سے آنے والے طالب علموں کے طعام و رہائش کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ دورانِ تعلیم کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ ان مدارس کے اخراجات امرأ یا حکومت برداشت کرتی تھی۔

امرأ اور امیر طبقہ کے لوگ اپنی لڑکیوں کو تعلیم و تربیت کا اہتمام گھر پر ہی کیا کرتے اور اس کے لیے اتالیق مقرر کیے جاتے تھے۔ عام طور پر لوگوں میں تعلیم حاصل کرنے کا رواج نہ تھا۔ محض روزی کمانے کے لیے معمولی پیشہ ورانہ تربیت کو ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر خواتین کی تعلیم و تربیت گھر پر ہی کی جاتی تھی۔ اس میں گھریلو انتظام اور سلائی کڑھائی وغیرہ شامل ہوتی تھی ۔ پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت میں لکڑی ، لوہے اور زراعت کا کام شامل تھا۔ یہ فنون عموماً باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتے رہتے تھے۔ بصورت دیگر کسی ماہر فن کی شاگردی اختیار کر کے یہ فنون سیکھے جاتے تھے۔

موسیقی

موسیقی کا تعلق آواز سے ہے۔ اگر ایک یا ایک سے زیادہ آوازوں میں توازن اور آہنگ پیدا ہو جائے تو یہ دِل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں ——— یہی موسیقی ہے۔

موسیقی کا تعلق انسان کے نہایت نازک جذبات اور محسوسات سے ہوتا ہے۔ موسیقی کے مختلف انداز، انسان پر مختلف کیفیات وارد کرتے ہیں۔ ایک دُھن سن کر انسان پر خوف طاری ہو جاتا ہے تو دوسری دُھن سے اُداسی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دُھن دِل میں ولولہ پیدا کرتی ہے تو دوسری دل میں پیار جگا دیتی ہے۔

موسیقی، انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اس سے وابستہ رہی ہے۔ موسیقی انسانی فطرت کا ہی ایک حصّہ ہے اس لیے ابتدائے تخلیق سے ہی انسان نے تاریخ کے ہر دور اور انسانی رہن سہن کے ہر پہلو میں اس کو کسی نہ کسی انداز میں اپنے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ خوشی کا موقع ہو یا غم کا، اداسی کے لمحات ہوں یا تلخی کے، ہر لمحے اور ہر وقت کے انسان پر اثر کو موسیقی کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے میں، جہاں کتنا ہی مختصر گروہ آباد ہو، ان کی اپنی موسیقی اور اندازِ موسیقی نظر آتا ہے۔ اسے لوک موسیقی کہا جاتا ہے۔

لوک موسیقی میں کسی بھی گروہ کی معاشرت، اس کے ورثے، اس کے روزگار کے ذرائع اور سب سے بڑھ کر ماحول کا اثر واضح طور پر جھلکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سمندر کے کنارے رہنے والے گروہوں کی موسیقی اور پہاڑوں پر رہنے والوں کی موسیقی میں فرق صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لوک موسیقی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی ہے اور ہر نسل غیر محسوس طور پر اس میں اضافہ یا ترمیم کر دیتی ہے۔ لوک موسیقی کے اصلی خالق کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔

ہندوستان میں قدیم زمانے سے لوک موسیقی کے بے شمار انداز چلے آ رہے تھے۔ جب آریا ہندوستان میں آئے تو ان میں سے چند اہلِ فن نے مروّجہ لوک موسیقی کو نہایت گہرائی سے سمجھنے کے بعد، ایک مربوط علم موسیقی کی بنیاد رکھی۔ اس کو "کلاسیکی موسیقی یا شاستریہ سنگیت" کہا جاتا ہے۔ اس علم موسیقی کے بنیادی رموز، انداز

اور طریق کار کو طے کر دیا گیا۔ چونکہ آریاؤں کا تعلق حکومتی طبقے سے تھا ، اس لیے کلاسیکی موسیقی حکومتی سرپرستی میں چلی گئی اور لوک موسیقی اپنے قدرتی انداز میں عام لوگوں میں نہ صرف مقبول رہی بلکہ اس کا ارتقا اپنے طور پر جاری و ساری رہا۔

کلاسیکی موسیقی کو ابتداء میں، آریا اپنے نئے مذہب ہندومت کی رسوم کی بجاآوری میں استعمال کرتے تھے ۔ ہندومت میں گیت اور بھجن گانا مذہبی فرائض کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ مندروں میں اس کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ دوسرے مذہبی علوم کی طرح موسیقی کا سیکھنا اور اس کا گانا بجانا بھی ایک مخصوص مذہبی طبقے تک ہی محدود تھا۔

مسلمان حکمرانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ساتھ، وسط ایشیا اور ایران کی موسیقی کی روایت بھی ہندوستان چلی آئی۔ حکومتی طبقے کے امرأ ، راجا اور بادشاہ اپنے درباروں میں موسیقی کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے موسیقی کے اہل فن اپنے طور پر نئے نئے تجربات بھی کیا کرتے تھے۔ حکمران طبقے کے لوگ ان اہل فن کی سرپرستی مالی طور پر کیا کرتے تھے۔ اہلِ فن نے سلاطین دہلی کے دَور میں بے شمار تجربات کر کے موسیقی میں کئی نئے انداز اور آہنگ ایجاد کیے۔ اس ضمن میں کلاسیکی موسیقی (مندروں کی موسیقی)، لوک موسیقی اور مسلمان حکمرانوں کے ساتھ آئی ایرانی اور ترکستانی موسیقی سے مدد لی جاتی تھی۔ انہی روایات کے امتزاج سے موسیقی میں نئے رجحانات استوار کیے گئے اور نئے نئے ساز بھی ایجاد ہوئے۔

سلاطین دہلی میں بلبن ، خلجی اور محمد تغلق خاص طور پر موسیقی سے لگاؤ رکھتے تھے۔ بلبن موسیقی کا شوقین تھا اور موسیقی کو سمجھنے میں اس کو خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ اُس نے خود بھی ایرانی اور مقامی موسیقی کے امتزاج سے نئی دھنیں ترتیب دیں۔ اس کا بیٹا بغراخان موسیقی کا نہ صرف شوقین تھا بلکہ اُس نے موسیقاروں، سازندوں اور رقاصاؤں کی سرپرستی کے لیے ایک انجمن بنا رکھی تھی۔ اس انجمن کی عمارت محل کے ساتھ متصّل تھی۔ اس کی پیروی میں دوسرے امرأ نے بھی اس قسم کی انجمنیں بنا لیں۔

خلجی دورِ حکومت میں موسیقی کی ترویج و اشاعت میں خاص طور پر اضافہ ہوا۔ اس

کی واحد وجہ امیر خسرو جیسے ذہین موسیقار کا ہونا تھا۔ امیر خسرو نہ صرف بہت بڑے شاعر تھے، انہوں نے موسیقی کی روایت میں نئے انداز اور دھنوں کا اضافہ کیا۔ ان کو علم موسیقی پر نہ صرف دسترس حاصل تھی بلکہ گائکی میں بھی کوئی شخص ان کے مقابل ٹھہر نہ سکتا تھا۔

امیر خسرو نے ایرانی اور ہندوستانی مذہبی اور لوک موسیقی کو ہم آہنگ کرکے نئے انداز استوار کرنے کی کوشش کی۔ اس میں انھیں خاصی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ انہوں نے موسیقی کے کئی انداز (راگ) ایجاد کیے۔ موسیقی کی اصطلاح میں راگ سُروں کے ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جن کے گانے سے ایک مخصوص کیفیت جھلکتی ہو یا سننے والا ان کو ایک مربوط احساس کی صورت میں محسوس کرے۔ مثال کے طور پر راگ میگھ میں برسات کے موسم کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، راگ درباری میں شان، تجمل اور رُعب کی کیفیت ابھرتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

امیر خسرو نے ایرانی اور مقامی انداز موسیقی کو باہم ملا کر کئی راگ بنائے، ان میں ایمن، زیلف اور سازگری وغیرہ مشہور ہیں۔ امیر خسرو نے آلات موسیقی میں بہتری کے لیے کئی اختراعات کیں۔ انہوں نے ترکستان کے ایک ساز کو ہندوستان کے ایک ساز وینا سے ملا کر ایک نیا ساز بنایا، جسے 'ستار' کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رباب اور عود کے سازوں میں تبدیلی بھی کی گئی۔ ایک روایت کے مطابق امیر خسرو نے ہی مقامی ساز پکھاوج کو دو حصّوں میں تقسیم کرکے طبلہ ایجاد کیا۔

امیر خسرو کے کمالات میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے مقامی مذہبی موسیقی میں جہاں نئے اسلوب کا اضافہ کیا وہاں اس کے مذہبی اور ماورائی انداز کو بھی بدل ڈالا۔ کلاسیکی موسیقی کو غیرمرئی یا انسانوں سے دُور رکھنے کی بجائے اسے لوگوں کے احساسات اور جذبات کے قریب تر کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں لوک موسیقی سے مدد لی گئی۔ کلاسیکی موسیقی کو لوگوں کے قریب تر لانے کے لیے امیر خسرو نے ٹھمری، ٹپہ، اور خیال گانے کے نئے اسلوب اور اصناف ایجاد کیں۔ یہ آج بھی مخصوص لوگوں میں مقبول ہیں۔ عام لوگوں میں کلاسیکی موسیقی کی مقبولیت کم ہونے کے باعث کلاسیکی موسیقی کی

طبلہ

سرود۔
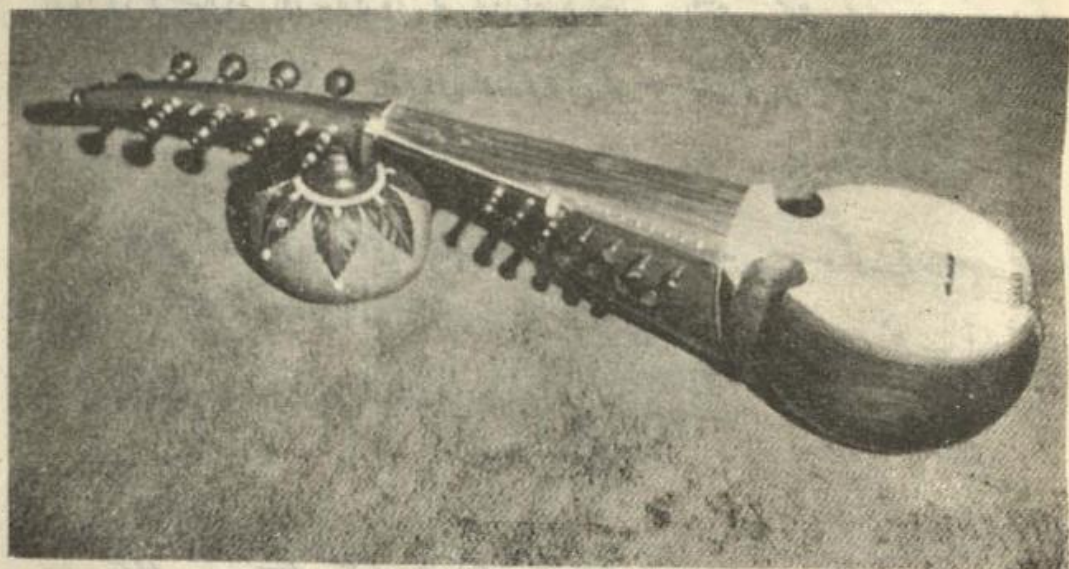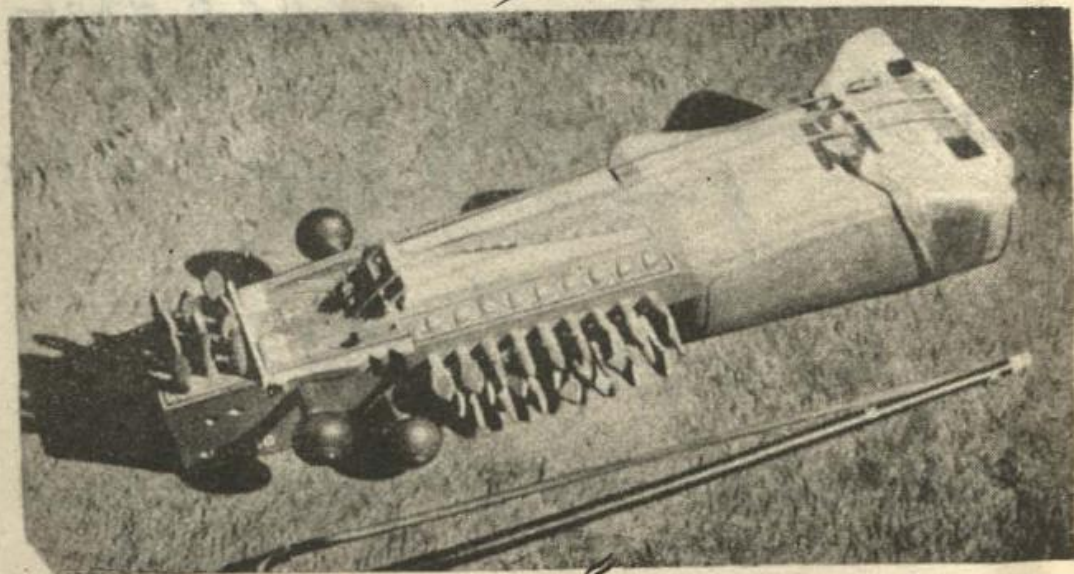
سارنگی

یہ اصناف زیادہ مقبول نہیں رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلاسیکی موسیقی کو وقت اور لوگوں کے مزاج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلا نہیں گیا جس سے اس کے ارتقاء میں جمود آگیا ہے۔ یہی وجہ ہے یہ عام لوگوں کے مزاج سے دُور ہوگئی ہے۔

سلاطین دہلی کے دور حکومت میں کچھ عرصے کے لیے جونپور میں ایک خودمختار ریاست قائم ہوگئی تھی۔ یہاں کا راجا سلطان حسین شرقی موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا۔ اُس نے موسیقی میں جدّت پسندی کو فروغ دیا۔ اُس نے کئی ایک مستعمل راگوں کو ملا کر نئے راگ بنائے۔ ان میں حسینی کانڑہ، جونپوری اور کئی دوسرے شامل ہیں۔

سلاطین دہلی کے دور میں بادشاہوں کے ساتھ ساتھ، راجا اور امرأ اپنے درباروں میں اعلیٰ موسیقاروں اور سازندوں کو رکھنا باعث عزت و افتخار سمجھتے تھے۔ بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے اکثر اعلیٰ موسیقاروں اور گویّوں کو بطورِ تحفہ ان کے دربار میں پیش کیا جاتا تھا۔

سلطان محمد تغلق موسیقی کا ماہر تھا۔ اس کے دربار میں بارہ سو گویّے ملازم تھے۔ سلطان محمد تغلق کو اس قدر موسیقی سے شغف تھا کہ اُس نے دہلی میں 'طرب آباد' نام سے ایک الگ شہر آباد کروایا تھا، جہاں صرف موسیقار، گویّے اور سازندے وغیرہ رہائش پذیر تھے۔

فیروز تغلق اپنے مخصوص نظریات کے باوجود گویّوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس کے دربار میں بھی کئی ایک گویّے اور موسیقار ملازم تھے۔

سکندر لودھی کے زمانے میں خاص طور پر موسیقی کے فن کی ترویج ہوئی۔ وہ موسیقی سننے کا بھی بڑا شوقین تھا۔ اُسے شہنائی بہت پسند تھی۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

1- سلاطین دہلی کے عہدِ حکومت میں مرکزی حکومت کے انتظامی ڈھانچے کی تفصیل بیان کریں؟

2- سلاطین دہلی کے انتظام حکومت کے بنیادی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اِس کا تقابل موجودہ دَور کے نظام حکومت سے کریں۔ ان دونوں نظامات میں نقائص اور خصوصیات کا تجزیہ دلائل سے کریں۔

3- سلطنت دہلی کے دور میں صوبائی انتظامی ڈھانچے کے مختلف درجات کی تفصیل بیان کریں۔
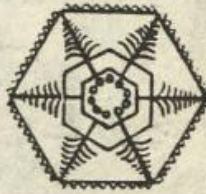
فنِ تعمیر

فن تعمیر کسی بھی معاشرتی گروہ کے مجموعی مزاج کا عکاس ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے کئی ایک عمارتیں تعمیر کیں۔ ان عمارتوں کے فن تعمیر میں وسط ایشیائی ، ایرانی اور ہندوستانی طرز تعمیر کا حسین امتزاج جھلکتا ہے۔ محراب ، گنبد اور مینار تعمیرات کی اہم خصوصیت ہیں ۔ یہ عمارات مقامی طرز تعمیر کے مقابلے میں کشادہ اور وسیع ہیں ۔ ان میں قرآنی آیات مختلف رسم الخط میں لکھی ہوتی ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی تعمیر کردہ عمارتوں کو دیکھنے سے جہاں جاذبیت کا احساس ابھرتا ہے، وہاں دیکھنے والے کو ان عمارات سے شکوہ اور جاہ و جلال بھی جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔

تکنیکی اعتبار سے مسلمان حکمرانوں نے وسطِ ایشیا، ایران اور ہندوستان کے ماہرینِ فن سے مدد حاصل کی۔ ان سب کی تکنیکی مہارتیں سلاطین دہلی کی تعمیر کردہ عمارتوں میں استعمال کی گئیں۔ اس طرح مجموعی طور پر ایک نیا فن وجود میں آیا جسے ان سب مہارتوں کا امتزاج کہا جا سکتا ہے۔

سلاطینِ دہلی کے دَور میں تعمیر ہونے والی چند ایک عمارتوں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مسجد قُوۃ الاسلام

قطب الدین ایبک نے دہلی کی فتح کی یاد میں اس مسجد کو تعمیر کروایا۔ بعدازاں التتمش اور علاؤالدین خلجی نے اس میں توسیع کی۔ یہ مسجد سنگ سرخ سے بنائی گئی ہے۔ التتمش نے اس مسجد کے دالان کے آگے ایک دیوار تعمیر کروائی۔ اس دیوار میں بلند محرابی دروازہ تعمیر کروایا گیا ، یہ دیوار فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

قطب مینار

مسجد قوۃ الاسلام کے متصل قطب مینار تعمیر کروایا گیا ہے۔ قطب الدین ایبک نے اس مینار کی بنیاد رکھی، جسے بعد میں التتمش نے مکمل کروایا۔ اس مینار کی پانچ منزلیں

محراب کی تعمیراتی اقسام
(محراب کی بنیادی اشکال)
سرناتھ ،ساتویں صدی عیسوی
دہلی — 1200ء
اجمیر — 1225ء
مقبرہ غیاث تغلق — 1325ء
جامع مسجد احمد آباد — 1420ء
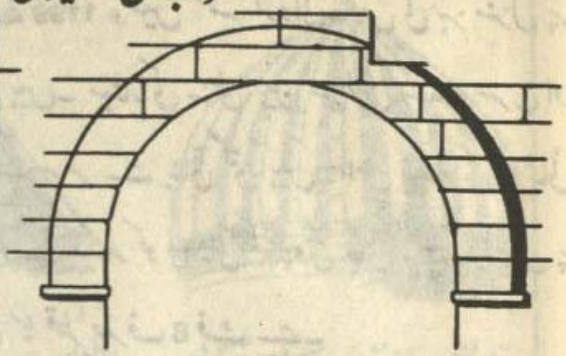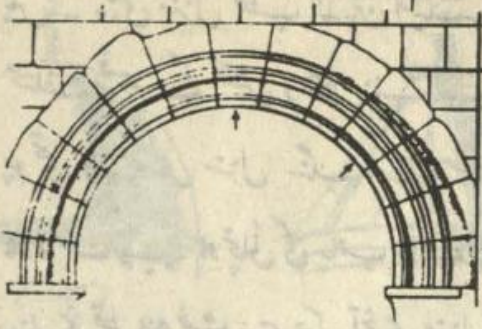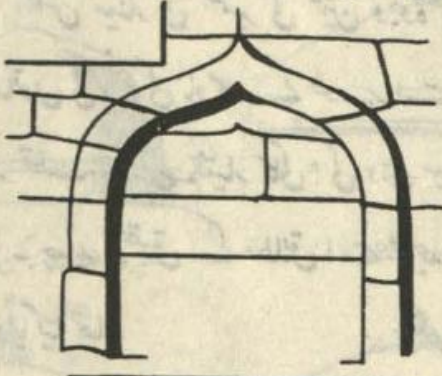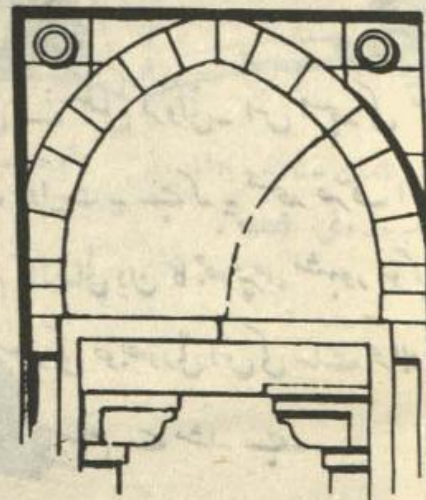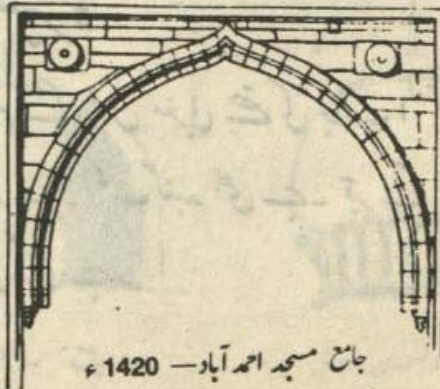
ہیں ۔ پہلی منزل قطب الدین ایبک نے 1199 ء میں تعمیر کروائی۔ اس کی ہر منزل پر مختلف قسم کے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ مینار کی پہلی تین منزلیں سنگ سرخ اور چوتھی و پانچویں منزل سنگِ سرخ و سنگِ مرمر سے بنائی گئی ہیں۔ اس مینار کی اونچائی 234 فٹ ہے۔ اونچائی کی جانب جاتے ہوئے مینار کو موٹائی کم ہوتی جاتی ہے۔ زمین پر مینار کا قطر 48 فٹ ہے جبکہ آخری منزل کا قطر صرف 8 فٹ ہے۔

اس مینار کی تعمیر کی تین وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فتح کی یادگار کے طور پر اسے تعمیر کیا گیا۔ دوم یہ کہ ایک مشہور صوفی بزرگ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی دہلی میں تشریف آوری کی یاد میں اسے تعمیر کروایا گیا ۔ جدید تحقیق کے مطابق اسے مسجد قوۃ الاسلام کے ساتھ اذان دینے کے لیے تعمیر کروایا گیا تھا۔

اڑھائی دِن کا جھونپڑا

یہ ایک مسجد ہے جس کی تعمیر التتمش نے مکمل کروائی۔ اس مسجد کی تعمیر کے بارے میں مختلف روایات مشہور ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ یہ مسجد صرف اڑھائی دِن میں مکمل ہوئی، اسی مناسبت سے اس کا نام "اڑھائی دِن کا جھونپڑا" مشہور ہوگیا ۔ اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس مسجد کی خوبصورتی اس کی سات محرابوں کی وجہ سے ہے۔ اس مسجد کا اندرونی حصہ مسجد قوۃ الاسلام سے مشابہ ہے۔

التتمش کا مقبرہ

مسجد قوۃ الاسلام کے شمال مغربی حِصّے کی جانب التتمش کا مقبرہ ہے۔ یہ سنگ سرخ سے بنا ہے۔ مقبرے پر ایک گنبد بھی ہے۔ قبر کے تعویز اور مقبرے کی دیواروں پر نہایت عمدہ نقاشی کی گئی ہے۔

سیری کا شہر

علاؤالدین خلجی نے 1303 ء میں سیری کا شہر آباد کیا۔ منگولوں کے حملوں سے

گنبد کی تعمیراتی اقسام
مسجد صخرا
بیت المقدس ساتویں صدی عیسوی
اناطولیہ ، بارھویں صدی عیسوی
سمرقند ، چودھویں صدی عیسوی
مقبرہ حضرت رکن الدین عالم
ملتان 1325ء
دہلی — 1231ء
علائی دروازہ — دہلی 1310ء
مقبرہ غیاث الدین تغلق،
دہلی — 1325ء
مقبرہ محمد شاہ (سید خاندان)
دہلی — 1444ء
لودھی خاندان کے ایک بادشاہ
کا مقبرہ ، دہلی — 1440ء
جامع مسجد ، جونپور — 1470ء
جامع مسجد گلبرگہ 1367ء
بیجاپور ، سولہویں صدی
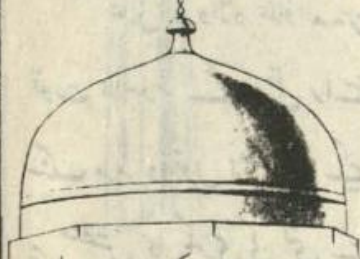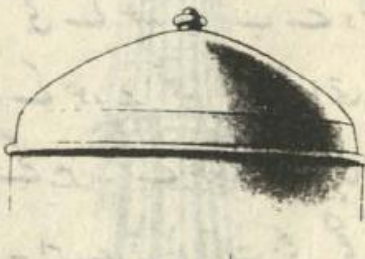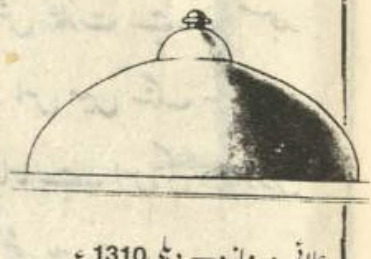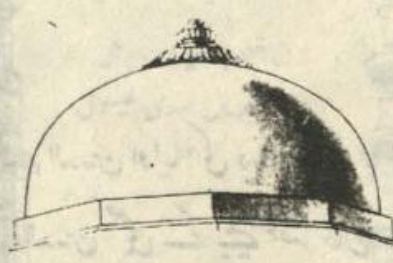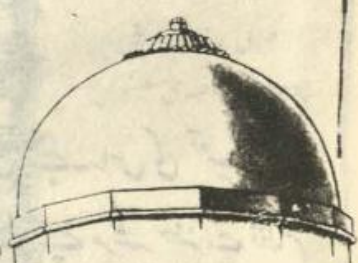
بچنے کے لیے، شہر کے چاروں طرف ایک مضبوط فصیل بنوائی گئی۔ آٹھ ہزار منگولوں کی کھوپڑیاں اینٹوں کی بجائے اس کی دیواروں میں چنیں گئیں ۔ شیر شاہ سُوری نے اس شہر کو تباہ کر دیا تھا۔

علائی دروازہ

علائی دروازہ علاؤالدین خلجی کے عہد کی سب سے دلکش عمارت ہے۔ یہ مسجد قوت الاسلام کے داخلی راستے کے طور پر تعمیر کروایا گیا تھا۔ اس میں سنگ سرخ اور سنگ مرمر دونوں استعمال کیے گئے ہیں۔ اسے علائی دروازہ کہا جاتا ہے۔ اس کی دیواروں پر منقش کاریگری کی گئی ہے ۔ اس پر قرآنی آیات بھی لکھی گئی ہیں۔

جماعت خانہ

یہ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے پاس ہے۔ اس کی تعمیر کے بارے میں روایت ہے کہ علاؤالدین خلجی کے بیٹے خضر خاں نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لیے ایک گنبد بنوایا تاکہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ یہاں دفن ہو سکیں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس کو ناپسند کیا۔ اس پر خضر خاں نے اس گنبد کی دو اطراف میں دو کمروں کا اضافہ کر کے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ یہ سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے۔ جماعت خانے کی داخلی محراب بہت خوبصورت ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس مسجد کے صحن میں دفن ہیں۔

قلعہ تغلق آباد

تغلق دور کی عمارات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں صرف پتھر کے علاوہ چونا اور کنکریٹ کا عام استعمال کیا گیا ہے۔ گنبدوں اور محرابوں کے علاوہ ڈاٹ کی چھتوں کا رواج بھی عام ہو گیا تھا۔

غیاث تغلق نے دہلی سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تغلق آباد کا قلعہ تعمیر کروایا۔ اس قلعے میں شاہی محلّات اور سرکاری عمارات بھی تعمیر کی گئیں۔ قلعے کی فصیل بڑی

مینار کی تعمیراتی اقسام
غزنی
گیارھویں صدی عیسوی
قطب مینار ، دہلی
بارھویں صدی عیسوی
کھڑکی ، مسجد دہلی .
چودھویں صدی عیسوی
فیروز مینار ، گور
پندرھویں صدی عیسوی
شاہ عالم مسجد
(احمد آباد)1450ء
بدار—1472ء
چاند مینار ، دولت آباد—1435ء
جامع مسجد چمپانیر—1509ء

مضبوط بنائی گئی ہے۔ قلعے کی تکمیل 1323ء میں ہوئی۔ شہر اور قلعہ اس طریقے سے بنائے گئے ہیں کہ شہر بھی قلعے کا حصّہ ہی لگتا ہے۔ اسی قلعے کے ساتھ سلطان محمد تغلق نے قلعہ عادل آباد تعمیر کروایا۔ چونکہ محمد تغلق یہاں دربار منعقد کرتا تھا اور وہ اپنے آپ کو سلطانِ عادل کہلوانا پسند کرتا تھا، اسی وجہ سے اس قلعے کا نام عادل آباد پڑ گیا۔

فیروز شاہ تغلق کی عمارات

فیروز شاہ تغلق کو نئے نئے شہر، قلعے اور عمارات بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اُس نے کئی ایک نئے شہر۔ فتح آباد، جونپور اور فیروزپور تعمیر کروائے۔ مسافروں کے لیے سرائیں تعمیر کروائی گئیں، صرف دہلی شہر میں 120 سرائیں بنوائی گئیں۔

فیروز تغلق نے دہلی کے قریب فیروز آباد کا قلعہ تعمیر کروایا۔ قلعے کے اردگرد خندق کھدوائی گئی۔ قلعے کے اندر ایک حوض تھا۔ قلعے کے ساتھ ہی شہر فیروز تھا۔ پانی کی قلت کو دُور کرنے کے لیے، فیروزشہر کے لیے دو نہریں، ایک دریائے جمنا اور دوسری دریائے ستلج سے کھدوائی گئیں تھیں۔

فیروز شاہ تغلق نے دہلی میں آٹھ بڑی مسجدیں تعمیر کروائیں۔ دہلی میں بہت سے مدرسے تعمیر کروائے گئے۔ ان میں مدرسۂ فیروز شاہی خاص طور پر مشہور ہے۔

سیّد خاندان کے دور کی عمارات

سیّد خاندان کے دور میں سلطنت دہلی مستحکم نہ تھی۔ اس خاندان کے اکثر حکمرانوں کا زیادہ تر دور جنگ و جدل میں ہی گزرا۔ خودمختار ریاستوں کے قیام کے باعث ملکی آمدنی بہت کم ہو چکی تھی۔ ان تمام وجوہ کی بنیاد پر تعمیرات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ اس دَور میں ہشت پہلو مقبروں کی تعمیر کا رواج شروع ہوا۔ مبارک شاہ کا مقبرہ بھی ہشت پہلو ہے۔ اس کی تین اطراف، میں محرابیں ہیں۔ مقبرے کے اردگرد برآمدے ہیں۔ ہر برآمدے کے ہر پہلو میں ایک بُرجی نما چھتری ہے۔ قبر کے اوپر
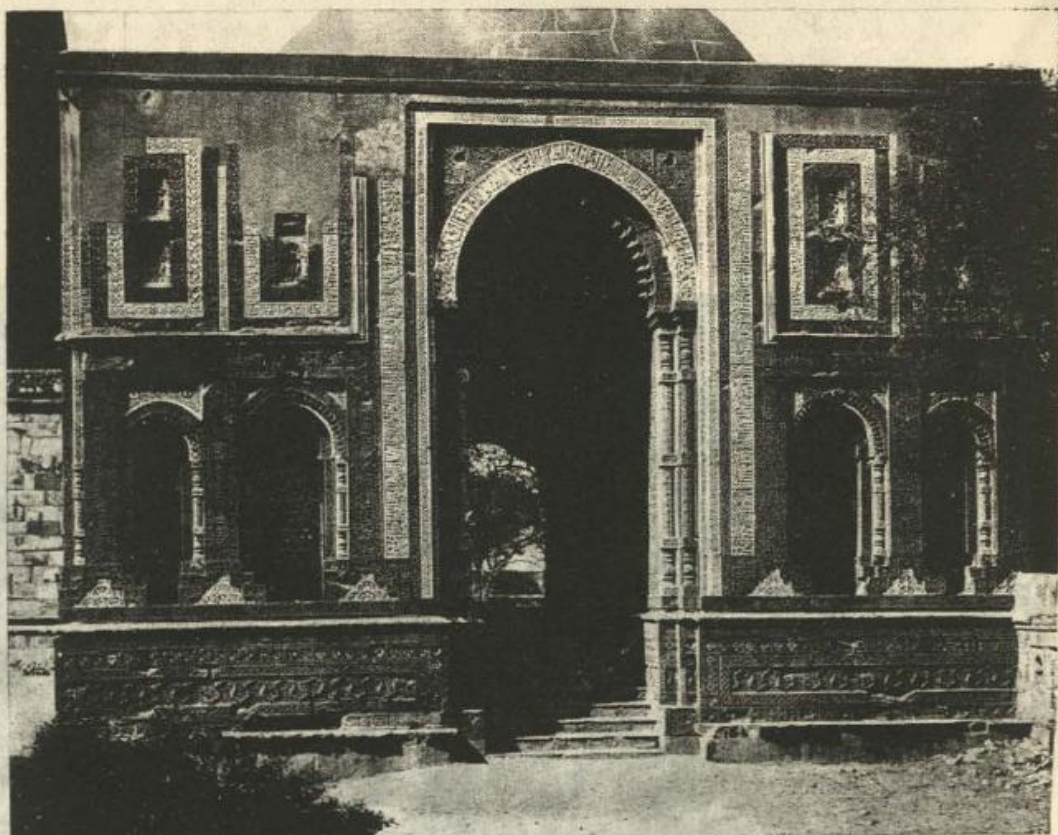
علائی دروازہ دہلی 1305ء
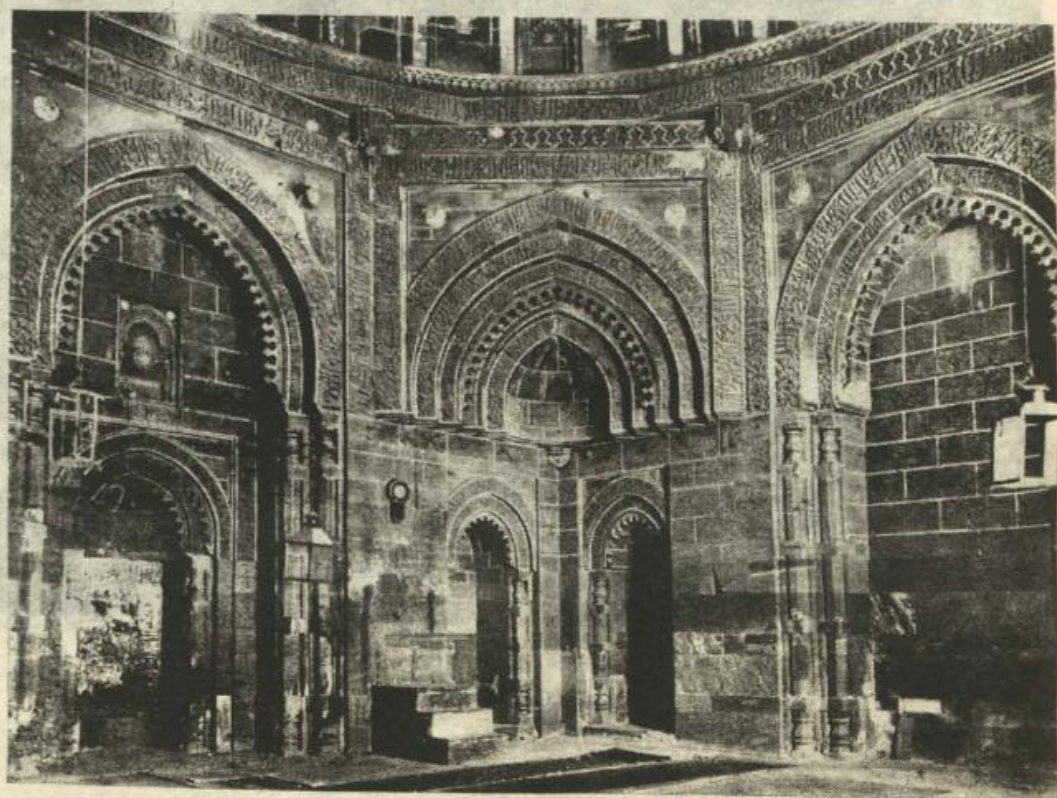
جماعت خانہ مسجد دہلی
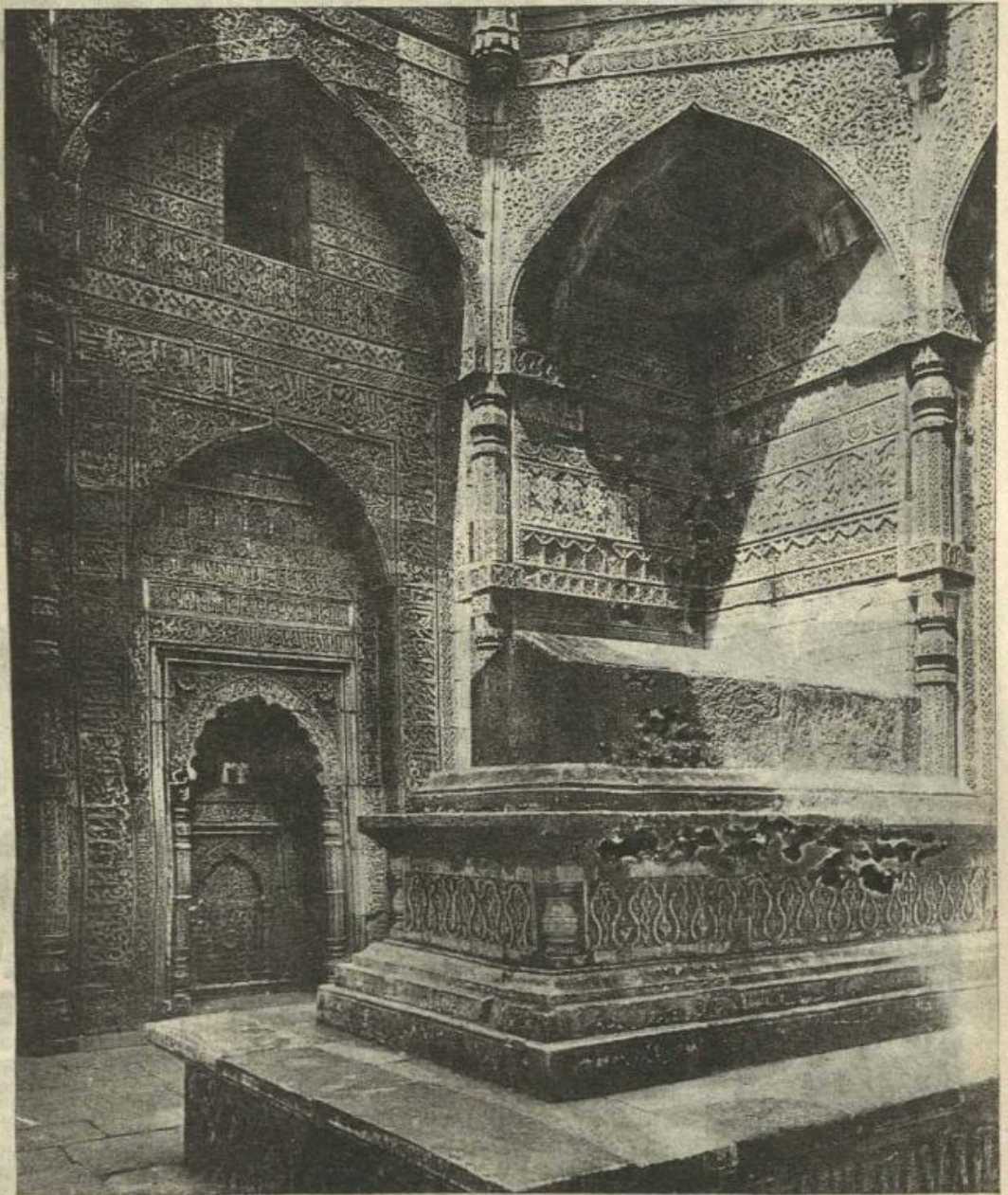
مقبرہ التتمش
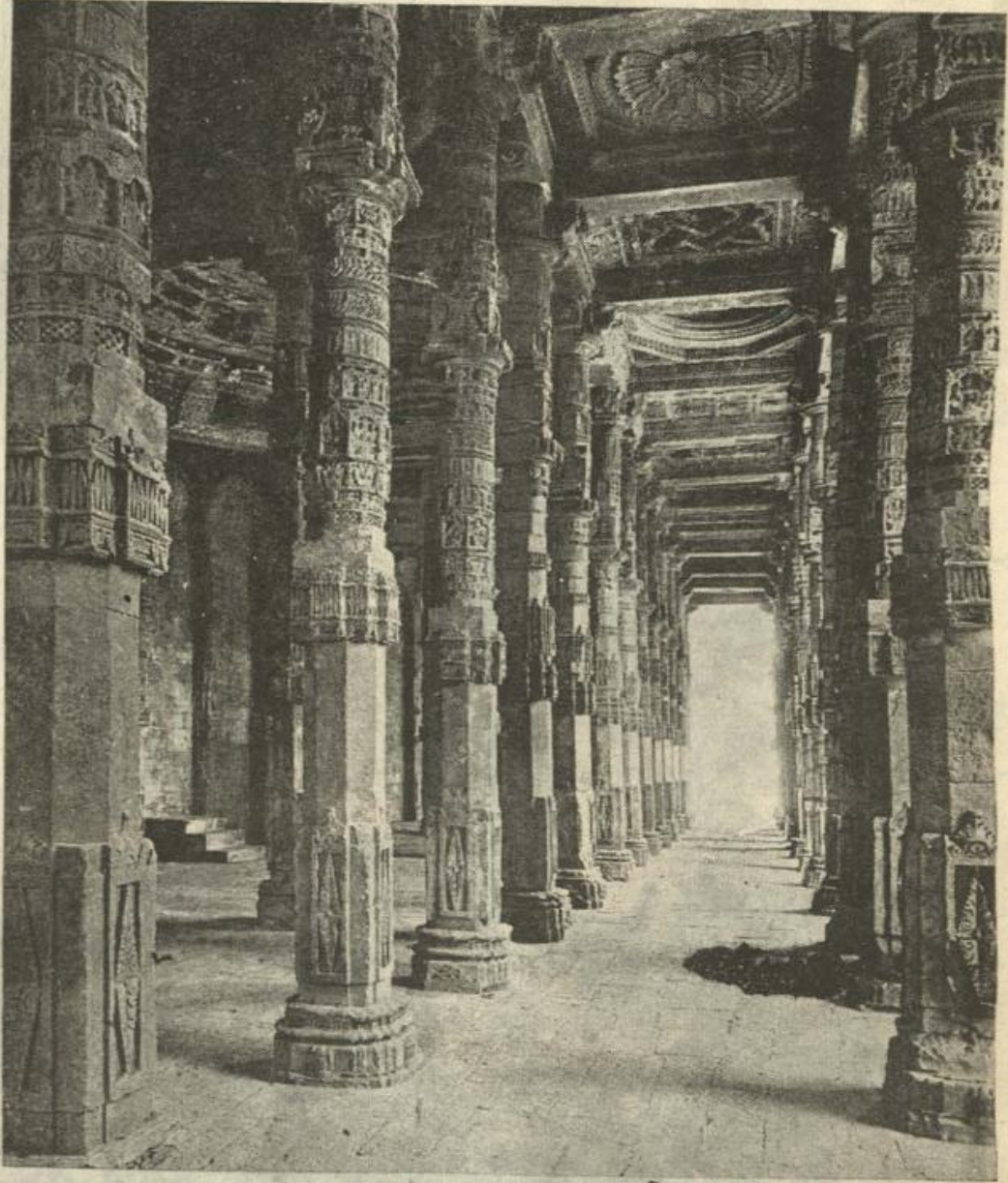
اڑھائی دن کا جھونپڑا
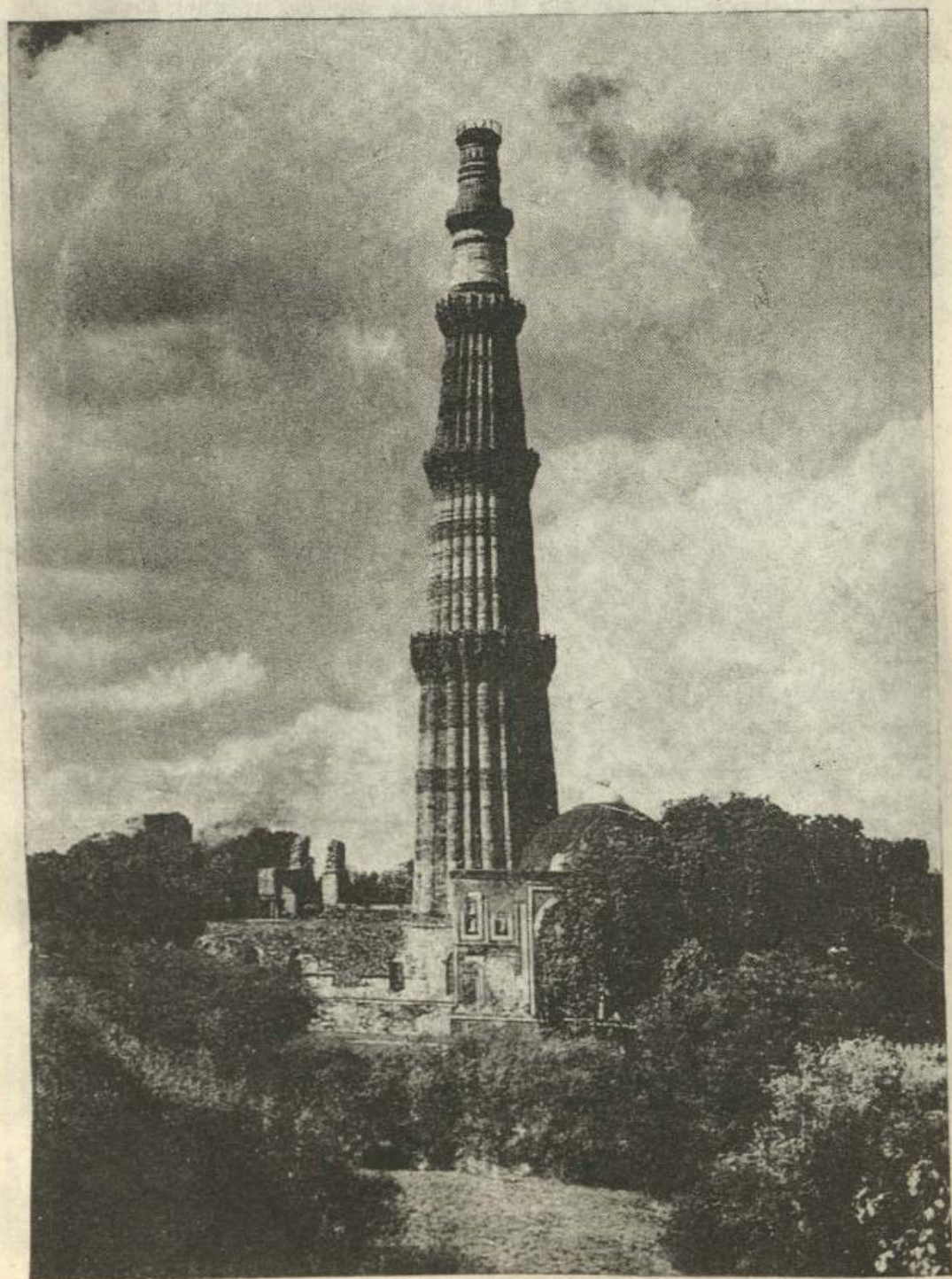
قطب مینار

ایک گنبد ہے، جس کی گولائی کم ہے۔ تاہم اس کے کندھے کافی اونچے، ہیں اس لیے یہ دُور سے ہی نظر آ جاتا ہے۔

لودھی دور کی عمارات

اس خاندان میں سکندر لودھی کو عمارات تعمیر کروانے کا بڑا شوق تھا۔ اُس نے بے شمار مساجد تعمیر کروائیں۔ اُس نے قطب مینار کی مرمت بھی کروائی۔ اس دور میں کئی مقبرے بھی تعمیر کروائے گئے۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

1- سلاطین دہلی کے دُور میں حکومتی سطح پر معاشرتی اور تہذیبی رجحانات کی نوعیت کیا تھی ؛ تجزیہ کریں ۔

2- سلاطینِ دہلی کے دَور میں حکومتی اور عوامی سطح پر معاشرتی اور تہذیبی طور پر جو بُعد پیدا ہو چکا تھا ، اس کی نوعیت اور محرکات کا جائزہ لیں ۔

3- سلاطینِ دہلی کے دور میں تعلیم و تدریس کا کون سا معیار مروَج تھا؟

4- موسیقی کیا ہے ، سلاطینِ دہلی کے دور میں موسیقی میں جو نئے آہنگ پیدا ہوئے ، ان کے محرکات کا جائزہ لیں ۔

5- سلاطینِ دہلی کے دور میں تعمیر کردہ عمارات کی تفصیل بیان کریں !

11

سلاطینِ دہلی کے دَور میں علَماء اور مشائخ

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی حکومت قائم ہونے سے مقامی اندازِ معاشرت میں نہایت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ سیاسی نظام میں ترمیم واضافات کے علاوہ معاشرتی سطح پر بھی لوگوں کے عام رجحانات میں تبدیلیاں ہوئیں ۔ ان معاشرتی تبدیلیوں میں مرکزی کردار مسلمان علماء اور صوفیائے کرامؒ نے ادا کیا ۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستانی معاشرے میں لوگوں کی زندگی خاصی تلخ اور غیر آسودہ تھی ۔ اس تلخی اور غیر آسودگی میں مقامی مذہب نے اہم کردار ادا کیا تھا ۔ انسان کو اسکی مالی اور معاشی حیثیت کے مطابق کم تر یا اعلیٰ تصور کیا جاتا تھا ۔ انسان کی عظمت تو دور کی بات ہے ، عام لوگوں میں مصائب اور غربت کو ان کی قسمت کا لکھا بنا کر پیش کیا جاتا تھا ۔ اس سے لوگوں میں اپنی جائز حیثیت اور مقام کا شعور اور احساس تک ختم ہو گیا تھا ۔

مسلمان حکمران جب ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ، تو بہت سے اہل علم اور دانشور ہندوستان آئے ۔ انحوں نے مقامی لوگوں کی زبان سیکھی اور اسلامی تعلیمات کے مطابق انسانی مساوات اور انسانی عظمت کو ان کے سامنے نہ صرف فکری بلکہ عملی طور پر بھی پیش کیا ۔ مقامی لوگ اپنے نظام سے پہلے ہی ناخوش تھے ، صوفیا کرامؒ اور اہل دانش کے خیالات سے ان میں اپنی حیثیت کے بارے میں ایک شعور پیدا ہوا اور انہوں نے اس تناظر میں اسلام کو قبول کرنا شروع کر دیا ۔

علمی اور ادبی سطح پر بھی سلاطینِ دہلی کے دور میں بہت سی تبدیلیاں رونما

ہوئیں ۔ سلاطینِ دہلی وسط ایشیا اور ایران کی علمی اور ادبی میراث کے نمائندہ تھے ۔ ان کی معرفت ترکستان اور ایران کے اہم علمی اور ادبی رجحانات ہندوستان میں متعارف ہوئے ۔ ان رجحانات نے مقامی روایت پر نہ صرف اپنا اثر واضح طور پر چھوڑا بلکہ یہاں پر انہی اثرات کے زیر سایہ نئے نئے تجربے ہوئے ۔ اس نئے ماحول میں علمی اور ادبی طور پر نئے اسلوب اور نئے آہنگ بھی دریافت ہوئے ۔ سلاطین دہلی کے دَور میں ہندوستان آنے والے چند دانشوروں اور صوفیا کرامؒ کا تذکرہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

1- علّامہ ابوریحان البیرونی

البیرونی ، سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ہندوستان آئے ۔ یہ خوارزم (خیوا) کے قریب ایک گاؤں بیرون میں 973ء میں پیدا ہوئے۔ 1017ء میں البیرونی غزنی آئے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمود غزنوی نے خوارزم کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا ۔ محمود غزنوی ، البیرونی سے کسی وجہ سے ناراض ہوگیا تھا، تاہم محمود غزنوی کے بیٹے مسعود غزنوی نے البیرونی کی سرپرستی کی ۔ البیرونی نے 114 کتابیں تصنیف کیں ۔ ان کا انتقال 1048ء میں ہوا ۔

البیّرونی تاریخ ، ریاضی ، ہئیت ، جغرافیہ ، طبیعات ، کیمیا اور علم معدنیات کے ماہر تھے ۔ وہ عربی ، فارسی ، ترکی ، خوارزمی کے علاوہ عبرانی اور یونانی سے بھی واقفیت رکھتے تھے ۔ سنسکرت سے تو انھوں نے بے شمار کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا ۔

البیرونی نے ہندوستان میں آکر یہاں بسنے والوں کے مذہبی ، معاشرتی اور سیاسی رجحانات کا بغور مطالعہ کیا ۔ اُس وقت کے حالات کے بارے میں ان کی تصنیف کتاب الہند ، ایک اہم مأخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

2- حضرت داتا گنج بخش رح

آپ کا نام علی بن عثمان ہجویری تھا ۔ آپ افغانستان کے شہر غزنی کے محلہ

ہجویر میں 1009ء میں پیدا ہوئے ۔ آپ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے مسعود غزنوی کے عہد حکومت کے آخری دور میں لاہور تشریف لائے ۔ یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر کی اور یہیں درس و تدریس کا کام شروع کر دیا ۔ آپ کی تعلیمات سے متأثر ہو کر بے شمار لوگ مسلمان ہوئے ۔ ان میں لاہور کا ایک ہندو حاکم بھی شامل تھا ۔

آپ نے تصوف پر ایک جامع کتاب 'کشف المحجوب' تصنیف کی ۔ آپ نے 1072ء میں انتقال فرمایا ۔ آپ کا مزار ابراہیم غزنوی نے تعمیر کروایا ۔ مسلمانوں کے علاوہ تمام مذاہب کے لوگ آپ کے اخلاق اور تعلیمات سے متأثر تھے ۔

3- خواجہ معین الدین چشتیؒ

خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان کے بہت بڑے صوفی بزرگ ہیں ۔ آپ سجستان میں پیدا ہوئے ۔ ابھی پندرہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا ۔ آپ کو ابتدائے عمر سے ہی سوچ بچار کرنے کی عادت تھی ۔ آپ نے اپنی ساری جائیداد جو انہیں وراثت میں ملی ، بیچ دی اور خود سمرقند چلے آئے ۔ یہاں آپ نے علم حاصل کیا ۔ اس کے بعد اسلامی ممالک کی سیاحت کی اور اُس دور کے بڑے بڑے صوفیاؒ اور علمأ سے ملاقاتیں کیں ۔ بعد میں لاہور تشریف لائے اور حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر قیام کیا ۔ یہاں سے ملتان آئے اور مقامی زبان سیکھی ۔ دہلی میں کچھ دیر قیام کے بعد اجمیر تشریف لے گئے، اور یہیں پر آپ کا 1235ء میں انتقال ہوا۔

آپ نے مقامی لوگوں کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کروایا اور اپنے کردار سے بھی یہ ثابت کیا کہ اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو تمام انسانوں کو عزت اور برابری کا پیغام دیتا ہے ۔ اس سے متأثر ہو کر ہزاروں لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ۔

4- منہاج سراج جرجانی

منہاج سراج اس دَور کا قابلِ ذکر عالم اور مؤرخ تھا۔ اس کے آبا و اجداد وسطِ ایشیاء سے غزنی آئے۔ اس کے والد کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔ 1227ء میں منہاج سراج نے اُچ میں درس و تدریس سے اپنی عملی زندگی کی ابتدا کی۔ سلطان ناصر الدین

محمود کے دور میں منہاج کی کافی پذیرائی ہوئی اور اس کے بعد بلبن نے بھی اس کو اہم عہدوں پر فائز کیا۔

منہاج سراج نے اپنی کتاب طبقات ناصری 1260ء میں مکمل کی۔ اس وقت اس کی عمر 70 سال کے قریب تھی۔ اس تاریخ میں سلاطینِ غزنہ سے لے کر سلطان ناصر الدین کے زمانے تک کے حالات کا تذکرہ موجود ہے۔

5- حضرت بہاؤالدین زکریاؒ

آپ کی پیدائش 1172ء میں ہوئی۔ آپ خراسان کے رہنے والے تھے۔ علم حاصل کرنے کے بعد آپ ہندوستان تشریف لائے اور ملتان میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہاں بے شمار ہندوؤں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام کو قبول کیا۔

جب آپ ملتان میں آئے، یہاں کا حکمران قباچہ تھا۔ دہلی پر اُس وقت التتمش کی حکومت تھی۔ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ التتمش کو قباچہ کے مقابلے میں ایک بہتر حکمران تصور کرتے تھے۔ آپ نے قباچہ کے خلاف التتمش کی مدد کی، جس سے التتمش کا ملتان پر قبضہ ہوگیا۔ منگولوں کو بھی آپ نے ملتان پر حملہ کرنے سے باز رکھا۔ آپ کا انتقال 1262ء کو ملتان میں ہی ہوا۔

6- حضرت بابا فرید شکر گنجؒ

آپ کے آباؤ اجداد کابل سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے۔ آپ کے دادا ملتان کے قریب ایک جگہ پر قاضی مقرر ہوئے۔ حضرت فرید شکر گنجؒ کی پیدائش اسی مقام پر ہوئی۔ آپ کا اصلی نام مسعود تھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ملتان تشریف لے گئے۔ آپ نے مروجہ علوم سیکھنے کے لیے قندھار کا رُخ کیا۔ یہاں سے لاہور آئے اور بعد میں آپ نے اجودھن (پاک پتن) میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہیں پر آپ کا انتقال 1265ء میں ہوا۔

آپ کے ہاتھوں ہزاروں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ آپ کو بادشاہوں کے دربار اور ان کے طور طریقوں سے سخت نفرت تھی۔ آپ جنگل میں رہتے، سادہ کپڑے پہنتے

اور جنگلی پھلوں پر گزارہ کرتے بلکہ اکثر روزے میں رہتے تھے۔ آپ کے مریدوں نے آپ کی تربیت کے زیر اثر اسلام کے پیغام کو دُور دُور تک پھیلایا۔ پنجاب کی کئی قومیں، سیال، راجپوت اور وٹو آپ ہی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ آپ فارسی کے شاعر بھی تھے۔

7- حضرت لال شہباز قلندرؒ

آپ کا اصلی نام شیخ عثمان تھا۔ آپ تبریز کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ علم حاصل کرنے کے بعد آپ ہندوستان تشریف لائے اور سندھ کے علاقے میں تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا۔ آپ سیوستان (سیہون) میں مقیم رہے۔ آپ کو ہر خاص و عام میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ کے مرشد نے آپ کو شہباز کا خطاب دیا۔ چونکہ آپ سرخ لباس پہنتے تھے، اس لیے آپ کو لال شہباز کہا جاتا ہے۔ آپ کا انتقال 1274ء کو ہوا۔

8- امیر خسرو

امیر خسرو کا پورا نام ابوالحسن یمین الدین اور تخلص خسرو تھا۔ 1253ء میں آگرہ (بھارت) کے علاقے میں پٹیالی نام کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں آپ نے تمام مروجہ علوم و فنون سیکھ لیے۔ اسی زمانے میں آپ نے بلبن کے دربار میں ایک امیر ملک چھجو کے پاس ملازمت اختیار کرلی۔ منگولوں کے حملوں میں ایک دفعہ آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ منگولوں نے آپ سے مزدوری کا کام لینا شروع کردیا۔

امیر خسرو نے بلبن، کیقباد، جلال خلجی، علاؤالدین خلجی، مبارک شاہ خلجی اور غیاث تغلق کے دورِ حکومت دیکھے۔ بادشاہوں کے ساتھ ان کے قریبی مراسم بھی تھے۔ آپ کا انتقال 1324ء کو ہوا۔

امیر خسرو ماہر موسیقی اور شاعر تھے۔ موسیقی میں انھوں نے کئی ایک نئی دھنیں، راگ اور ساز ایجاد کیے۔ وہ فارسی کے بہت بڑے شاعر بھی تھے۔

9- شیخ نظام الدین اولیاءؒ

آپ بابا فرید شکر گنجؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ کے دادا منگولوں کی تباہ کاریوں کے ہاتھوں اپنا وطن بخارا ترک کرکے لاہور چلے آئے۔ آپ کی پیدائش بدایوں (بھارت) میں 1238ء کو ہوئی۔ آپ کا نام سید محمد ہے۔ پانچ سال کی عمر میں آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد آپ کی والدہ صاحبہ نے آپ کی تربیت کی۔

آپ نے دہلی میں آکر تبلیغِ اسلام کا کام شروع کیا۔ امرائے سلطنت، شہزادے اور عوام الناس آپ کے مریدوں میں شامل تھے۔ ضیاء الدین برنی اور امیر خسرو بھی آپ کے مریدوں میں سے تھے۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ بادشاہوں اور ان کی پالیسیوں کو ناپسند فرماتے تھے۔ ایک دفعہ علاؤالدین خلجی نے آپ کے ہاں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی مگر آپ نے انکار فرما دیا۔ خلجی نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے بادشاہوں کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ نے تبلیغ کے کام کو ایک نظام میں بدل دیا۔ اس طرح آپ کے مرید بنگال، دکن، گجرات اور مالوہ تک کے علاقوں میں پھیل گئے۔ یہاں آپ کے مریدوں نے لاکھوں لوگوں کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کروایا۔ آپ کا انتقال 1325ء کو دہلی میں ہوا۔

10- ضیاء الدین برنی

برنی، برن جسے اب بلند شہر (بھارت) کہتے ہیں میں پیدا ہوئے ۔ آپ محمد تغلق اور فیروز تغلق کے ہم عصر مؤرخ ہیں ۔ آپ نے تاریخ فیروزشاہی تصنیف کی۔ برنی نے اپنی کتاب کا نام بادشاہ وقت کی مناسبت سے تاریخ فیروزشاہی رکھا، لیکن بادشاہ ان سے کسی بات پر ناراض ہوگیا اور ان کی سرپرستی ترک کر دی۔ بعد میں بادشاہ نے معمولی سا وظیفہ مقرر کیا لیکن یہ ان کی ضروریات کے لیے ناکافی تھا۔ اپنی زندگی کے آخر میں آپ کے پاس روپیہ پیسہ تو تھا ہی نہیں، آپ نے بدن کے کپڑے تک راہ خدا میں دے دیے۔ آپ کے جنازے میں صرف ایک بوریا اور ایک چادر تھی۔

تاریخ فیروزشاہی میں سلطان بلبن کے تخت نشین ہونے سے فیروزشاہ تغلق کے دورِ حکومت کے ابتدائی چھ سالوں کا تذکرہ موجود ہے۔ برنی تاریخ لکھنے کے بارے میں اپنا خاص نظریہ رکھتے تھے، وہ صرف واقعات کو نقل کر دینا تاریخ کے لیے ناکافی سمجھتے تھے، اس کے علاوہ وہ واقعات سے نتائج اخذ کرنے کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

غور و فکر کے لیے چند نکات

1- عہد سلاطین میں صوفیأ کرامؒ نے کس طرح مقامی لوگوں کو متاثر کیا؟

2- عہد سلاطین میں علمائے کرام کے کردار پر روشنی ڈالیں۔

سلطنتِ دہلی — ایک جائزہ

ہندوستان پر وسطِ ایشیا (ترکستان) کے حملہ آوروں نے فوجی مقبوضات حاصل کر کے یہاں ایک حکومت قائم کی۔ اس کے لیے ابتدائی فتوحات شہاب الدین محمد غوری نے کیں۔ قطب الدین ایبک (1206-1210) اور التتمش (1211-1236) نے سلطنتِ دہلی کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ التتمش کے بعد حکومت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اس انتشار کے بعد بلبن (1265-1287) نے ایک طاقت ور بادشاہ کی حیثیت سے حکومت سنبھالی۔ بلبن نے حکومتی نظام کو استحکام بخشا اور ایک مؤثر انتظامی ڈھانچہ استوار کرنے پر توجہ دی۔ اس کی بنیاد پر علاؤالدین خلجی (1296-1316) نے سیاسی طور پر حکومت کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ سلطنت کے سیاسی اثر کو وسعت دی۔ تغلق خاندان نے علاؤالدین خلجی کے بعد حکومت سنبھالی۔ اس خاندان کے ابتدائی بادشاہوں کے دورِ حکومت میں سلطنتِ دہلی ایک وسیع رقبے پر محیط تھی۔ اس دور میں سلطنت میں ایسے منفی رجحانات نے جنم لیا جو نہ صرف سیاسی طور پر غیر موزوں تھے بلکہ ان کے باعث انتظامی مشینری بھی آہستہ آہستہ غیر مؤثر ہوتی گئی۔ یہی رجحانات آہستہ آہستہ سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنے اور آخر کار یہ سلسلہ 1526ء تک اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

1526ء میں ہندوستان پر وسط ایشیا کے ہی ایک حکمران بابر نے اپنی حکومت قائم کی اور اس سے خاندان مغلیہ کی حکومت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حکومتوں میں استحکام، عروج اور پھر زوال آجانا، محض حادثاتی نہیں ہوتا۔ جس طرح کسی حکومت کے قیام میں کچھ محرکات اور عوامل ممد و معاون ہوتے ہیں اسی طرح

حکومت کے ختم ہونے میں بھی خاص محرکات وجہ بنتے ہیں ۔ اگر ان محرکات اور عوامل کا تجزیہ کر لیا جائے تو عروج و زوال کا معاملہ سمجھ میں آسکتا ہے۔

سلطنتِ دہلی کے قیام میں جو محرکات بنیادی کردار ادا کر رہے تھے، وہی محرکات اس کے زوال کے وقت نہ صرف بے اثر تھے بلکہ منفی کردار ادا کر رہے تھے۔ ان میں سے چند ایک کا جائزہ ذیل میں لیا جاتا ہے۔

1- یہ بات پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے کہ بادشاہوں کے دور میں سلطنت کے علاقہ جات مختلف جاگیروں میں تقسیم تھے۔ ان جاگیروں پر مختلف امرا (جاگیردار) مکمل طور پر خودمختار تھے۔ ان جاگیروں میں ان کی مرضی اور رضا کے بغیر کوئی شخص کوئی کام یا حرکت نہ کر سکتا تھا۔ جاگیر پر رہنے والے لوگوں کو بھی اس جاگیر کی قطعہ اراضی کے ساتھ ساتھ جاگیردار کی ملکیت ہی سمجھا جاتا تھا۔

جب کوئی بادشاہ حکومت کو مضبوط بنانے کا خواہشمند ہوتا تو اس کے لیے سب سے ضروری امر یہ ہوتا تھا کہ وہ سلطنت کے مختلف علاقوں میں اپنا اثر بڑھانے کے لیے کوشش کرے۔ اثر بڑھانے میں بادشاہ کو لامحالہ امرا اور جاگیرداروں سے ہی مدد لینا ہوتی تھی۔ انھی کی وساطت اور وفاداری کے باعث بادشاہ اپنے حکومتی اثر کو عوام تک پھیلا سکتا تھا۔

وسط ایشیا (ترکستان) سے جو مسلم حکمران ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کے خواہشمند تھے، انہوں نے مقامی جاگیرداروں کو بدل کر اپنی ساتھی ترک لوگوں کو ان جاگیروں پر مامور کیا۔ اس کی واضح وجہ یہ تھی کہ ترک لوگ ان حکمرانوں کے لیے زیادہ معتمد اور وفادار ہو سکتے تھے، جب کہ مقامی جاگیردار جن کی جاگیریں چھن گئی تھی وہ ان حکمرانوں کو ناپسند کرتے تھے۔

ترک امرا نہ صرف نئے مقبوضات پر انتظامی ضروریات کے لیے مامور تھے بلکہ یہ لوگ قائم ہونے والی نئی حکومت کے لیے فوجی اور سیاسی طور پر بھی ایک بنیادی کردار ادا کر رہے تھے۔ غوری، ایبک اور التتمش کے ادوار تک ترک امرا نے بڑی محنت، لگن اور باہمی جذبے کے ساتھ کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ التتمش تک سلطنت دہلی ایک مضبوط

بنیاد پر قائم ہو گئی تھی۔

التتمش کے انتقال تک حکومت کو ایک مستحکم بنیاد مل چکی تھی اور متوقع خارجی خطرات سے بھی خاصی آسودگی میسر آچکی تھی۔ اب ان ترک امرأ میں ہر ایک نے اپنے ذاتی اقتدار کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ اُس وقت تک کئی غیر ترک امرأ بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے تھے۔ مگر سیاسی چپقلش کا محور ترک امرأ (امرائے چہلگان) کے ہاتھ میں تھا۔ یہ امرأ مختلف گروہوں میں بٹ چکے تھے اور ہر گروہ کی خواہش تھی کہ صرف وہی حکمران اقتدار سنبھالے جو ان کے مفادات کا خیال رکھے اور ان کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے۔ یہ سلسلہ آہستہ آہستہ ترک امرأ کے ساتھ ساتھ غیر ترک امرأ تک پھیل گیا۔ اس انتشار کا خاتمہ بلبن نے کیا جو خود بھی انہی ترک امرأ میں سے تھا۔

بلبن ایک سخت گیر بادشاہ کے طور پر تخت نشین ہوا۔ امرأ کی سرگرمیاں اس کے زمانے تک خاصی خطرناک ہو چکی تھیں۔ اس لیے اس نے امرأ کے بارے میں بڑی احتیاط سے پالیسی بنائی۔ بلبن کے سامنے ترک اور غیر ترک امرأ اور ان ہر دو گروہوں کی داخلی لڑائی کا مسئلہ تھا۔ بلبن نے ان دونوں کو نظرانداز کر کے صرف اپنے خاندان البری کے ترکوں کی پذیرائی شروع کر دی اور اس سلسلے میں انہی لوگوں کو اہم عہدوں پر متمکن کیا۔ ان البری ترکوں کے بعد عام ترکوں کو عہدے دیے گیے۔ مقامی لوگوں کو ایک سیاسی نظریے کے تحت کم نسل اور حقیر سمجھا جاتا تھا۔ اس نظریے کے پیچھے بلبن کے سیاسی مفادات کا کردار واضح تھا۔

جلال الدین خلجی، جو خلجی خاندان کی حکومت کا بانی تھا کسی بھی سیاسی گروہ کی مدد اور ہمدردی کے بغیر اقتدار میں آیا تھا۔ اس تناظر میں خلجی خاندان کو کسی بھی سیاسی گروہ کے مفادات یا خواہشات کا خیال رکھنا ضروری نہ تھا۔ علاؤالدین خلجی نے کسی قسم کی نسلی تفریق اور گروہی برتری کو یکسر ترک کر دیا۔ اس نے کسی بھی انتظامی یا سیاسی عہدے کا معیار یہ مقرر کیا کہ وہ شخص بادشاہ کے لیے کس قدر مددگار، خیر خواہ اور وفادار ہو سکتا ہے۔ اس معیار پر عمل کرنے سے ترک اور غیر ترک امرأ کی تمیز ختم ہو گئی اور مقامی امرأ بھی اعلیٰ عہدوں پر مامور کیے جانے لگے۔

علاؤالدین خلجی پہلا حکمران تھا جس نے ایسی حکمت عملی استوار کی جس سے امرأ اور جاگیرداروں کی سیاسی قوت ختم ہو کر رہ گئی۔ ان سے فوجی انتظام کے اختیارات واپس لے کر ایک مرکزی فوجی نظام قائم کرنے سے امرأ کو بالکل بے اثر کر دیا گیا۔

علاؤالدین خلجی کے انتقال کے بعد ایک دورِ انتشار پھر شروع ہوگیا۔ اب اقتدار کی جنگ میں ترک امرأ کے بالمقابل مقامی امرأ اپنے مفادات کے حصول کے لیے یکساں طور پر مؤثر اور طاقتور تھے۔ اس دورانتشار میں خسروخان کے پس پشت مقامی امرأ کا ہاتھ تھا۔ اس دور انتشار سے ایک تغلق امیر نے فائدہ اٹھایا اور اپنے خاندان کی حکومت قائم کر لی۔ اس خاندان کے دورِ حکومت کے آخر تک افغان امرأ کا ایک گروہ میدان میں اتر آیا تھا۔ یہ گروہ سلطنتِ دہلی کے آخری حکمران خاندان لودھی کے دور تک مؤثر رہا، مگر ان کے درمیان بھی مفاد پرستی کی آگ پھیل گئی۔ پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی نے ابراہیم لودھی کے ساتھ اپنی مخاصمت کے نتیجے میں بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

سلطنت کے پورے دور میں (ماسوائے ایبک اور التتمش) امرأ کو ان کے سیاسی وفاداری کے لحاظ سے عہدے دیے جاتے تھے۔ یہی امرأ مختلف علاقوں میں بادشاہ کے وفادار گورنروں کا کام کرتے تھے۔ اپنے اپنے علاقوں سے بادشاہ کے فوجی ، سیاسی اور مالی مفادات کا تحفظ کرنا ان امرأ کا فرض اولین ہوتا تھا۔

جب کبھی حکومت کمزور ہوتی یا بادشاہ مر جاتا تو فوری طور پر اقتدار کے خواہشمند امرأ حرکت میں آجاتے اور اپنی مرضی کا بادشاہ مقرر کرنے کی سعی کرتے۔ یہ امرأ مشروط طور پر بادشاہ کو سیاسی امداد دیتے تھے اور اس میں ان کو ذاتی مفادات اور مراعات حاصل کرنے کی خواہش ہوتی تھی۔ اگر کوئی بادشاہ ان کے مفادات کا خیال نہ کرتا تو اسے قتل یا معزول کروا دیا جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ یہی امرأ اپنی سیاسی حالت پر اس قدر پراعتماد ہو گئے کہ انھوں نے جب یہ دیکھ لیا کہ بادشاہ ان کے مفادات کا تحفظ کرنے کا اہل نہیں اور اس میں سیاسی طور پر ایسا کرنے کی طاقت بھی نہیں تو انہی امرأ نے اپنے علاقوں میں خود مختار ریاستیں

قائم کرنا شروع کر دیں۔ یہ سلسلہ محمد بن تغلق کے دور سے شروع ہوا اور لودھی خاندان کے خاتمے تک جاری رہا۔

2- سلاطین دہلی کی رعایا میں زیادہ تر آبادی ہندوؤں کی تھی۔ ہندو، ان بادشاہوں کو بیرونی حملہ آور تصور کرتے تھے۔ ابتدا میں اس نظریے کے باعث رعایا اور حکومت کے درمیان تال میل پیدا نہ ہو سکا۔ آہستہ آہستہ مقامی ہندوؤں کے مسلمان ہونے سے حالات بہتر ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ، حکومتی سطح پر نسلی برتری کے نظریے کے خاتمے سے بھی مقامی لوگوں میں اعتماد بڑھا۔ اب جو شخص مسلمان ہو جاتا تھا، وہ خود بخود حکومتی طبقے سے منسلک ہو کر ایک بہتر معاشرتی مقام حاصل کر لیتا تھا۔ اس کی شناخت حکومتی گروہ کے حوالے سے کی جاتی تھی۔

اس گروہ کے برعکس عام ہندوؤں اور حکومتی طبقے کے درمیان فرق اور تمیز برقرار رہی۔ اگرچہ حکومت ان کے ساتھ غیر مناسب سلوک روا نہ رکھتی تھی تاہم مجموعی طور پر لوگ حکومت سے شاکی رہتے تھے۔ عام لوگوں کے اس احساس کو ہندو راجا جو نئے حکمرانوں کے باعث اپنا سیاسی اقتدار کھو چکے تھے، اور بھی تیز کر دیتے تھے۔ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے جب بھی موقع ملتا، سازشیں یا بغاوتیں کرتے اور اس طرح اپنی شکایت کا اظہار کرتے۔ اس قسم کی سازشیں ہر بادشاہ کے دور میں ہوئیں، کسی کو اس سے مفر نہ تھا۔ بلکہ جب حکومتی طبقہ سیاسی اور انتظامی طور پر کمزور ہو گیا تو مقامی طور پر بغاوتیں آزاد ریاستوں کے روپ میں ڈھلنے لگیں۔

حکومتی طبقے کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ کسی علاقے کو فتح کر کے اس کے وسائل کو اگر استعمال کر سکیں تو معاملہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ حکومت میں عدم شراکت اور عدم شراکت کے احساس کے باعث، مقامی لوگوں میں احساس محرومی مزید بڑھا۔ یہی احساس مقامی راجاؤں کو دوبارہ آزاد ریاستوں کے قیام کی طرف اکساتا تھا۔ آخر کار حکومتی کمزوریوں کے باعث مقامی لوگوں کو مواقع مہیا ہوئے اور انھوں نے آزاد حکومتیں قائم کرنا شروع کر دیں۔

3- سلاطینِ دہلی کا اندازِ حکومت مجموعی طور پر شخصی مطلق العنانیت پر مبنی تھا۔ اس نظریے کے تحت جو نظام حکومت سنورتا تھا، اُس میں، بادشاہ کی ذاتی خواہشات اور

سیاسی مفادات کو فوقیت حاصل ہوتی تھی ۔ اس لحاظ سے یہ نظام یک طرفہ تھا اور اس میں کسی قسم کی خامی کی نشاندہی ، تائید یا تردید کا حق کسی کو حاصل نہ تھا ۔

ہر بادشاہ اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق اپنا نظامِ حکومت استوار کرتا اور اس پر سختی سے عمل کرواتا تھا ۔ چونکہ اس نظام کی شناخت بادشاہ سے منسوب ہوتی تھی اس لئے بادشاہ کے جاتے ہی نظام حکومت بے اثر ہو جاتا تھا ۔ مثال کے طور پر بلبن نے ایک سخت گیر نظام استوار کیا اور اسمیں اس نے اپنے سیاسی مفادات حاصل بھی کیے ۔ مگر اس کے مرنے کے بعد چند سالوں میں اس کے جانشینوں نے اس نظام کو نہ صرف تباہ کر دیا بلکہ اس کو غیر ضروری بھی ثابت قرار دے دیا ۔ یہی حال علاؤ الدین خلجی کے ساتھ ہوا ۔

ان نظامات کی استواری میں عام لوگوں کی ضروریات اور خواہشات کو نظرانداز کر دیا جاتا تھا اور ان کے نفاذ کے لئے مخصوص شاہی خوف اور سزا سے مدد لی جاتی تھی ۔ لوگ اگرچہ ..براہِ راست ان نظاموں اور پالیسیوں کی مخالفت نہ کر سکتے تھے مگر انہیں جہاں بھی موقع ملتا ، نفاذ کے کام میں خلل ضرور ڈالتے ۔ مثال کے طور پر محمد بن تغلق کی پالیسیاں اسی عام بداعتمادی کی بنیاد پر ناکام ہوئیں ۔ علاؤ الدین کی اصلاحات کا محور بھی زیادہ تر دہلی اور اس کے گردونواح سے آگے نہ بڑھ پایا ۔

اس طرح ، عام لوگوں کو اعتماد میں لئے بغیر صرف ذاتی خواہشات اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کی جانے والی اصلاحات غیر مؤثر ہو جاتی تھیں۔ عام لوگ کسی بھی بادشاہ کے ہونے یا نہ ہونے کو اہمیت نہ دیتے تھے، ان کے لیے کوئی بادشاہ بھی ناگزیر حیثیت نہ رکھتا تھا۔

4- سلطنتِ دہلی کے دور حکومت میں وسعت پسندی کے لئے دو معیاروں پر عمل کیا گیا ۔ پہلی صورت میں فوجی قوت سے علاقوں کو قبضے میں لے کر سلطنت کا حصہ بنا لیا جاتا تھا ۔ علاؤالدین خلجی نے براہ راست قبضے کی بجائے فوجی طاقت سے مختلف علاقوں میں راجاؤں کو اپنا اطاعت گزار بنایا اور انہیں خراج دینے پر مجبور کیا ۔ علاؤ الدین خلجی کے بعد بادشاہوں نے براہِ راست مقبوضات کا سلسلہ جاری رکھا اور جنوبی

ہندوستان میں وسعتِ سلطنت کا کام کیا۔

بادشاہوں کی وسعت پسندی کی ان ہر دو صورتوں میں مقامی راجا اپنی فوجی کمزوری کے ہاتھوں اطاعت گزاری کر لیتے یا اپنے علاقے بادشاہوں کے قبضے میں دے دیتے، مگر بحیثیت مجموعی اس انداز کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ان کو جب بھی کسی بھی بادشاہ کے خلاف کوئی موقع بھی ملتا، یہ بغاوت کر دیتے اور اپنی ریاست کو آزاد کروانے کا جتن کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بادشاہ کے دورِ حکومت میں اکثر ریاستیں سرکشی کرتی تھیں، اگرچہ ان کو کچل دیا جاتا تھا مگر یہ سلسلہ بہرصورت جاری رہا۔

تغلق خاندان کے بعد جب مرکزی حکومت کمزور ہوتی جا رہی تھی تو مرکز سے دور ریاستیں فوری طور پر آزاد ہوگئیں۔ آہستہ آہستہ وسطی ہندوستان اور اس کے دوسرے علاقوں میں آزاد ریاستیں بننے لگیں۔ ایک وقت یہ بھی آیا کہ دہلی کی حکومت چند سو مربع کلومیٹر سے زیادہ علاقے پر نہ تھی۔
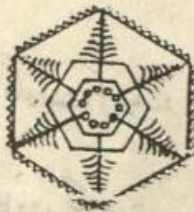
سلاطینِ دہلی کا عہدِ حکومت

واقعاتی تسلسل

1	سندھ پر محمد بن قاسم کا حملہ	712ء
2	مسلمانوں کا کابل فتح کرنا	870ء
3	غزنی کی سلطنت کی بنیاد	870ء
4	سبکتگین کی حکومت	977-997ء
5	سبکتگین کا پشاور اور لمغان پر قبضہ	986-87ء
6	سبکتگین کا انتقال اور محمود غزنوی کی تخت نشینی	997-98ء
7	محمود غزنوی کا لاہور کو سلطنتِ غزنی میں شامل کرنا	1020ء
8	سومنات پر حملہ	1026ء
9	محمود غزنوی کا انتقال	1030ء

ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد

10	قطب الدین ایبک کا دورِ حکومت	1206-1210ء
11	التتمش کی تخت نشینی	1211ء
12	یلدوز کی شکست	1216ء
13	چنگیز خان کی ہندوستان میں آمد	1221ء
14	قباچہ کی شکست	1228ء
15	التتمش کی وفات	1236ء
16	رضیہ سلطانہ	1236-1240ء

17	ناصر الدین محمود کی تخت نشینی	1246ء
18	بلبن کی ناصر الدین محمود کے زمانے میں تقرری بحیثیت نائب سلطنت	1246ء
19	ابو ریحان کی بلبن کے خلاف سازش اور بلبن کی برخاستگی	1253-55ء
20	ہلاکو خان کا بغداد کو تباہ کرنا	1258ء
21	ناصر الدین محمود کا انتقال	1266ء
22	بلبن کا بحیثیت بادشاہ اقتدار سنبھالنا	1266ء
23	شہزادہ محمد کی وفات	1285ء
24	بلبن کا انتقال	1287ء
25	کیقباد	1290-1287ء
26	جلال الدین خلجی کی تخت نشینی	1290ء
27	علاؤالدین خلجی کی دیوگری میں مہم	1296ء
28	علاؤالدین خلجی کی تخت نشینی	1296ء
29	رنتھمبور کی فتح	1301ء
30	چتوڑ کی فتح	1303ء
31	منگولوں کے حملے	1306-1298ء
32	علاؤالدین خلجی کا انتقال	1316ء
33	علاؤالدین خلجی کے انتقال کے بعد دورِ انتشار	1320-1316ء
34	ملک کافور	1316ء
35	مبارک شاہ خلجی	1320-1316ء
36	خسرو خان	15- اپریل تا 7- ستمبر 1320ء
37	غیاث الدین تغلق	1325-1320ء
38	محمد بن تغلق	1351-1325ء

39	وجیانگر کی آزاد ریاست کا قیام	1336ء
40	بنگال کی آزاد حیثیت کا قیام	1338ء
41	بہمنی ریاست کی بنیاد	1347ء
42	فیروز شاہ تغلق	1388-1351ء
43	فیروز شاہ تغلق کا انتقال	1388ء
44	امیر تیمور کا حملہ	1398ء
45	محمود تغلق کا انتقال	1398ء
46	سید خاندان	1451-1414ء
47	خضر خان	1421-1414ء
48	مبارک شاہ	1434-1421ء
49	محمد شاہ	1445-1434ء
50	علاؤالدین عالم شاہ	1451-1445ء
51	لودھی خاندان	1526-1451ء
52	بہلول لودھی	1489-1451ء
53	سکندر لودھی	1517-1489ء
54	ابراہیم لودھی	17

کتابیات

1- تاریخ سندھ ۔ مصنفہ اعجاز الحق قدوسی ،
مطبوعہ اردو سائنس بورڈ ، لاہور اپریل 1985ء

2- تاریخ سندھ از مولانا سید ابو ظفر ندوی
مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ، بھارت 1947ء

3- آبِ کوثر ، از ایس ۔ ایم اکرام
مطبوعہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ، لاہور 1986ء

4- چچ نامہ ، (انگریزی ترجمہ) مرزا قلیچ بیگ مطبوعہ لاہور 1986ء

5- The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna
By M. Nazim
Published by Khalid & Co. Lahore, 1973.

6- Sultan Mahmud of Ghazni by Muhammad Habib.
published by Universal Book, Lhaore 1978

7- تاریخ فرشتہ — از محمد قاسم فرشتہ
جلد اول — مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور 1962ء ۔

8- Muslim Rule in India & Pakistan (711-1858)
By S.M. Ikram
published by Star Book Depot, Lahore, 1966

9- The Foundation of Muslim Rule of India.

by A.B.M. Habibullah

published by Central Book Depot Allahabad -1962

10- طبقات ناصری مصنفہ منہاج سراج

جلد اول، جلد دوم ۔ مترجم غلام رسول مہر

مطبوعہ اردو سائنس بورڈ لاہور 1985ء

11- تاریخ فیروز شاہی ۔ مصنفہ ضیاء الدین برنی

مترجم — ڈاکٹر سید معین الحق

مطبوعہ — مرکزی اردو بورڈ لاہور

12- تاریخ مبارک شاہی — مطبوعہ اردو سائنس بورڈ، لاہور

13- ادارہ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

تیار کردہ : پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ۔ لاہور
منظور کردہ قومی ریویو کمیٹی ، وفاقی وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان

فرمانِ قائدِاعظمؒ
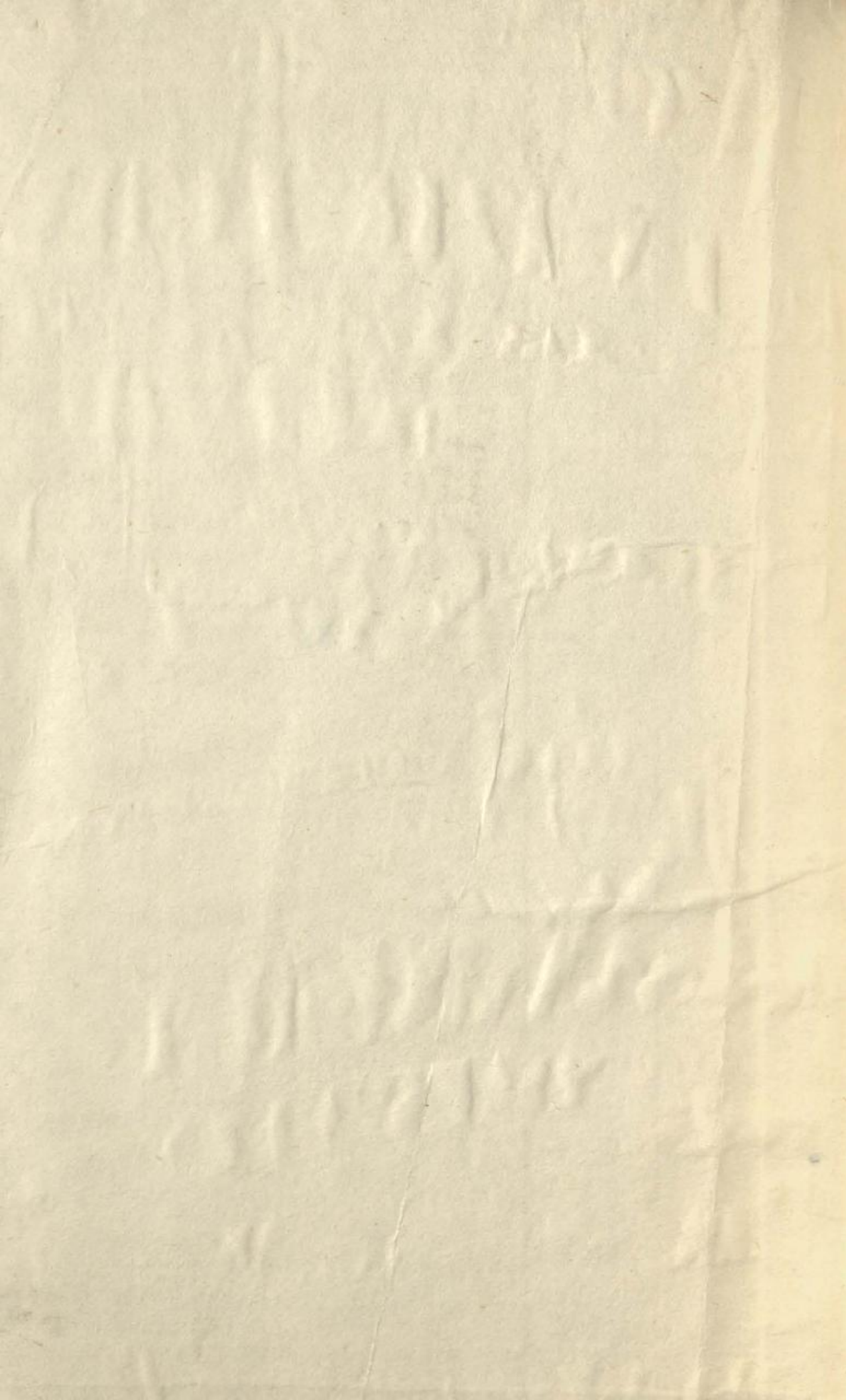
آپ کی توجہ صرف حصولِ علم کے لیے وقف رہے، صرف اسی صورت میں آپ اپنے مُلک کو دُنیا کا عظیم طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک بنا کر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔
(نوجوانوں سے خطاب)

تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے

سیریل نمبر 2959

ایڈیشن	طباعت	تاریخ اشاعت	تعداد اشاعت	قیمت
اوّل	اوّل	مئی 1991	12,000	11.30